سموئیل پی ہنٹنگٹن

ترجمہ: محمد احسن بٹ

تہذیبوں کا تصادم

سیموئیل پی ہنٹنگٹن
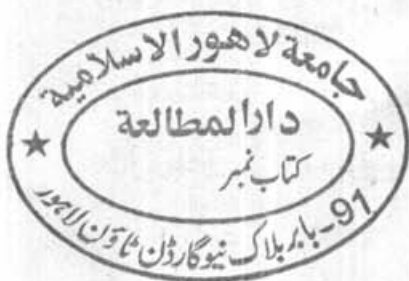
ترجمہ: محمد احسن بٹ

جنوری 2003ء

سلیم اختر نے اشتیاق اے مشتاق پریس سے چھپوا کر

مثال پبلشنگ اردو بازار لاہور سے شائع کی

قیمت : -/250

فہرست

حصہ اول: تہذیبوں کی دنیا

حصہ دوم: تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن

حصہ سوم: تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام

باب نمبر 6: عالمی سیاست کی تشکیلِ نو

باب نمبر 7: مرکزی ریاستیں اور تہذیبی نظام

حصہ چہارم: تہذیبوں کے تصادم

باب نمبر 8: بین التہذیبی مسائل

حصہ پنجم: تہذیبوں کا مستقبل

مصنف کا تعارف

سیموئیل پی ہنٹنگٹن البرٹ جے ویدرہیڈ سوم ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ یہاں جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ برائے سٹریٹجک سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور بین الاقوامی اور علاقائی مطالعات کی ہارورڈ اکیڈمی کے چیئرمین بھی ہیں۔ وہ کارٹر انتظامیہ میں نیشنل سکیورٹی کونسل کیلئے ڈائریکٹر برائے سلامتی منصوبہ بندی ''فارن پالیسی'' کے بانی اور شریک مدیر اور امریکی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ وہ بہت سی کتابوں اور عالمانہ مضامین کے مصنف ہیں۔

کتاب کا مختصر تعارف

1993ء کے موسم گرما میں ''فارن افیئرز'' میں ایک مضمون بعنوان ''تہذیبوں کا تصادم؟'' مصنفہ سیموئیل ہنٹنگٹن شائع ہوا۔ اس ممتاز رسالے کے مدیروں کے بقول جارج کینن کے 1940ء کی دہائی میں تحدید کے حوالے سے لکھے گئے مضمون ''ایکس'' کے بعد اس مضمون نے سب سے زیادہ بحث مباحثے کو جنم دیا۔ اب مسٹر ہنٹنگٹن نے اس مضمون میں اٹھائے گئے مباحث کو وسعت کے ساتھ بیان کیا ہے اور نئے مسائل و معاملات کو موضوع سخن بناتے ہوئے انتہائی متاثر کن اور متنازع انگیز تجزیے پیش کیے ہیں۔ مضمون میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا عالمی سیاست کے مستقبل میں تہذیبوں کے درمیان جھگڑے چھائے رہیں گے؟ کتاب میں انہوں نے اپنی طرف سے اس سوال کا جواب پیش کیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں نیز انہوں نے بتایا ہے کہ تہذیبوں کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا بین الاقوامی نظام جنگ سے بچاؤ کا واحد وسیلہ ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں رونما ہونے والے واقعات نے مسٹر ہنٹنگٹن کی پیش گوئیوں کو سچ ثابت کر دیا ہے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ خود کو اپنے آباؤ اجداد' زبان' مذہب اور رسوم و رواج کی بنیاد پر شناخت کروا رہے ہیں۔ آج سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں لوگوں کے درمیان واضح تقسیم و تفریق نظریاتی یا معاشی نہیں بلکہ ثقافتی ہے۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر نئے سرے سے تشکیل پا رہی ہے۔ نئی طرز کے مناقشے اور دوستیاں سرد جنگ کے مناقشوں

اور دوستیوں کی جگہ لے رہے ہیں۔ دنیا میں گرم مقامات (ہاٹ سپاٹس) تہذیبوں کو منقطع کرنے والے خطوط کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ اس کا ثبوت بوسنیا' چیچنیا' وسطی ایشیا' کشمیر مشرقِ وسطیٰ' تبت' سری لنکا' سوڈان اور بہت سی دوسری جگہوں پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

مسٹر ہنٹنگٹن نے واضح کیا ہے کہ مسلم ممالک میں آبادی کا دھماکہ خیز اضافہ اور مشرقی ایشیا کا معاشی ابھار عالمی سیاست پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ ان پیش رفتوں نے مغربی بالادستی کو چیلنج کیا ہے۔ نام نہاد مغربی آفاقی تصورات کی مخالفت کو فروغ دیا ہے اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ' ترکِ وطن (امیگریشن) انسانی حقوق اور جمہوریت جیسے مسائل کے حوالے سے تہذیبی جھگڑے کو بھڑکایا ہے۔ مسلم آبادی کے اضافے نے پورے یوریشیا میں متعدد چھوٹی چھوٹی جنگیں برپا کروائی ہیں اور چین کا ابھار تہذیبوں کی عالمی جنگ کی طرف لے جاسکتا ہے۔ مسٹر ہنٹنگٹن مغرب کو اس کی منفرد ثقافت کو محفوظ رکھنے کیلئے سٹریٹجی پیش کرتے ہیں اور ہر جگہ کے لوگوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ ایک پیچیدہ' کثیر قطبی' کثیر تہذیبی دنیا میں مل کر جینا سیکھیں۔

''تہذیبوں کا تصادم اور بین الاقوامی نظام کی تشکیل نو'' عصر حاضر میں اور اگلی صدی میں عالمی سیاست کو چلانے والے قوتوں کا تجزیہ کرتی ہے۔ یہ یقینی طور پر اس عشرے کی سب سے زیادہ موضوعِ بحث بننے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

☆☆☆

دیباچہ

1993ء کے موسم گرما میں رسالے ''فارن افیئرز'' نے میرا ایک مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' شائع کیا۔ ''فارن افیئرز'' کے مدیروں کے مطابق میرے اس مضمون نے گزشتہ تین برسوں میں اس قدر بحث مباحثے کو جنم دیا ہے کہ 1940ء سے اب تک انہوں نے دوسرے جتنے مضامین شائع کیے ہیں' ان میں سے کوئی ایک بھی اس قدر بحث انگیز نہیں رہا۔ یہ مضمون جتنی بحث کا باعث بنا ہے میری بھی کوئی دوسری تحریر اس سے قبل اتنی بحث کا سبب نہیں بن سکی ہے۔ اس مضمون کے حوالے سے جوابات/ ردِعمل اور تبصرے ہر براعظم سے اور بیشمار ملکوں سے موصول ہوئے ہیں۔ لوگ میرے اس استدلال پر مختلف ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے یا تو متاثر ہوئے یا مشتعل یا خوف زدہ ہو گئے یا الجھن میں مبتلا ہو گئے کہ ابھرتی ہوئی عالمی (گلوبل) سیاست کا مرکزی اور سب سے زیادہ خطرناک پہلو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مابین تصادم ہوگا۔ اس مضمون سے اور کچھ ہوا یا نہیں بہرحال اس نے مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اعصاب میں ہلچل مچا دی۔

مضمون کے حوالے سے ظاہر ہونے والی دلچسپی اور نزاع کی وجہ سے یہ بات میرے لیے ضروری دکھائی پڑتی تھی کہ میں اس موضوع پر مزید کچھ لکھوں۔ کوئی سوال اٹھانے کا تعمیری طریقہ تو یہ ہے کہ کوئی مفروضہ قائم کیا جائے۔ میرا وہ مضمون بھی' جس کے عنوان میں شامل سوالیہ نشان عمومی طور پر نظر انداز کر دیا گیا' ایسی ہی ایک کوشش تھا۔ یہ کتاب اس مضمون کے سوال کا بھرپور' گہرا اور زیادہ مکمل دستاویزی جواب ہے۔ اس کتاب میں میں نے

مضمون میں پیش کئے گئے تصورات کو وضاحت، تفصیل اور صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے نیز بہت سے ایسے نظریات اور موضوعات کو تفصیلاً زیر بحث لایا ہوں جنہیں مضمون میں محض سرسری طور پر بیان کیا گیا تھا۔ ان میں شامل ہیں: تہذیبوں کا تصور، ایک آفاقی تہذیب کا سوال، قوت واقتدار اور ثقافت کا باہمی تعلق، تہذیبوں کے درمیان بدلتا ہوا توازنِ قوت، غیر مغربی معاشروں میں مقامیت پذیری، تہذیبوں کی سیاسی ساخت، مغرب آفاقیت پسندی کے پیدا کردہ جھگڑے، مسلم عسکریت اور چینی ادعا، چینی قوت کے ابھار کے ساتھ توازن اور حاشیہ برداری کے ردِعمل، تقسیمی خط کی جنگوں کی وجوہات اور حرکیات اور مغرب اور تہذیبوں والی دنیا (World of civilizations) کا مستقبل جو اہم موضوع مضمون میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، وہ تھا: عدم استحکام اور توازنِ طاقت پر آباد کے اضافے کے نہایت اہم اثرات، دوسرا اہم موضوع جو مضمون میں شامل نہیں ہوا، وہ اس کتاب کا عنوان اور آخری جملہ ہے۔ ''عالمی امن کیلئے تہذیبوں کے تصادم سب سے بڑا خطرہ ہیں اور عالمی جنگ سے بچاؤ کا سب سے یقینی ذریعہ تہذیبوں کی بنیاد پر استوار ایک بین الاقوامی نظام ہے۔

یہ کتاب کسی عمرانی سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو سرد جنگ کے بعد عالمی (گلوبل) سیاست میں ہونے والے ارتقا کی تعبیر وتفہیم ہے۔ اس کتاب میں عالمی سیاست کے حوالے سے ایک زاویۂ نگاہ (فریم ورک) ایک فلسفہ پیش کیا گیا ہے جو عالموں اور پالیسی سازوں کیلئے سودمند ہوگا۔

یہ کتاب عالمی سیاست میں رونما ہونے والے سب واقعات کا احاطہ نہیں کرتی ہے۔ البتہ اس کتاب میں بین الاقوامی پیش رفتوں کو سمجھنے کا ایک زیادہ بہتر اور بامعنی وسیلہ مہیا کیا گیا ہے، تاہم یہ بھی سچ ہے کہ کوئی فلسفہ لافانی نہیں ہوا کرتا جہاں تہذیبی سوچ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کی شروعات میں عالمی سیاست کی تفہیم میں کارآمد ہوسکتی ہے، وہاں لازمی نہیں کہ یہ بیسویں صدی کے وسط یا اکیسویں صدی کے وسط کے حالات کو سمجھنے میں بھی برابر کی سودمند ہو۔

جو تصورات اس مضمون اور اس کتاب میں منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ وہ پہلے پہل اکتوبر 1992ء میں امریکن انٹر پرائزز انسٹیٹیوٹ واشنگٹن میں بریڈلے لیکچر کے طور پر پیش کیے گئے تھے اور پھر سمتھ رچرڈسن فاؤنڈیشن کے اولن انسٹی ٹیوٹس پروجیکٹ کیلئے "بدلتا ہوا سلامتی کا ماحول اور امریکی قومی مفادات" کے عنوان کے تحت ایک عمومی مقالے کی صورت میں پیش کیے گئے تھے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے لاتعداد سیمیناروں اور میٹنگوں میں امریکہ بھر کے علمی، حکومتی، کاروباری اور دیگر گروپوں کے ساتھ "تصادم" کے موضوع پر مباحثے کرنے پڑے۔ اس کے علاوہ مجھے دیگر ملکوں بشمول ارجنٹائن، بیلجیئم، چین، فرانس، جرمنی، برطانیہ عظمیٰ، کوریا، جاپان، لکسمبرگ، روس، سعودی عرب، سنگاپور، جنوبی افریقہ، سپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور تائیوان میں لیکچر دینے کا موقع ملا۔ ان مباحثوں سے مجھے ہندومت کے سوا تمام بڑی تہذیبوں کو سمجھنے کا موقع ملا نیز مجھے ان مباحثوں کے شرکاء کے نقطہ ہائے نظر اور بصیرت سے استفادے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔ 1994ء اور 1995ء میں مجھے ہارورڈ میں سرد جنگ کے بعد کی دنیا کی ساخت پر منعقد ہونے والے سیمینار سے خطاب کا موقع ملا۔ سیمینار میں شریک طلباء کے شاندار اور بعض اوقات تنقیدی تبصروں نے میرے لیے ایک اضافی محرک کا کام کیا۔ اس کتاب پر میرے کام میں ہارورڈ کے جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ برائے سٹریٹجک سٹڈیز اور مرکز برائے بین الاقوامی معاملات (سنٹر فار انٹرنیشنل افیئرز) نے مجھے بہت مدد فراہم کی۔

مائیکل سی ڈیش، رابرٹ او کیوہن، فرید زکریا اور آر سکاٹ زمرمین نے پورے مسودے کو پڑھا۔ ان کے تبصروں اور آراء کی روشنی میں میں نے مواد اور اس کی ترتیب کے حوالے سے اہم تبدیلیاں کیں۔ اس کتاب کی تکمیل تک سکاٹ زمرمین نے تحقیقاتی حوالے سے ناگزیر تعاون فراہم کیا، ان کی توانا، ماہرانہ اور مخلصانہ امداد کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن

''تہذیبوں کا تصادم'' پر ایک نظر

بیسویں صدی کے آخری عشروں میں دنیا کے اُن ملکوں میں معاشی' فوجی' سائنسی اور انسانی ترقی رونما ہوئی جو کہ جنگِ عظیم دوم سے پہلے مغرب کے براہ راست اور جنگ عظیم دوم کے بعد عالمی توازنِ طاقت کے نئے پیٹرن کے تحت مغربی تہذیب کے بالواسطہ غلام رہے تھے۔ ان غلام ملکوں کی اس ترقی کو مغرب کے سکالر کس نظر سے دیکھ رہے ہیں' آیا وہ اس کو انسانیت کا ارتقا سمجھتے ہیں یا صرف اور صرف اپنے غلاموں کی ترقی؟ اس بنیادی سوال کا جواب ہمیں اس کتاب سے ملتا ہے جو سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے ''تہذیب کا تصادم اور بین الاقوامی نظام کی تشکیلِ نو'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس سکالر نے غیر جانبداری' انصاف اور دانشورانہ دیانت کے دعووں کے باوصف مغرب والوں کے اس خوف کو عیاں کر ڈالا ہے جو ایشیا' لاطینی امریکہ اور دنیا کے دیگر پسماندہ علاقوں کے عوام کی ترقی سے ان کے ذہنوں اور دلوں اور روحوں پر چھایا ہوا ہے۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے کتاب کے دیباچے میں اس کتاب کے لکھنے کی جو وجہ بتائی ہے' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے خوف کو چھپانا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق جھگڑا صرف ایک سوالیہ نشان کا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی آپ دیباچے میں خود ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ بات فقط اتنی سی نہیں ہے۔ سوالیہ نشان تو دراصل خود مغرب کے وجود اور مغربی تہذیب کے مستقبل پر لگ چکا ہے اور سیموئیل پی ہنٹنگٹن جیسے علماء اس کا ذمہ دار ترقی اور

آزادی کی شاہراہ پر گامزن اسلامی، چینی اور دوسری تہذیبوں کو ٹھہراتے ہیں۔
ہو سکتا ہے ہمارے اس خیال کو مسترد کر دیا جاتا لیکن پاکستان اور اس کی سرحدوں کے اندر بسنے والے پندرہ کروڑ انسان گزشتہ چند ماہ سے جس انسانی المیے سے گزر رہے ہیں اس نے مغرب کو اس کی تمام تر ہولناکی، سفاکی اور درندگی کے ساتھ برہنہ کر دیا ہے۔
اگر سیموئیل پی ہنٹنگٹن جیسے علماء پر یہ وقت آیا ہوتا تو انہوں نے ''تہذیبوں کا تصادم'' کسی یونیورسٹی میں بیٹھ کر نہیں بلکہ کسی ایٹمی پناہ گاہ میں چھپ کر لکھی ہوتی۔
مغرب کے موجودہ حکمرانوں نے اپنی حالیہ تقریروں اور بیانات میں ''تہذیبوں کے تصادم'' کے آغاز کا اعلان کر دیا ہے۔ گزشتہ صدیوں میں مغرب والے آپس ہی میں ایک دوسرے کا لہو پی پی کر اپنی درندگی کی پیاس بجھاتے رہے ہیں۔ دیکھئے اکیسویں صدی میں ان کی پیاس کا مشکیزہ ایشیا کی کن کن تہذیبوں کے دریا سے سیراب ہوتا ہے۔
اس خالص مشرقی انداز کی تمہید کے بعد آیئے ہم ''تہذیبوں کا تصادم'' پر ایک تجزیاتی نظر ڈالیں۔
کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کو درج ذیل عنوانات دیئے گئے ہیں:

حصہ اول: تہذیبوں کی دنیا
(A WORLD OF CIVILIZATIONS)

حصہ دوم: تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن
(THE SHIFTING BALANCE OF CIVILIZATIONS)

حصہ سوم: تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام
(THE EMERGING ORDER OF CIVILIZATIONS)

حصہ چہارم: تہذیبوں کے تصادم
(CLASHES OF CIVILIZATIONS)

حصہ پنجم: تہذیبوں کا مستقبل
(THE FUTURE OF CIVILIZATIONS)

ان پانچ حصوں کے کل ملا کر بارہ ابواب میں فاضل مصنف نے اس بنیادی مفروضے کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد عالمی سیاست معاشی اور تہذیبی بنیادوں پر از سر نو صورت پذیر ہو رہی ہے۔ تہذیب اور ثقافت ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد ملکوں کے باہمی تعلقات پنپ رہے ہیں' خواہ ان کی نوعیت دوستی کی ہو یا مخاصمت کی' تعاون کی ہو یا تضاد کی نیز یہ کہ ان ملکوں میں معاشی' سیاسی اور فوجی اتحاد ہو رہے ہیں جو ایک ہی ثقافتی اور تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں۔ کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ثقافت اور ثقافتی تشخص' جو کہ وسیع ترین سطح پر تہذیبی تشخص ہوتے ہیں' سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں تعاون' مخاصمت اور جھگڑوں کے تانے بانے کو تشکیل دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے پانچوں حصوں میں اسی مرکزی مفروضے کی جزئیات پر بحث کی گئی ہے۔''

ہم مزید تجزیے کیلئے پہلے ہر حصے کا تفصیلی خاکہ پیش کریں گے اور پھر ترتیب وار جائزہ لیں گے۔ پہلے حصے ''تہذیبوں کی دنیا'' کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے ''عالمی سیاست کا نیا دور'' اس باب کو مزید چار ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات یہ ہیں:

تعارف: پرچم اور ثقافتی تشخص

ایک کثیر قطبی' کثیر تہذیبی دنیا

دوسری دنیائیں؟

دنیاؤں کا موازنہ: حقیقت پسندی' کفایت اور پیش گوئیاں

پہلے حصے کے دوسرے باب کا عنوان ہے ''تہذیبیں: تاریخ اور زمانہ حال میں'' اس باب کو مزید دو ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

تہذیبوں کی ساخت

تہذیبوں کے درمیان تعلقات

پہلے حصے کے تیسرے باب کا عنوان ہے۔ ''ایک آفاقی تہذیب؟ جدیدیت اور مغربیت۔'' اس باب کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

آفاقی تہذیب: مفہوم

آفاقی تہذیب: سرچشمے

مغرب اور جدیدیت

مغرب اور جدیدیت کو جوابات

کتاب کے دوسرے حصے ''تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن'' میں دو ابواب ہیں۔ اس حصے کے پہلے اور کتاب کے چوتھے باب کا عنوان ہے ''مغرب کا زوال: قوت و اقتدار' ثقافت اور مقامیت۔'' اس باب کو مزید تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مغربی قوت: غلبہ اور زوال

مقامیت: غیر مغربی ثقافتوں کا احیاء

خدا کی واپسی

دوسرے حصے کے دوسرے اور کتاب کے پانچویں باب کا عنوان ہے ''معیشت' آبادی اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں۔'' اس باب کو مزید تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے' جن کے عنوان درج ذیل ہیں:

ایشیائی ادعائیت

اسلامی احیاء

بدلتے ہوئے چیلنج

کتاب کے تیسرے حصے ''تہذیبوں کے ابھرتے ہوئے نظام'' میں دو باب شامل ہیں۔ اس حصے کے پہلے اور کتاب کے چھٹے باب کا عنوان ہے'' عالمی سیاست کی ثقافتی تشکیلِ نو'' اس باب کو مزید چار ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے' جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

گروپ بندیوں کی جستجو: تشخص کی سیاست

ثقافت اور معاشی تعاون

تہذیبوں کی بناوٹ

کٹے ہوئے ملک: تہذیبی تبدیلی کی ناکامی

اس حصے کے دوسرے اور کتاب کے ساتویں باب کا عنوان ہے ''مرکزی ریاستیں، ہم مرکز دائرے اور تہذیبی نظام۔'' اس باب کو مزید پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

تہذیبیں اور نظام

مغرب کی تحدید

روس اور اس کے ہمسایہ ملک

عظیم چین اور اس کا حلقۂ خوشحالی

اسلام: بغیر اتحاد کے شعور

کتاب کے چوتھے حصے ''تہذیبوں کے تصادم'' میں چار ابواب ہیں۔ اس حصے کے پہلے اور کتاب کے آٹھویں باب کا عنوان ہے ''مغرب اور باقی دنیا: بین التہذیبی معاملات۔'' اس باب کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مغربی آفاقیت

ہتھیاروں کا پھیلاؤ

انسانی حقوق اور آبادی

ترکِ وطن

اس حصے کے دوسرے اور کتاب کے نویں باب کا عنوان ہے ''تہذیبوں کی عالمی سیاست'' اس باب کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مرکزی ریاستیں اور تقسیمی خط کے جھگڑے

اسلام اور مغرب

ایشیا، چین اور امریکہ

''تہذیبیں اور مرکزی ریاستیں: ابھرتے ہوئے اتحاد''

اس حصے کے تیسرے اور کتاب کے دسویں باب کا عنوان ہے ''عبوری جنگوں سے تقسیمی خط کی جنگوں تک'' اس باب کو مزید چار ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

عبوری جنگیں: افغانستان اور خلیج

تقسیمی خط کی جنگوں کی خصوصیات

واقعہ: اسلام کی خونی سرحدیں

وجوہات: تاریخ، آبادی، سیاست

اس حصے کے چوتھے اور کتاب کے گیارہویں باب کا عنوان ہے ''تقسیمی خط کی جنگوں کی حرکیات'' اس باب کو مزید تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

تشخص: تہذیبی شعور کا ابھار

تہذیبی اعتماد: رشتہ دار ملک اور تارکینِ وطن

تقسیمی خط کی جنگوں سے بچاؤ

کتاب کے پانچویں اور آخری حصے ''تہذیبوں کا مستقبل'' کا صرف ایک ہی باب ہے۔ اس باب کا جو کہ کتاب کا بارھواں اور آخری باب ہے، عنوان ہے ''مغرب، تہذیبیں اور تہذیب'' اس باب کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات ہیں:

مغرب کا احیاء

مغرب دنیا میں

تہذیبی جنگ اور نظام

تہذیب کی یکسانیتیں

اب ہم کتاب کے ہر باب کا جائزہ لیتے ہیں۔ کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے

کتاب کی ترتیب اور متن کے حوالے سے لکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے درج کیا جا چکا ہے کہ اس کتاب کا مرکزی خیال سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں رونما ہونے والی سیاسی پیش رفت ہے اور دنیا کی سیاست کی تہذیبی اساس پر تشکیلِ نو اس کتاب کا مرکزی خیال ہے۔ پانچوں حصے اسی مفروضے کی تفصیل اور وضاحت ہیں۔ خود مصنف نے ہر حصے کا تعارف اس طرح تحریر کیا ہے:

پہلا حصہ: تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمی (گلوبل) سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہوئی ہے۔ جدیدیت مغربیت سے ممتاز ہے اور نہ تو یہ کسی بھی بامعنی انداز میں ایک آفاقی تہذیب کو تشکیل دے رہی ہے نہ ہی غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

دوسرا حصہ: تہذیبوں کے درمیان قوت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ مغرب اثر ورسوخ کے حوالے سے زوال پذیر ہے، ایشیائی تہذیبیں اپنی معاشی، فوجی اور سیاسی قوت کو بڑھا رہی ہیں۔ اسلام کی آبادی دھماکہ خیز انداز میں بڑھ کر مسلم ملکوں اور ان کے ہمسایوں کیلئے عدم استحکام کا سبب بن رہی ہے نیز غیر مغربی معاشرے عمومی طور پر اپنی ثقافت کی قدر کا ازسرنو اثبات کر رہے ہیں۔

تیسرا حصہ: تہذیبوں کی بنیاد پر استوار ایک عالمی نظام ابھر رہا ہے۔ ایک ثقافت کے حامل معاشرے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری میں تبدیل کرنے کا عمل ناکامیاب رہا ہے اور ملک مرکزی ریاستوں یا رہنما ملکوں کے گرد متحد ہو رہے ہیں۔

چوتھا حصہ: مغرب کی نام نہاد آفاقیت نے اسے دوسری تہذیبوں کے ساتھ جھگڑوں میں ملوث کر دیا ہے، سب سے سنگین نوعیت کے جھگڑے اسلام اور چین کے ساتھ رونما ہوئے ہیں، مقامی سطح پر تقسیمی خط کی جنگوں نے، خصوصاً مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان "برادری کے ملکوں پر اعتماد" کے رویے کو ابھرا ہے، ان جنگوں کے پھیلنے کا خطرہ بڑھا ہے نیز ان جنگوں کو روکنے کیلئے مرکزی ریاستوں کی کوششوں میں اضافہ ہوا ہے۔

پانچواں حصہ: مغرب کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ امریکی اپنے مغربی تشخص کا دوبارہ اثبات کریں نیز مغربی اپنی تہذیب کو آفاقی کے بجائے منفرد تصور کریں اور غیر مغربی

معاشروں سے درپیش چیلنجوں کے مقابلے میں اس کے احیاء اور تحفظ کیلئے متحد ہوں۔ تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ عالمی لیڈر عالمی سیاست کے تہذیبی روپ کو تسلیم کریں اور اس کو برقرار رکھنے کیلئے باہمی تعاون کریں۔

کتاب کے پانچوں حصوں کے تعارف میں مصنف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے درج ذیل حقائق واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں:

امریکی سکالر تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیا کو مغرب کی حدوں سے باہر بھی ماننے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد انہیں ادراک ہوا ہے کہ دنیا تو کثیر تہذیبی ہے اور عالمی سیاست بھی کثیر قطبی و کثیر تہذیبی ہو گئی ہے۔ سرد جنگ کے دوران بھی دنیا کثیر قطبی تو نہیں تھی تاہم کثیر تہذیبی ضرور تھی۔ یہ اور بات کہ مغرب کے سکالروں کو مغربی تہذیب کے علاوہ کسی اور تہذیب کے وجود کا علم نہیں تھا!!

جس دوسری حقیقت کا انکشاف ہوا ہے وہ ہے جدیدیت کی ناکامی۔ غیر مغربی خصوصاً اسلامی، چینی اور دیگر بڑی تہذیبوں کے سکالر تو بہت پہلے سے جدیدیت کے ناکام ہونے کا منطقی دعویٰ کرتے آئے ہیں تاہم اس کو کبھی مغربیوں نے تعصب اور حسد و نفرت کے سوا کسی اور عنوان سے سمجھا ہی نہیں تھا۔ اب سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے جو کہ ''دنیا کے حکمران'' امریکہ کے ایک صفِ اول کے سکالر ہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی تصنیف کا مرکزی خیال بنایا ہے تو اس سے نہ صرف غیر مغربی سکالروں کی اخلاقی فتح ثابت ہو گئی ہے بلکہ ایک اور بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ امریکہ اور یورپ کے درمیان تضاد تاریخ میں پہلی مرتبہ انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ واضح رہے کہ جدیدیت کی تحریک یورپی ملکوں میں صنعتی انقلاب کے ساتھ شروع ہوئی تھی جس نے سیاست، ادب، اخلاقیات، مذہب غرض ہر شعبۂ زندگی کو تبدیل کر ڈالا تھا اور بیسویں صدی کے اواخر تک اس میں ارتقا ہوتا رہا تاہم امریکہ میں یورپ کے تسلط سے نجات پانے کی تحریک کے نتیجہ میں فلسفیانہ اور سیاسی تحریروں میں جدیدیت کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکہ میں ''مابعد جدیدیت'' (POST MODERNISM) کی تحریک نے جنم لیا جو معیشت، سیاست، ادب و فنونِ لطیفہ، دفاعی

حکمتِ عملی، سائنس و ٹیکنالوجی، تعلیم و تربیت غرض ہر شعبۂ زندگی میں جدیدیت کی تحریک کے اختتام کے مفروضے پر استوار تھی۔

عالمی دانش کے ارتقائی مراحل سے آگاہ لوگ جانتے ہیں کہ فکری دنیا میں جرمنوں کو ان کے منفرد فلسفوں کی وجہ سے جدا مقام حاصل ہے۔ وہ نطشے ہو یا ہیگل یا ہائیڈگر جرمن فکر انسانی میں الگ ہی روش کے بانی رہے ہیں لیکن امریکی تو جرمنوں سے بھی ''وکھرے'' ثابت ہوئے ہیں۔ جرمنوں نے ''خدا کی موت'' کا تصور پیش کیا تو امریکیوں نے ''تاریخ کی موت'' کی درفطنی پیش کر دی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، امریکی اس سے پہلے جدیدیت کی موت کا اعلان کر چکے تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب ہے ''صرف اور صرف یورپ سے تصادم۔''

ہم غیر مغربی تسلیم کرتے ہیں کہ ''تہذیبوں کا تصادم'' شروع ہو چکا ہے لیکن اس میں کوئی اور نہیں خود امریکہ اور یورپ ہی فریق ہیں۔ یہ حقیقت بہت سے غیر مغربی سکالر بیان کر چکے ہیں اور ہم ان کی سو فیصد تائید کرتے ہیں کہ تہذیبوں کا حقیقی تصادم دو عالمی طاقتوں کے درمیان ہو رہا ہے: ایک امریکہ اور دوسری یورپ۔

اس کے ثبوت میں درج ذیل عوامل پر غور کیجئے جن کی شہادت سرد جنگ کے بعد کی عالمی تاریخ دیتی ہے:

1- سوویت روس کے انہدام کے بعد ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے معدنی و انسانی وسائل پر قبضے کا جھگڑا۔
2- مشرقی یورپ کے سابق کمیونسٹ ملکوں میں تجارتی و دفاعی اثر و رسوخ کے معاملے پر جھگڑا۔
3- اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل نشستوں کا مسئلہ۔
4- امریکی مذہب بیزاری اور یورپی مذہب پرستی کا جھگڑا۔
5- خلا پر اجارہ داری کی امریکی اور یورپی کشمکش۔

ہمارے دانا و بینا قارئین اتفاق کریں گے کہ امریکی یورپی تہذیبی تصادم کے مذکورہ بالا

مظاہر حقیقی ہیں۔ اسی وجہ سے صومالیہ‘ روانڈا‘ الجزائر‘ ارجنٹائن‘ برازیل‘ مشرق وسطیٰ‘ بلقان‘ برصغیر‘ افغانستان اور ہر کہیں انسانوں کا لہو بہہ رہا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں ڈھل رہی ہیں‘ کھیتوں میں آگ لگ رہی ہے‘ دریا خشک ہو رہے ہیں‘ سہاگ اجڑ رہے ہیں‘ مائیں اولاد کیلئے گریہ کناں ہیں اور بے سہارا بچے سوختہ مکانوں کے ملبوں میں برہنہ پا ممتا اور شفقت پدری کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں‘ خون تھوک رہے ہیں۔ افغانستان‘ کشمیر‘ فلسطین‘ الجزائر اور کئی دیگر علاقوں میں قتل نوع انسان جاری ہے۔

کیا یہ ثبوت نہیں یورپ اور امریکہ کی ''تہذیبوں میں تصادم'' کا؟ فرق صرف میدان ہائے جنگ کا ہے!! پرانی مثل ہے کہ پڑوس میں لگائی گئی آگ اپنے گھر تک ضرور آتی ہے‘ امریکیوں اور یورپیوں نے بھی اسی لئے آگ ایک دوسرے کے گھروں کو نہیں لگائی بلکہ دور دراز واقع ایک دوسرے کے گھروں کے پچھواڑوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ آنے والا وقت دیکھے گا کہ یہ آگ اصل گھروں تک بھی پہنچتی ہے یا نہیں۔ انسانیت کے تمام غیر مغربی (اور مغربی) دوست یہی انتظار کر رہے ہیں۔

یورپ والوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کی جدیدیت نے غیر مغربیوں کو ایک آفاقی تہذیب میں شامل کر دیا ہے اور مغربی بنا دیا ہے۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے کتاب کے پہلے حصے ہی میں اس دعوے کو مسترد کر کے امریکہ والوں کی یورپ دشمنی کو واضح کر دیا ہے۔ یورپ والوں کو یہی تو فخر رہا ہے کہ انہوں نے نوع انسان کو جدید اور مغربی بنا کر ایک آفاقی تہذیب کرۂ ارض پر تخلیق کر دی ہے اور امریکہ والے اسی فخر کے آئینے کو چکنا چور کر رہے ہیں۔ امریکہ والوں کا دعویٰ ہے کہ نوع انسان کو کا کولا‘ جینز‘ جوگرز‘ برگر‘ ہالی وڈ فلموں‘ امریکی انگریزی اور پاپولر فکشن کو اپنا کر یورپی اثرات کو ٹھکرا چکی ہے اور وہ مغربی تہذیب کے امریکی روپ کو اپنا رہی ہے نہ کہ یورپی روپ کو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مغربی تہذیب کے امریکی روپ اور یورپی روپ کے امتیازی اختلافات کی نشاندہی کریں تاکہ قارئین کے سامنے امریکہ اور یورپ کے تہذیبی تصادم کی حقیقی وجوہات کھل کر سامنے آجائیں۔

مغربی تہذیب کا امریکی روپ

مغربی تہذیب کے امریکی روپ کے چند نمایاں خواص درج ذیل ہیں:

(i) انفرادیت پسندی

امریکی اجتماع کی جگہ فرد کو اہمیت دیتے ہیں بلکہ ہر صورت میں فرد کو اجتماع پر فوقیت دیتے ہیں۔

(ii) لامذہبیت

امریکی کرۂ ارض کی وہ واحد قوم ہیں جن کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں ہے۔ یہ قوم بنیادی طور پر کسی الوہی یا زمینی مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ ریاست نے ہر شخص کو ''انفرادیت پسندی'' کے اصول کے تحت مذہب اختیار کرنے کا حق دے رکھا ہے تاہم جب بات تہذیب کی سطح پر ہو تو جو حقیقت اظہر من الشمس ہے وہ یہی ہے کہ مغربی تہذیب کا امریکی روپ لامذہبی ہے۔

(iii) ابتدائی تصور انسان

مغربی تہذیب کے امریکی روپ میں انسان کو اولین دور کا انسان تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت امریکہ والوں کے لباس، کھانے پینے، رہن سہن، ادب اور فنون لطیفہ سے ملتا ہے۔

(iv) خاندان کی عدم موجودگی

خاندان کی عدم موجودگی مغربی تہذیب کے امریکی روپ کا نمایاں خاصہ ہے۔ اس کی بنیاد بھی ''انفرادیت پسندی'' کا اصول بنا ہے۔

(v) اخلاقیات کا فقدان

مذکورہ بالا چاروں خواص کی وجہ سے مغربی تہذیب کے امریکی روپ میں ''اخلاقیات'' موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے انفرادی اور ریاستی ہر دو سطحوں پر انسانوں کو قتل کرنا، عورتوں اور

مردوں کا جنسی استحصال، فطرت کی پامالی وغیرہ جیسے گھناؤنے افعال روا سمجھے جاتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے یورپی روپ کے خواص

مغربی تہذیب کے یورپی روپ کے خواص درج ذیل ہیں:

(i) خاندان

یورپ والے خاندان کو اہمیت دیتے ہیں اور امریکیوں کے برعکس اس کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

(ii) مذہبیت

یورپی مذہب پرست ہیں۔ یہ الگ بات کہ اس مذہب پرستی نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا۔ بلکہ امریکیوں کی لامذہبیت نے جتنا انسانی خون بہایا ہے یورپی مذہب پرستی نے اس سے زیادہ وحشت و سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے اور کر رہی ہے۔ اس کے ثبوت و شواہد برطانیہ، جرمنی، فرانس اور سکنڈے نیویا جیسے ترقی یافتہ معاشروں میں دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ فرد اور ریاست کے امتیازی رویوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

(iii) تصور انسان

یورپ والوں کا تصور انسان بھی امریکیوں سے مختلف ہے۔ یہ تصور امریکیوں سے ترقی یافتہ ہے۔ یورپی انسان کو ابتدائی انسان نہیں تصور کرتے تاہم وہ انسان کو صرف ''مغربی'' ہی تصور کرتے ہیں۔ وہ جو ''جدید'' اور ''مغربی'' ہے، خواہ وہ کسی خطے کا ہے، انسان ہے اور جو ان دونوں معیاروں پر پورا نہیں اترتا ہے وہ انسان نہیں ہے۔

امریکیوں کی طرح یورپ والوں کا تصور انسان بھی انسانیت کو انسانی خون کی ارزانی کے تحفے کے سوا اور کچھ نہیں دے رہا۔

(iv) یورپی انفرادیت پسندی

امریکیوں کے برعکس یورپی انفرادیت پسندی خاندان اور دیگر معاشی و معاشرتی گروہوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

(v) طبقاتی نظام

امریکہ کے برعکس یورپ کے بعض ملکوں میں جاگیرداری دور کا طبقاتی نظام معاشرتی سطح پر اب بھی موجود ہے۔

(vi) بادشاہت

یورپ کے بعض ملکوں میں جمہوریت کے باوجود بادشاہی موجود ہے۔ امریکہ والے بادشاہت کے ہر روپ کے خاتمے کا اعلان کر چکے ہیں۔ کیونکہ وہ جمہوریت کے امریکی ماڈل کو دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یورپ کے بادشاہی کو ماننے والے ملک بعض وجوہات کی بنا پر اس کے حامی نہیں اور یہ وجوہات کچھ نہیں سوائے تہذیبی ہونے کے۔

ان بنیادی اختلافات کے باوجود مغربی تہذیب کے دونوں روپ اپنے علاوہ باقی انسانیت کیلئے یکساں طور پر ''سفاک'' ہیں۔ جو ان میں شاید واحد قدر مشترک ہے۔ اگر کوئی اور قدر مشترک ہے تو ہمارے معزز قاری اسے خود ہی اس پیرگراف میں شامل کر دیں۔ ہم لکھنے کیلئے جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ (تاہم ہمیں تو یہی یقین ہے کہ قاری بھی ہم سے اتفاق کریں گے اور اس تحریر میں چھوڑی گئی جگہ سدا خالی ہی رہے گی' کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ امریکہ اور یورپ میں سوائے انسان دشمنی کے اور کوئی قدر مشترک پیدا ہو جائے۔)

یورپ اور امریکہ کے درمیان رونما ہونے والے ''تہذیبی تصادم'' کی شہادت خود سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے فراہم کی ہے' ملاحظہ ہو درج ذیل اقتباس:

''......مغرب کے دو اہم اجزاء کے درمیان تعلق وقت کے ساتھ ساتھ بدلا ہے۔

امریکی اپنی تاریخ کے بیشتر عرصہ کے دوران میں خود کو یورپ سے مختلف (الٹ) قرار دلواتے رہے ہیں۔ امریکہ آزادی' مساوات' موقع اور مستقبل کی سرزمین تھا جبکہ یورپ ترجمانی کرتا تھا جبر و تسلط' طبقاتی کشمکش' اجارہ داری' پسماندگی کی۔ یہاں تک کہا گیا کہ امریکہ ایک علیٰحدہ تہذیب ہے۔"

کتاب کا دوسرا باب "تہذیبیں: تاریخ اور عصر حاضر میں" باقی کتاب کے سطحی صحافیانہ اسلوب سے بہتر اور گہرے علمی اسلوب کا حامل ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے قرار دیا ہے کہ

"انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔"

اور پھر انہوں نے دنیا میں موجود بڑی تہذیبوں کا مختصراً ذکر کیا ہے جن میں شامل ہیں:

(1) چینی **(2)** جاپانی **(3)** ہندو **(4)** اسلامی **(5)** آرتھوڈوکس **(6)** مغربی **(7)** لاطینی امریکی **(8)** افریقی

پروفیسر صاحب مذکورہ بالا تمام تہذیبوں کا تعارف کروانے کے بعد ایک بہت اہم نقطہ سامنے لائے ہیں کہ:

"مذہب تہذیبوں کا ایک مرکزی تشکیلی وصف ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ کرسٹوفر ڈاسن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"عظیم مذاہب عظیم تہذیبوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔"

تاہم اس ضمن میں ایک زیادہ اہم حقیقت انہوں نے حاشیے میں پیش کی ہے جو من و عن یہاں نقل کی جاتی ہے:

"یہودی تہذیب؟ تہذیب کے اکثر علماء اس کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ لوگوں کی تعداد کے حوالے سے تو یہودیت واضح طور پر ایک بڑی تہذیب نہیں ہے۔ ٹائن بی اس کو ایک گرفتار تہذیب قرار دیتا ہے جو ابتدائی شامی تہذیب سے پیدا ہوئی تھی۔ تاریخی طور پر یہ عیسائیت اور اسلام ہر دو کے ساتھ منسلک ہے اور کئی صدیوں سے

یہودی اپنا ثقافتی تشخص مغربی' آرتھوڈوکس اور اسلامی تہذیبوں میں
ہی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کے بننے سے یہودیوں کو ایک
تہذیب کے تمام معروضی اسباب ولوازم حاصل ہو گئے ہیں یعنی
مذہب' زبان' رسوم و رواج' ادب' ادارے اور ایک علاقہ جاتی اور
سیاسی وطن۔ لیکن موضوعی تشخص کا کیا ہو؟ مختلف ثقافتوں میں رہنے
والے یہودی تشخص کی دو انتہاؤں کے درمیان جی رہے ہیں' ایک تو
ایسے یہودی ہیں جو یہودیت اور اسرائیل سے مکمل طور پر جڑے
ہوئے ہیں اور دوسرے ایسے یہودی ہیں جو یہودیت سے معمولی
جڑت رکھتے ہیں اور اس تہذیب سے مکمل جس میں وہ رہتے ہیں
تاہم مؤخرالذکر صورت صرف مغرب میں سامنے آئی ہے۔''

اس تبصرے سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ مغرب اسرائیل کی مکمل تائید وحمایت اور پشت پناہی کے باوجود یہودیت کو کسی تہذیب کی بنیاد یا کوئی تہذیب تسلیم نہیں کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس موضوع پر پاکستان میں خصوصاً ضرور مباحثہ کیا جائے گا۔

سرد جنگ کے دوران میں سیاسی تبصروں یا بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں میں دنیا کو ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ سرد جنگ کے بعد ان دونوں اصطلاحوں کی جگہ دو نئی اصطلاحیں استعمال میں آ گئیں۔ ''شمال'' اور ''جنوب'' پروفیسر سیموئیل نے ان نئی اصطلاحوں کی جامعیت اور بلاغت کی وکالت ان الفاظ میں کی ہے:

''جغرافیائی علاقوں کو ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی اصطلاحوں
میں پیش کرنے سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے نیز یہ اصطلاحیں نسل پسندانہ
ہیں۔ ''شمال'' اور ''جنوب'' کو آفاقی طور پر دو متعینہ قطبین کے حوالے
سے جانا مانا جاتا ہے ''مشرق'' اور ''مغرب'' کا ایسا کوئی متعینہ مقام
نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز کا مشرق اور مغرب؟ اس

سب کا انحصار اس امر پر ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔ درحقیقت ''مشرق'' اور ''مغرب'' یوریشیا کے مشرقی اور مغربی حصوں کا حوالہ تھے۔ تاہم امریکی زاویۂ نگاہ سے مشرق بعید درحقیقت مغرب بعید ہے۔ بیشتر چینی تاریخ میں مغرب سے مراد ہوتا تھا ہندوستان' جبکہ جاپان میں ''مغرب'' کا مفہوم عموماً چین ہوتا تھا۔''

مجموعی طور پر' ''تہذیبوں کا تصادم'' مغربی تہذیب کے امریکی حصے کی تازہ حکمت عملی کو منکشف کرتی ہے جس کے مطابق اٹھائے گئے اقدامات کو ساری دنیا کے غیر مغربی لوگ خصوصاً برصغیر کے مسلمان ان دنوں ملاحظہ کر رہے ہیں اور ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ آنے والے پورے عشرے میں مغرب اپنی بقا کیلئے غیر مغربی خصوصاً اسلامی' چینی اور اس خطے کی دوسری بڑی تہذیبوں کے خلاف جاری کارروائیوں میں مزید اضافہ کرے گا اور دنیا تاریخ میں رونما ہونے والے بڑے المیوں اور خونریزیوں کو مستقبل میں بہت معمولی کہے گی۔

محمد احسن بٹ

مثال پبلشنگ

20- حبیب بینک بلڈنگ' اردو بازار' لاہور

E.Mail:muhammadahsanbutt@yahoo.com

حصہ اول

تہذیبوں کی دنیا

باب نمبر 1

دنیا کی عالمی سیاست کا نیا دور

تعارف: پرچم اور ثقافتی تشخص

3 جنوری 1992ء کو ماسکو کی ایک سرکاری عمارت کے آڈیٹوریم میں روسی اور امریکی عالموں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ دو ہی ہفتے پیشتر سوویت یونین ختم ہوئی تھی اور رشین فیڈریشن ایک آزاد ملک بنی تھی۔ نتیجتاً لینن کا مجسمہ جو پہلے آڈیٹوریم کے سٹیج کی زینت ہوا کرتا تھا اب غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ رشین فیڈریشن کا پرچم سامنے والی دیوار پر آویزاں تھا۔ ایک امریکی نے تبصرہ کیا کہ وہاں مسئلہ صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ پرچم کو الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ جب روسی میزبان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو انہوں نے فوراً خاموشی کے ساتھ پہلے وقفے ہی میں اس غلطی کی اصلاح کر لی۔

سرد جنگ کے بعد کے برسوں میں لوگوں کے تشخص اور ان کے تشخص کی علامتوں میں ڈرامائی تبدیلی کی شروعات دیکھنے میں آئیں۔ عالمی (گلوبل) سیاست ثقافتی خطوط پر نئے سرے سے تشکیل پانے لگی۔ الٹے پرچم عبوری دور کی علامت تھے تاہم پرچم زیادہ سے زیادہ اونچے اور درست ہونے لگے اور روسی اور دوسرے لوگ متحرک و بیدار ہونے اور ان پرچموں اور اپنے نئے ثقافتی تشخص کی علامتوں کے زیر سایہ مارچ کرنے لگے۔

18/ اپریل 1994ء کو دو ہزار لوگوں نے سراجیوو میں سعودی عرب اور ترکی کے پرچموں کو لہراتے ہوئے مظاہرہ کیا۔ اقوام متحدہ' ناٹو اور امریکی پرچموں کے بجائے ان پرچموں کو لہرا کر سراجیوو کے لوگوں نے اپنا تشخص اپنے مسلم رفقا سے کروایا اور دنیا کو بتا دیا کہ کون ان کا حقیقی دوست ہے اور کون غیر حقیقی دوست ہے۔

16/ اکتوبر 1994ء کو لاس اینجلس میں 70,000 لوگوں نے ''میکسیکی پرچموں کے سمندر'' تلے مارچ کیا اور دفعہ 187 کے خلاف احتجاج کیا جو ایک ریفرنڈم اقدام تھا جس میں غیر قانونی تارکین وطن اور ان کے بچوں کو حاصل ریاستی فوائد کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے پوچھا کہ آخر وہ لوگ کیوں ''میکسیکی پرچم کے تلے چل رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ یہ ملک انہیں مفت تعلیم مہیا کرے'' انہیں تو امریکی پرچم لہرانا چاہئے تھا۔ دو ہفتوں بعد ہی احتجاج کرنے والوں نے امریکی پرچم کو الٹا اٹھا کر مارچ کیا۔ یہ پرچم دفعہ 187 کی یقینی کامیابی کو نمایاں کر رہے تھے جس کو کیلیفورنیا کے 59 فیصد ووٹروں نے قبول کر لیا تھا۔

سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں پرچم اور دوسری ثقافتی تشخص کی علامتیں اہم ہو گئی ہیں۔ بشمول صلیب' ہلال اور حتیٰ کہ سکارف بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثقافت اہم ہو گئی ہے اور ثقافتی شناخت وہ ہوتی ہے جو بیشتر لوگوں کیلئے زیادہ بامعنی ہوتی ہے۔ لوگ نئی لیکن اکثر پرانی شناختیں دریافت کر رہے ہیں اور نئے مگر اکثر پرانے پرچموں تلے مارچ کر رہے ہیں جو نئے مگر اکثر پرانے دشمنوں سے جنگ کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اس عہد کے حوالے سے مائیکل ڈبنز کے ناول ''مردہ بحری جھیل'' میں چرب زبان مقرر کی زبانی کہلوایا گیا ہے ''حقیقی دشمنوں کی عدم موجودگی میں سچے دوست بھی نہیں ہوا کرتے ہیں۔ جب تک ہم ان سے نفرت نہیں کرتے جو کہ ہم میں سے نہیں ہیں تو ہم اپنوں سے محبت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ وہ پرانی سچائیاں ہیں جنہیں ہم ایک صدی کے بعد دریافت کر رہے ہیں اور زیادہ جذباتی بازاری زبان میں۔ جو لوگ انہیں رد کرتے ہیں وہ اپنے خاندان کو رد کرتے ہیں' اپنے ورثے کو' اپنی ثقافت کو' اپنے پیدائش کے حق کو' عین اپنے آپ

کو! انہیں بس یونہی معاف نہیں کر دیا جائے گا۔'' ان پرانی سچائیوں میں موجود تلخ حقیقت کو سیاستدانوں اور عالموں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ تشخص کو تلاش کرنے اور نسل پرستی کو دوبارہ وجود میں لانے والے لوگوں کیلئے دشمنوں کا ہونا لازمی ہے اور سب سے زیادہ ممکنہ طور پر خطرناک دشمنیاں دنیا کی بڑی تہذیبوں کے مابین تقسیمی خطوط کے آر پار موجود ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں ثقافت اور ثقافتی شناختیں جو کہ وسیع ترین سطح پر تہذیبی شناختیں ہیں' اتحاد' اختلاف اور جھگڑوں کے تانے بانے کو تشکیل دے رہی ہیں۔ اس کتاب کے پانچ حصے اس مرکزی قضیئے (مفروضے) کے منطقی نتیجوں کو واضح کرتے ہیں۔

پہلا حصہ: تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمی (گلوبل) سیاست کثیر قطبی (ملٹی پولر) اور کثیر التہذیبی ہو گئی ہے۔ جدیدیت مغربیت سے ممتاز و منفرد ہے اور نہ تو کسی بھی با معنی انداز میں کوئی آفاقی تہذیب تخلیق کر رہی ہے اور نہ ہی غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

دوسرا حصہ: تہذیبوں کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ مغرب اپنا اثر ورسوخ کھو رہا ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی معاشی' فوجی اور سیاسی قوت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اسلام میں آبادی کے اضافے سے مسلم ملکوں اور ان کے پڑوسیوں کیلئے عدم استحکام پیدا کرنے والے عوامل فروغ پا رہے ہیں نیز غیر مغربی تہذیبیں عمومی طور پر اپنی ثقافتی اقدار کا دوبارہ اثبات کر رہی ہیں۔

تیسرا حصہ: تہذیبوں کی بنیاد پر ایک عالمی نظام ابھر رہا ہے۔ جو معاشرے ثقافتی طور پر یکسانیت رکھتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں منتقل کرنے کی کوشش کامیاب نہیں رہی۔ نیز ملک کسی مرکزی ریاست کے گرد گروپ بنا رہے ہیں۔

چوتھا حصہ: مغرب کے آفاقیت کے دعوے اس کو دوسری تہذیبوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متصادم کر رہے ہیں' زیادہ سنگینی سے اسلام اور چین کے ساتھ؛ مقامی سطح پر تقسیمی خط کی جنگوں' خصوصاً مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگوں نے ''ہم رشتہ ملک

بھروسے'' کوفروغ دیا ہے۔جنگوں کے پھیلنے کا خطرہ نیز ان جنگوں کو روکنے کیلئے مرکزی ریاستوں کی کوششیں۔

پانچواں حصہ: مغرب کی بقا کا دارومدار اس امر پر ہے کہ امریکی اپنے مغربی تشخص کا دوبارہ اثبات کریں اور مغرب کے لوگ اپنی تہذیب کو آفاقی نہیں منفرد تسلیم کریں اور غیر مغربی معاشروں کی طرف سے درپیش چیلنجوں سے اس کو محفوظ کرنے اور نیا بنانے کیلئے متحد ہوں۔تہذیبوں کی عالمی (گلوبل) جنگ سے بچنے کا دارومدار اس امر پر ہے کہ دنیا کے لیڈر عالمی سیاست کے کثیر التہذیبی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو برقرار رکھنے میں تعاون کریں۔

کثیر قطبی' کثیر التہذیبی دنیا

سرد جنگ کے دوران میں' تاریخ میں پہلی بار' عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر التہذیبی ہو گئی تھی۔ انسان جب سے موجود ہے تہذیبوں کے مابین روابط یا تو معطل رہتے تھے یا وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔ پھر جدید عہد کے آغاز کے ساتھ' قریباً **1500** عیسوی میں' عالمی سیاست کی دو جہتیں رونما ہوئیں۔ چار سو سال سے زیادہ مدت تک' مغرب کی قومی ریاستیں ...... برطانیہ' فرانس' سپین' آسٹریا' پروشیا' جرمنی' امریکہ اور دیگر ...... نے مغربی تہذیب کے اندر ایک کثیر قطبی بین الاقوامی نظام تشکیل دیا اور باہمی ربط ضبط رکھا' مسابقت کی اور ایک دوسرے سے جنگیں لڑیں۔اسی زمانے میں مغربی قوموں نے ہر دوسری تہذیب تک توسیع پائی' انہیں فتح کیا' نوآبادی بنایا یا فیصلہ کن انداز میں متاثر کیا۔سرد جنگ کے دوران میں عالمی سیاست دو قطبی ہو گئی اور دنیا تین حصوں میں بٹ گئی۔امریکہ کی قیادت میں زیادہ تر سرمایہ دار اور جمہوری معاشروں کا ایک گروپ سوویت یونین کی قیادت میں اور اس سے جڑے ہوئے غریب کمیونسٹ معاشروں کا ایک گروپ باہمی نظریاتی' سیاسی' معاشی اور بعض اوقات فوجی مقابلے میں مصروف تھے۔ یہ تصادم زیادہ تر ان دونوں کیمپوں سے باہر تیسری دنیا میں رونما ہوا' جس کے ملک اکثر غریب تھے' سیاسی استحکام نہیں رکھتے تھے' نئے نئے آزاد ہوئے تھے اور غیر جانبداری کے

دعویدار تھے۔

1980ء کی دہائی کے اواخر میں کمیونسٹ دنیا ٹوٹ پھوٹ گئی اور سرد جنگ کا بین الاقوامی نظام تاریخ کا حصہ بن گیا۔ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں لوگوں کے درمیان نظریاتی' سیاسی یا معاشی امتیازات نہیں ہیں۔ ان کے درمیان امتیازات ثقافتی ہیں۔ لوگ اور قومیں اس انتہائی بنیادی مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے ہیں جو کہ انسانوں کو درپیش ہوسکتا ہے یعنی ہم کون ہیں؟ اور وہ اسی روایتی طریقے سے اس مسئلے کا حل پیش کر رہے ہیں جیسا کہ انسان اس کا حل پیش کرتے آئے ہیں۔ یعنی ان چیزوں کے حوالے سے جو ان کیلئے زیادہ بامعنی ہوتی ہیں۔ لوگ اپنے آپ کو نسل' مذہب' زبان' تاریخ' اقدار' رسم و رواج اور اداروں سے شناخت کرواتے ہیں۔ وہ ثقافتی گروپوں سے شناخت کرواتے ہیں یعنی قبیلوں' نسلی گروپوں' مذہبی برادریوں' قوموں اور وسیع ترین سطح پر تہذیبوں سے۔ لوگ سیاست کو نہ صرف اپنے مفادات کے فروغ کیلئے بلکہ اپنے تشخص کے تعین کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہم اسی وقت یہ جانتے ہیں کہ ہم کون ہے جب ہم یہ جانتے ہوں کہ ہم کون نہیں ہیں اور اکثر ایسا ہم صرف تب جانتے ہیں جب اپنے دشمن کے بارے میں جانتے ہوں۔

قومی ریاستیں عالمی معاملات کے بڑے کردار ہیں۔ ان کا رویہ ماضی کی طرح طاقت اور دولت کی جستجو سے متعین ہوتا ہے لیکن یہ ثقافتی ترجیحات' اشتراکات اور اختلافات سے بھی متعین ہوتا ہے۔ ریاستوں کی اہم ترین گروپ بندیاں سرد جنگ کے زمانے کے تین بلاک نہیں رہے ہیں بلکہ دنیا کی سات یا آٹھ بڑی تہذیبیں۔ غیر مغربی معاشرے' خصوصاً مشرقی ایشیا میں' اپنی معاشی ثروت کو بڑھا رہے ہیں اور فوجی قوت اور سیاسی اثر ورسوخ کیلئے بنیادیں تخلیق کر رہے ہیں۔ جیسے ہی ان کی طاقت اور خود اعتمادی بڑھے گی' غیر مغربی معاشرے اپنی ثقافتی اقدار کا اثبات کریں گے اور ان پر مغرب کی 'تھوپی' ہوئی اقدار کو رد کر دیں گے۔ ہنری کسنجر نے کہا ہے ''اکیسویں صدی کا بین الاقوامی نظام کم از کم چھ طاقتوں پر مشتمل ہوگا' امریکہ' یورپ' چین' جاپان' روس اور ہوسکتا

ہے ہندوستان۔ درمیانے درجے کے چھوٹے ملکوں کے اضافے کے ساتھ۔'' ہنری کسنجر کی بیان کردہ چھ بڑی طاقتیں پانچ بہت مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتی ہیں اور مزید یہ کہ اہم اسلامی ریاستیں بھی تو ہیں جن کے سٹریٹیجک محل وقوع' کثیر آبادیوں یا تیل کے ذخائر نے انہیں عالمی معاملات میں بارسوخ بنا دیا ہے۔ اس نئی دنیا میں' مقامی سیاست نسل پرستی کی سیاست بن گئی ہے' عالمی سیاست تہذیبوں کی سیاست ہے۔ سپر پاوروں کی رقابت کی جگہ تہذیبوں کے تصادم نے لے لی ہے۔

اس نئی دنیا میں سب سے زیادہ غالب' اہم اور خطرناک جھگڑے سماجی طبقوں' امیر اور غریب یا دوسرے معاشی اعتبار سے قائم گروپوں کے درمیان نہیں بلکہ مختلف ثقافتی اکائیوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان ہوں گے۔ قبائلی جنگیں اور نسلی جھگڑے تہذیبوں کے اندر رونما ہوں گے۔ تاہم مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں اور گروپوں کے درمیان تشدد کے فروغ پانے کے امکانات موجود ہوتے ہیں کیونکہ ان تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی دوسری ریاستیں اور گروپ اپنے ''ہم رشتہ ملکوں'' کو مدد دیتے ہیں۔ صومالیہ میں ہونے والا قبیلوں کا خونیں تصادم وسیع تر جھگڑے کا خطرہ کھڑا نہیں کرتا ہے اور روانڈا میں قبیلوں کا خونیں تصادم یوگنڈا' زائر اور برونڈی کو متاثر کر سکتا ہے لیکن ان سے زیادہ نہیں۔ بوسنیا' قفقاز' وسطی ایشیا یا کشمیر میں ہونے والے تہذیبوں کے خونیں تصادم زیادہ بڑی جنگوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے جھگڑوں میں روس نے سربوں کو سفارتی امداد دی اور سعودی عرب' ترکی' ایران اور لیبیا نے بوسنیائیوں کو ہتھیار اور فنڈز فراہم کئے۔ اس کی وجہ نہ تو نظریاتی ہے نہ طاقت کی سیاست نہ معاشی مفادات بلکہ ثقافتی رشتہ داری۔ واکلیو ہیول کہتا ہے ''ثقافتی جھگڑے بڑھ رہے ہیں اور تاریخ کے کسی بھی زمانے سے زیادہ آج خطرناک ہو چکے ہیں۔'' نیز ژاک ڈیلورس متفق ہے کہ ''مستقبل کے جھگڑے معاشی یا نظریاتی کے بجائے ثقافتی عوامل کی بنا پر وقوع پذیر ہوں گے۔'' اور سب سے زیادہ خطرناک ثقافتی جھگڑے وہ ہیں جو تہذیبوں کے درمیان تقسیمی خطوط کے ساتھ ساتھ ہیں۔

سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں ثقافت فیصلہ کن اور اتحاد ساز قوت ہے۔ لوگ نظریات کے تحت الگ ہوئے لیکن ثقافت نے انہیں مربوط کر دیا ہے جیسا کہ دو جرمنی ہو چکے ہیں اور دو کوریا اور کئی چین ایک ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ معاشرے نظریات یا تاریخ کے ہاتھوں متحد ہوتے ہیں لیکن تہذیب انہیں منقسم کر دیتی ہے جیسا کہ سوویت یونین' یوگوسلاویہ اور بوسنیا میں ہوا' یا تناؤ کو بڑھاتی ہے جیسا کہ یوکرائن' نائیجیریا' سوڈان' ہندوستان' سری لنکا اور کئی دوسرے معاشروں کے معاملے میں ہے۔ مشترک ثقافت والے ملک ایک دوسرے سے معاشی اور سیاسی حوالے سے تعاون کرتے ہیں۔ وہ بین الاقوامی تنظیمیں جو رکن ریاستوں کے ثقافتی اشتراکات کی وجہ سے تشکیل پذیر ہوئی ہیں مثلاً یورپی یونین' ان تنظیموں سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں جو ثقافتوں سے بالاتر ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ آہنی پردہ چالیس برس تک یورپ میں مرکزی تقسیمی خط تھا۔ وہ خط مشرق میں کئی سو میل تک کھنچا ہوا تھا۔ اب یہ خط ایک طرف تو مغربی عیسائیت کو الگ کر رہا ہے اور دوسری طرف مسلم اور آرتھوڈوکس لوگوں کو۔

مختلف تہذیبوں میں فلسفیانہ تصورات' بنیادی اقدار' سماجی رشتے' رسم و رواج اور زندگی کے متعلق مجموعی تصور مختلف ہوا کرتا ہے۔ لگ بھگ ساری دنیا میں مذہب کے احیاء نے ان ثقافتی اختلافات کو بھی دوبارہ ابھار دیا ہے۔ ثقافتیں تبدیل ہو سکتی ہیں اور ہر دور میں ان کا معیشت اور سیاست پر اثر کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ تاہم تہذیبوں کے درمیان سیاسی اور معاشی ارتقا میں اختلافات واضح طور پر ان کی مختلف ثقافتوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ مشرقی ایشیا کی معاشی ترقی کا سرچشمہ مشرقی ایشیا کی ثقافت ہے۔ اسی طرح ان معاشروں میں جمہوری عدم استحکام بھی ان کی ثقافت سے مربوط ہے۔ زیادہ تر اسلامی دنیا میں جمہوریت کی ناکامی کا بڑا سبب اسلامی ثقافت ہے۔

مشرقی یورپ کے سابق کمیونسٹ معاشروں اور سابق سوویت یونین میں ہونے والی تبدیلیوں میں ان کے تہذیبی تشخص کا اہم کردار ہے۔ یہ معاشرے مغربی عیسائیت کے ورثے کے ساتھ معاشی ترقی اور جمہوری سیاست کی طرف گامزن ہیں۔ آرتھوڈوکس ملکوں میں معاشی اور سیاسی ارتقا کے امکانات غیر یقینی ہیں۔ مسلم جمہوریاؤں میں

امکانات مایوس کن ہیں مغرب ایک طاقتور تہذیب ہے اور آنے والے برسوں میں بھی رہے گی۔ تاہم اس کی طاقت دوسری تہذیبوں کے زوال سے منسلک ہے۔

مغرب اپنی اقدار کو فروغ اور اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے کوششیں کر رہا ہے اور غیر مغربی معاشرے ایک انتخاب سے دوچار ہیں۔ کچھ تو مغرب کی ہمسری یا مغرب سے اتحاد یا مغرب کی حاشیہ برداری اختیار کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ دیگر کنفیوشسی اور اسلامی معاشرے مغرب کی مزاحمت اور نئے توازن کیلئے معاشی اور فوجی قوت کو بڑھانے کیلئے کوشاں ہیں۔ لہٰذا سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست کا محور مغربی قوت اور ثقافت کا غیر مغربی قوت اور ثقافت کے ساتھ تعامل (انٹرایکشن) ہے۔

سرد جنگ کے بعد کی دنیا سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کی دنیا ہے۔ ثقافتی اشتراکات اور اختلافات ریاستوں کے مفادات' مخاصمتوں اور اتحادوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ دنیا کے سب سے زیادہ اہم ملکوں کا تعلق مختلف تہذیبوں سے ہے۔ وہ مقامی جھگڑے جن کے پھیل کر بڑی جنگ میں بدل جانے کا بہت امکان ہے مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں اور ریاستوں کے درمیان موجود ہیں۔ غالب سیاسی اور معاشی ترقی کے تانے بانے (پیٹرن) ہر تہذیب میں مختلف ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی ایجنڈے کا کلیدی مسئلہ تہذیبوں کے درمیان اختلافات ہے۔ طاقت طویل عرصے سے غالب مغرب سے غیر مغربی تہذیبوں کی طرف منتقل ہورہی ہے۔ عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر التہذیبی ہو چکی ہیں۔

دیگر دنیائیں؟ نقشے اور تعریفیں

سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست کی یہ تصویر ثقافتی عوامل سے وجود پذیر ہوئی ہے اور اس میں مختلف ریاستوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں اور ریاستوں کی شمولیت کو بہت زیادہ سادہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس میں کئی باتیں فراموش کر دی گئی ہیں' کچھ باتیں مسخ کر دی گئی ہیں اور دیگر باتیں مبہم اور غیر واضح ہیں۔ تاہم اگر ہم دنیا کے متعلق سنجیدگی سے سوچیں اور

اس پر متاثر کن انداز سے عمل کریں تو اس طرح کے سادہ سے بنائے گئے حقیقت کے نقشے' کچھ نظریات' تصورات' نمونے (ماڈل)' تعریفیں ضروری ہوتی ہیں۔ ان دانشورانہ چیزوں کے بغیر' جیسا کہ ولیم جیمز نے کہا ہے ''صرف ایک شور شرابے والا کنفیوژن ہی باقی رہتا ہے۔'' تھامس کوہن نے اپنی کلاسیک تصنیف ''سائنسی انقلاب کی ساخت'' (THE STRUCTURE OF SCIENTIFIC REVOLUTION) میں عالمانہ اور سائنسی پیش رفت (ایڈوانس) کو دکھایا ہے کہ جب ایک تعریف جو نئے یا نئے دریافت شدہ حقائق کی وضاحت کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری تعریف لے لیتی ہے جو ان حقائق کو زیادہ اطمینان بخش انداز سے بیان کرتی ہے۔ کوہن لکھتا ہے ''ایک نظریے کو بطور تعریف قبولیت کیلئے اپنے متقابل نظریوں سے بہتر دکھائی دینا چاہئے' لیکن اس کو سامنے آسکنے والے تمام حقائق کی وضاحت کرنا لازمی نہیں ہوتا اور نہ ہی درحقیقت وہ کرتا ہے۔'' جان لیوس گیڈیز دانشمندانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''کسی شخص کو کسی اجنبی علاقے میں راستہ ڈھونڈنے کیلئے عموماً کسی نہ کسی نقشے کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ نقشہ کشی اپنے آپ کو پہچاننے کے مانند' ایک ضروری سہولت ہے جو ہمیں یہ دکھاتی ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں کو جا رہے ہیں۔'' وہ نشاندہی کرتا ہے کہ سپر پاوروں کی سرد جنگ کا تصور ایسا ہی ایک ماڈل تھا جس کو سب سے پہلے ہیری ٹرومین نے وضع کیا تھا'' جیو پولیٹیکل نقشہ سازی کی ایک سرگرمی (ایکسر سائز) کے طور پر' جو بین الاقوامی منظر کو اس طرح پیش کرتی تھی کہ ہر کوئی اس کو سمجھ سکتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے تحدید کی اس کارگر سٹریٹجی کو وضع کر سکتا تھا جس پر جلد ہی عمل کرنا تھا۔'' تصورات عالم (ورلڈ ویو) اور عارضی نظریے بین الاقوامی سیاست کے ناگزیر رہنما ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کے طلباء اور ماہرین چالیس برسوں تک عالمی معاملات پر سرد جنگ کی انتہائی سادہ مگر فائدہ مند تعریف کے مطابق سوچتے اور عمل کرتے رہے۔ یہ تعریف عالمی سیاست کی ہر پیش رفت کو بیان نہیں کر سکتی تھی۔ کوہن کی اصطلاح کو استعمال

کرنے میں بہت سی خلاف قیاس چیزیں تھیں اور بعض اوقات بڑے معاملات میں یہ تعریف عالموں اور سیاستدانوں کو اندھا کر دیتی تھی جیسا کہ چین اور سوویت روس کے مابین خلیج پیدا ہونے کا معاملہ۔ تاہم عالمی سیاست کے سادہ ماڈل کے طور پر یہ اپنے ہر دوسرے مقابل سے زیادہ اہم مظہر کو بیان کرتی تھی۔ یہ بین الاقوامی معاملات کے بارے میں سوچنے کا ایک جوہری نقطۂ آغاز تھا اور اس نے دو نسلوں تک عالمی سیاست کے بارے سوچ کو صورت دی۔

سادہ تعریفیں یا نقشے انسانی سوچ اور عمل کیلئے ناگزیر ہوا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم نظریے یا ماڈل وضع کر سکتے ہیں اور انہیں اپنے رویوں کی رہنمائی کیلئے شعوری طور پر اپنا سکتے ہیں۔ دوسری طرف اس طرح کے رہنماؤں (گائیڈز) کی ضرورت سے انکار کر سکتے ہیں اور تصور کر سکتے ہیں کہ ہم خاص "معروضی" حقائق کے تناظر ہی میں عمل کریں گے اور ہر مسئلے سے "اس کے تناظر" ہی میں نمٹیں گے تاہم اگر ہم ایسا تصور کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں کے پیچھے پوشیدہ مفروضات' جانبداریاں اور تعصبات ہوتے ہیں جو اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ ہم حقیقت کو دیکھتے ہیں' کن حقائق کو ہم دیکھتے ہیں اور کس طرح ہم ان کی اہمیت اور فوائد کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمیں اس لئے واضح یا مضمر ماڈلوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ہم اس قابل ہوسکیں کہ:

1- ہم حقیقت کو نظم میں لاسکیں اور عمومی بنا سکیں
2- مظہر کے درمیان عارضی ربط کو سمجھیں۔
3- مستقبل کی پیش رفتوں کا اندازہ لگا سکیں اور اگر خوش قسمت ہیں تو ان کے بارے میں پیشگوئی کر سکیں۔
4- اہم اور غیر اہم معاملوں میں فرق کر سکیں۔
5- ہمارے اہداف کو حاصل کرنے کے راستے دکھاتے ہیں۔

ہر ماڈل یا نقشہ ایک تجرید ہوتا ہے اور بعض مقاصد کی نسبت دوسرے مقاصد کیلئے زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایک ایسا روڈ میپ جو ہمیں دکھاتا ہو کہ مقام الف سے مقام ب تک

ڈرائیونگ کیسے کرنی ہے وہی روڈ میپ کسی جہاز کو اڑانے میں ہمارے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس صورت میں ہمیں ایک ایسا نقشہ چاہئے جو کہ ایئر فیلڈز' ریڈیو کے مینارۂ نور' ہوائی راستوں اور جغرافیائی خصوصیات پر مبنی ہو۔ تاہم کسی نقشے کے بغیر ہم کھو جائیں گے۔ نقشہ جتنا تفصیلی ہوگا حقیقت کی اتنا ہی بھرپور طور پر ترجمانی کرے گا۔ تاہم ایک انتہائی تفصیلی نقشہ کسی کام نہیں آتا۔ اگر ہم کسی بڑی شاہراہ (ایکسپریس وے) کے ذریعے ایک بڑے شہر سے دوسرے شہر جانا چاہتے ہوں تو ہمیں کسی نقشے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ اگر کوئی نقشہ ہو بھی تو وہ ہمیں کنفیوژ کر دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نقشے میں بہت سی ایسی معلومات ہوں گی جو گاڑیوں کے ذریعے نقل و حمل سے غیر متعلق ہوں گی۔ نیز اس میں بڑی سڑکیں (ہائی ویز) ذیلی سڑکوں کے ہجوم میں کھوئی ہوئی ہوں گی۔ دوسری طرف ایک ایسا نقشہ جس میں صرف ایک ہی ایکسپریس وے دیا گیا ہو حقیقت کو کافی حد تک ضائع کر دے گا اور اگر ایکسپریس وے کوئی بڑا حادثہ ہو جانے کی وجہ سے بند ہو تو ہماری متبادل راستے ڈھونڈنے کی صلاحیت کو محدود کر دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمیں ایک ایسے نقشے کی ضرورت ہوتی ہے جو حقیقت کی ترجمانی بھی کرے اور حقیقت کو اس انداز سے سادہ کر کے پیش کرے کہ جو ہمارے مقاصد کی بہترین طریقے سے تکمیل کرے۔ دنیا کی سیاست کے بہت سے نقشے یا تعریفیں سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد متعین کی گئی ہیں۔

ایک دنیا: لفاظی اور ہم آہنگی

ایک بہت سادہ اور صاف تعریف اس مفروضے کے تحت متعین کی گئی ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کا مطلب ہے گلوبل سیاست میں اہم جھگڑے کا خاتمہ اور ایک اضافی طور پر ہم آہنگ دنیا کا ظہور۔ اس ماڈل کے جس فارمولے پر سب سے زیادہ بحث ہوئی وہ تھا ''تاریخ کے خاتمے'' (END OF HISTORY) کا مفروضہ جس کو فرانسس فوکویاما نے پیش کیا تھا۔ فوکویاما کہتا ہے'' ہو سکتا ہے ہم تاریخ کے خاتمے کا نظارہ دیکھ رہے ہوں...... جو کہ نوع انسان کے نظریاتی ارتقا اور انسانی حکمرانی کی آخری شکل کے طور پر

مغربی لبرل جمہوریت کی آفاقیت کا نقطۂ عروج ہے۔" وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے تیسری دنیا میں تو کچھ جھگڑے برپا ہوں تاہم عالمی جھگڑا نمٹ چکا ہے اور صرف یورپ میں ہی نہیں (بلکہ عالمی سطح پر)۔ "صرف غیر یورپی دنیا میں" بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی خاص طور پر چین اور سوویت یونین میں نظریات کی جنگ اپنے اختتام پر ہے۔ ہوسکتا ہے مارکسی لینن ازم کے ماننے والے اب بھی موجود ہوں "مانا گوا" پیانگ یانگ نیز کیمبرج' میساچوسٹس جیسے مقامات پر" تاہم مجموعی طور پر لبرل جمہوریت کو فتح حاصل ہو چکی ہے۔ مستقبل نظریات کے حوالے سے کشمکش کیلئے نہیں بلکہ دنیاوی' معاشی اور تکنیکی مسئلوں کو حل کرنے کیلئے مخصوص ہوگا۔ نیز وہ قدرے مایوسی کے ساتھ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ سب کچھ بیزار کر دینے والا ہوگا۔

ہم آہنگی کی توقعات وسیع پیمانے پر ظاہر کی گئی تھیں۔ سیاسی اور دانشور لیڈروں نے یکساں خیالات کا اظہار کیا۔ دیوارِ برلن ٹوٹ گری' کمیونسٹ نظام حکومت منہدم ہو گئے۔ اقوام متحدہ کو ایک نئی اہمیت حاصل ہو گئی۔ سرد جنگ کے زمانے کے سابق دشمن "پارٹنرشپ" اور "عظیم سودے" کر رہے ہیں۔ قیام امن اور باہمی امن آج کا دستور ہو گئے ہیں۔ دنیا کے بڑے ملک کے صدر نے "نئے عالمی نظام" کا اعلان کیا ہے۔ دنیا کی بڑی یونیورسٹی کے صدر نے مطالعاتِ سلامتی (سکیورٹی سٹڈیز) کے پروفیسر کے تقرر کی مخالفت کی ہے کہ اب اس کی ضرورت ہی ختم ہو گئی ہے۔ "خدا کا شکر ہے! ہم جنگ کا مطالعہ نہیں کریں گے کیونکہ جنگ ہی ختم ہو گئی ہے۔"

سرد جنگ کے اختتام پر لفاظی کے لمحے نے ہم آہنگی کا ایک وہم' ایک گمان سا تخلیق کر دیا ہے جو جلد ہی اپنی اصلیت منکشف کر دے گا۔ دنیا 1990ء کی دہائی کے آغاز میں بدل گئی تھی لیکن لازمی طور پر پرامن نہیں ہوئی تھی۔ تبدیلی تو ناگزیر تھی لیکن ترقی نہیں۔ قصہ مختصر ہم آہنگی کے اسی طرح کے وہم اور گمان بیسویں صدی کے ہر بڑے جھگڑے کے اختتام پر پیدا ہوئے تھے۔ پہلی عالمی جنگ "جنگوں کو ختم کرنے والی جنگ" تھی اور دنیا کو جمہوریت کیلئے محفوظ بنانے والی۔ دوسری عالمی جنگ بقول فرینکلن روز ویلٹ "کثیر فریقی اقدام کے نظام' خاص اتحادوں' طاقت کے توازنوں اور ہمیشہ ناکام رہنے والی صدیوں سے جاری

مہمات کا خاتمہ تھی۔'' اس کے بجائے ہم ''امن سے محبت کرنے والی قوموں'' کی ''ایک آفاقی تنظیم'' ہوں گے اور ''امن کے دائمی ڈھانچے'' کی شروعات کریں گے تاہم پہلی عالمی جنگ نے کمیونزم' فاشزم اور ایک صدی پرانے جمہوریت کے رجحان کو جنم دیا۔ دوسری عالمی جنگ نے ایک سرد جنگ کو پیدا کیا جو کہ درحقیقت عالمی سطح کی تھی۔ سرد جنگ کے اختتام پر پیدا ہونے والا ہم آہنگی کا وہم جلد ہی نسلی جھگڑوں اور ''نسلی صفائی'' کے فروغ' لاء اینڈ آرڈر کی شکست و ریخت' اتحادوں کے نئے تانے بانے اور ریاستوں کے درمیان جھگڑوں کے ظہور' نیوکمیونسٹ اور نیو فاشسٹ تحریکوں کے احیاء' مذہبی بنیاد پرستی میں شدت' مغرب سے روس کے تعلقات کے حوالے سے ''ہاں کی پالیسی'' اور ''مسکراہٹوں کی سفارتکاری'' کے خاتمے' خونیں مقامی جھگڑوں کو دبانے میں اقوام متحدہ اور امریکہ کی نااہلی اور ابھرتے ہوئے چین کی خوداعتمادی نے ختم کر دیا۔ دیوار برلن کے ٹوٹ گرنے کے پانچ برس بعد لفظ ''نسل کشی'' اتنی کثرت سے سنا گیا کہ سرد جنگ کے پانچ برسوں میں بھی اتنا نہیں سنا گیا تھا۔ ایک ہم آہنگ دنیا کی تعریف واضح طور پر حقیقت سے اتنی بعید ہے کہ سرد جنگ کے بعد کی دنیا کیلئے کارآمد گائیڈ نہیں ہو سکتی۔

دو دنیائیں: ہم اور وہ

جب بڑے جھگڑوں کے ختم ہونے پر ایک دنیا کی توقعات بندھ رہی ہیں تو ساری انسانی تاریخ میں دو دنیاؤں کے طور پر سوچنے کا رجحان سامنے آ رہا ہے۔ لوگ ہمیشہ لوگوں کو ہم اور وہ' اپنا گروپ اور دوسرا' ہماری تہذیب اور وہ وحشی کے طور پر تقسیم کر کے دیکھنے پر مائل رہے ہیں۔ علماء (دانشور) دنیا کا مشرق اور مغرب' شمال اور جنوب' مرکز اور محیط کی اصطلاحوں میں تجزیہ کرتے تھے۔ مسلم روایتی طور پر دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب میں تقسیم کرتے تھے یعنی جائے امن اور جنگ کا علاقہ۔ یہ تفریق سرد جنگ کے خاتمے پر امریکی سکالروں کی دنیا کی ''امن کے علاقے'' اور ''فساد کے علاقے'' کی تقسیم میں منعکس ہوئی۔ اول الذکر میں شامل تھے مغرب اور جاپان جو دنیا کی 15 فیصد آبادی کے حامل ہیں اور

موخر الذکر میں باقی ہر کوئی۔

دو حصوں والی دنیا حقیقت کی کسی حد تک درست ترجمانی کر سکتی ہے' تقسیم خواہ جن معنوں میں کیا جائے۔ سب سے زیادہ عام تقسیم جو بہت سے ناموں کے تحت سامنے آتی ہے وہ ہے امیر (جدید' ترقی یافتہ) ملک اور غریب (روایتی' غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر) ملک۔ تاریخی حوالے سے یہ معاشی تقسیم مشرق اور مغرب کے درمیان ثقافتی حوالے سے تقسیم سے جڑی ہوئی ہے جس میں زور معاشی خوشحالی پر کم اور بنیادی فلسفے' اقدار اور طرز زندگی پر زیادہ دیا جاتا ہے۔ یہ سب تصورات حقیقت کے کچھ عناصر کی ترجمانی تو کرتے ہیں تاہم محدود بھی ہیں۔ امیر جدید ملک مشترک خصوصیات کے حامل ہونے کی بنا پر مشترک خصوصیات کے حامل غریب ملکوں سے فرق رکھتے ہیں۔ دولت کے حوالے سے فرق معاشروں میں جھگڑے کا باعث بن سکتے ہیں لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ ایسا ابتداً اس وقت ہوتا ہے جب امیر اور زیادہ طاقتور معاشرے غریب اور زیادہ روایتی معاشروں کو فتح کرنے اور کالونی (نو آبادیات) بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب نے چار سو برس تک ایسا ہی کیا اور پھر کچھ کالونیوں نے بغاوت کی اور نو آبادیاتی طاقتوں سے آزادی کیلئے جنگیں لڑیں جو کہ حکمرانی کی خواہش ہی کھو چکی تھیں۔ موجودہ دنیا میں نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے اور آزادی کی نو آبادیاتی جنگوں کی جگہ آزاد لوگوں کے درمیان جھگڑوں نے لے لی ہے۔

ایک زیادہ عمومی سطح پر مخصوص حالات کے سوا امیر اور غریب کے درمیان جھگڑے اس وجہ سے بعید از قیاس ہیں کہ غریب ملک سیاسی اتحاد' معاشی طاقت اور فوجی استعداد کے حوالے سے امیر ملکوں کو چیلنج کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ ایشیا اور لاطینی امریکہ میں معاشی ترقی تونگروں (Haves) اور تہی دستوں (HAVE-NOTS) کی سادہ تقسیم کو دھندلا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے امیر ریاستیں ایک دوسرے سے تجارتی جنگیں لڑیں۔ ممکن ہے غریب ملکوں کے درمیان متشددانہ جنگیں برپا ہوں تاہم غریب جنوب اور امیر شمال کے درمیان ایک بین الاقوامی طبقاتی جنگ حقیقت سے اتنی ہی بعید ہے جتنی کہ ایک خوش ہم آہنگ دنیا۔

دنیا کی ثقافتی تقسیم ہنوز بے سود ہے۔ کسی حد تک مغرب تو ایک اکائی ہے تاہم غیر مغربی معاشروں میں اس کے علاوہ اور کیا مشترک ہے کہ وہ غیر مغربی ہیں؟ جاپانی' چینی' ہندو' مسلم اور افریقی تہذیبوں میں مذہب' معاشرتی ڈھانچے' اداروں اور حاوی اقدار کے حوالے سے اشتراک بہت معمولی ہے۔ غیر مغرب کا اتحاد اور مشرق مغرب کی تقسیم مغرب کی وضع کردہ دیومالا ہے۔ سرد جنگ کے دوران میں نظریاتی حوالے سے دنیا دو قطبوں میں تقسیم تھی تاہم مشرق اور مغرب کی تقسیم واحد ثقافت کی بنیاد پر استوار نہیں ہے۔ ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی تقسیم ثقافتی حوالے سے یورپی تہذیب کو آفاقی طور پر مغربی تہذیب قرار دلوانے کے منحوس عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ ''مشرق اور مغرب'' کہنے سے زیادہ موزوں یہ ہے کہ ''مغرب اور باقی دنیا'' کہا جائے۔

کم وبیش 184 ریاستیں

سرد جنگ کے بعد کی دنیا کا ایک تیسرا نقشہ بین الاقوامی تعلقات کے اس نظریے (تھیوری) کی بنا پر بنایا گیا ہے جس کو اکثر ''حقیقت پسندانہ نظریہ'' کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق دنیا کے معاملات میں ریاستیں اولین بلکہ واحد اہم کردار ہیں۔ ریاستوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت انارکی کی ہوتی ہے لہٰذا ریاستیں اپنی بقا اور سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے اپنی طاقت کو بڑھانے کی کوششیں کرتی ہیں۔ جب ایک ریاست دیکھتی ہے کہ دوسری ریاست اپنی طاقت کو بڑھا رہی ہے اور اس کیلئے ایک پوشیدہ خطرہ بن رہی ہے تو وہ اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے اپنی طاقت کو بڑھانا شروع کر دیتی ہے یا دوسری ریاستوں سے اتحاد قائم کرنے لگتی ہے۔ سرد جنگ کے بعد کی دنیا کی 184 ریاستوں کے مفادات اور اقدامات کے بارے میں انہی مفروضوں کے تحت پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

دنیا کی یہ ''حقیقت پسندانہ'' تصویر بین الاقوامی تعلقات کا تجزیہ کرنے کیلئے ایک انتہائی سودمند نقطۂ آغاز ہے اور بیشتر ریاستی رویے کو واضح کرتا ہے۔ ریاستیں عالمی معاملات میں حاوی اکائیاں ہیں اور رہیں گی۔ ریاستیں ہی افواج تیار کرتی ہیں' سفارتکاری کرتی ہیں' معاہدوں پر مذاکرات کرتی ہیں' جنگیں لڑتی ہیں' بین الاقوامی تنظیموں کو چلاتی ہیں' تجارت اور

پیداوار پر اثر انداز ہوتی اور قابل لحاظ حد تک ان کا انتظام و انصرام بھی سنبھالتی ہیں۔ ریاستوں کی حکومتیں اپنی ریاستوں کی خارجی سلامتی کو یقینی بنانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ (اگرچہ اکثر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت کے طور پر سلامتی کو لاحق داخلی خطرات سے نمٹنے کو بہت زیادہ ترجیح دیں۔) مجموعی طور پر یہ ریاستی تعریف واحد یا دو دنیاؤں والی تعریف یا نقشے سے زیادہ عالمی سیاست کی تفہیم کیلئے کارآمد ہے تاہم اس کی محدودیت بھی واضح طور پر عیاں ہے۔

اس کے تحت فرض کیا گیا ہے کہ تمام ریاستوں کے مفادات اور اقدامات ایک ہی نوع کے ہوا کرتے ہیں۔ اس کا یہ سادہ مفروضہ کہ ریاست کے رویے کی تفہیم کے لیے طاقت ہی سب کچھ ہے کچھ زیادہ سودمند نہیں ہے۔ ریاستیں اپنے مفادات کا طاقت کی اساس پر تعین ضرور کرتی ہیں لیکن اس کیلئے دوسری بنیادیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ بہرکیف ریاستیں اکثر و بیشتر طاقت کو متوازن رکھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن یہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ مغربی یورپ کے ملکوں نے سوویت یونین کے خلاف امریکہ سے بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے دوران میں اتحاد کیا تھا۔ ریاستیں پہلے تو خطروں کا تعین کرتی ہیں اور مغربی یورپی ریاستوں نے اس وقت مشرق میں ایک سیاسی' نظریاتی اور فوجی خطرہ دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے مفادات کو جس انداز سے دیکھا اس کو کلاسیکی حقیقت پسندانہ تعریف' اقدار' ثقافت اور اداروں کے تحت نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ ریاستوں کے مفادات کا تعین نہ صرف داخلی اقدار اور اداروں کی بنیاد پر ہوا کرتا ہے بلکہ بین الاقوامی ضابطوں اور اداروں کے تناظر میں بھی ہوا کرتا ہے۔ سلامتی کے اپنے اولین مفاد سے بالاتر مختلف قسم کی ریاستیں مختلف قسم کے مفادات کا تعین مختلف طریقے سے کرتی ہیں۔ جمہوری ریاستیں دوسری جمہوری ریاستوں سے مماثلت رکھتی ہیں لہٰذا ایک دوسرے سے لڑتی نہیں ہیں۔ کینیڈا کبھی امریکہ کی یلغار کے خطرے سے نمٹنے کیلئے کسی دوسری طاقت سے اتحاد نہیں کرے گا۔

ریاستی تعریف کے مفروضے یورپی تاریخ کے دوران میں ایک بنیادی سطح پر تو حقیقت ثابت ہوئے ہیں تاہم یہ مفروضے ہمیں سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں عالمی سیاست کے سرد جنگ کے دوران اور پہلے کی عالمی سیاست سے فرق کو سمجھنے میں مدد نہیں دے سکتے ہیں تاہم

یہ بات واضح ہے کہ فرق ہوا کرتے ہیں اور ریاستیں اپنے مفادات کو تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور میں مختلف انداز میں حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہوتی ہیں۔ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں ریاستیں اپنے مفادات کا تعین تہذیب کی بنیاد پر کرنے لگی ہیں۔ وہ ایک سی یا ایک ہی ثقافت سے تعلق رکھنے والی ریاستوں سے تعاون اور اتحاد کرتی ہیں جبکہ مختلف ثقافت سے تعلق رکھنے والے ملکوں سے لڑتی ہیں۔ ریاستیں دوسری ریاستوں کے رجحانات کے تناظر میں اپنے مفادات کا تعین کرتی ہیں اور یہ رجحانات اور ان کے متعلق تصورات بھرپور طور پر ثقافتی اعتبار سے متعین ہوا کرتے ہیں۔ عوام اور ریاست ان لوگوں سے کم خطرے محسوس کرتے ہیں جن کے متعلق وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ انہیں سمجھتے ہیں اور ان پر اعتبار کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی زبان' مذہب' اقدار' ادارے اور ثقافت مشترک ہے۔ وہ ان ریاستوں سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہیں جن کے معاشروں کی ثقافت مختلف ہوتی ہے اور جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب جبکہ مارکسی لیننی سوویت یونین ''آزاد دنیا'' کیلئے مزید خطرہ نہیں رہا ہے اور امریکہ کمیونسٹ دنیا کیلئے ایک جوہری خطرہ نہیں رہا ہے تو دونوں دنیاؤں کے ملک اب خطرات کو ان معاشروں سے امڈتا ہوا دیکھ رہے ہیں جو ان سے ثقافتی حوالے سے مختلف ہیں۔

اگرچہ ریاستیں عالمی معاملات میں اولین کردار کی حامل ہیں تاہم ان کو خودمختاری' عملیت اور اقتدار کے حوالے سے رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ اب بین الاقوامی ادارے ریاستوں کے ان کی اپنی حدود میں کئے جانے والے کاموں پر بھی فیصلہ اور تحدید کا حق لے رہے ہیں۔ بہت سے معاملوں میں زیادہ تر یورپ میں' بین الاقوامی ادارے ان کاموں کو سرانجام دے رہے ہیں جو پہلے ریاستوں کا خاصہ ہوتے تھے اور طاقتور بین الاقوامی بیورو کریسیاں وجود میں آ رہی ہیں جو شہریوں سے براہ راست معاملہ کر رہی ہیں۔ عالمی سطح پر ریاستوں کی طاقت اس طور سے کم ہو رہی ہے کہ وہ اس کو ذیلی ریاستوں' علاقائی' صوبائی اور مقامی سیاسی اکائیوں کو منتقل کر رہی ہیں۔ بہت سی ریاستوں میں بشمول ان کے جو ترقی یافتہ دنیا میں واقع ہیں ایسی علاقائی تحریکیں موجود ہیں جو ٹھوس خودمختاری کی مانگ کر رہی ہیں۔

ریاستی حکومتیں کافی حد تک اپنے ملک کے اندر اور باہر زر کی آمد و رفت کو کنٹرول کرنے کی اہلیت کھو چکی ہیں نیز نظریات' ٹیکنالوجی' اشیاء اور لوگوں کے بہاؤ کو قابو میں لانے میں دشواری پا رہی ہیں۔ المختصر ریاستی سرحدیں کھلتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ یہ سب پیش رفتیں کچھ لوگوں کو یہ یقین دلا رہی ہیں کہ "بلیئرڈ کی گیند" والی سخت ریاست کا بتدریج خاتمہ ہو رہا ہے جو 1648ء میں ہونے والے ویسٹ فالیا معاہدے کے وقت سے رائج چلی آ رہی تھی نیز متغیر' پیچیدہ اور کثیر سطحی بین الاقوامی نظام دور وسطیٰ کے نظام سے قریبی مشابہہ ہے۔

بہت زیادہ انتشار

ریاستوں کی کمزوری اور ناکام ریاستوں کے ظہور سے انتشار زدہ دنیا کا چوتھا تصور وجود میں آ رہا ہے۔ یہ تعریف درج ذیل عناصر پر مشتمل ہے: حکومتی اقتدار کا زوال' ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ' قبائلی' نسلی اور مذہبی جھگڑوں میں اضافہ' بین الاقوامی مجرم مافیاؤں کا ظہور' پناہ گزینوں کی تعداد کا لاکھوں میں ہو جانا' نیوکلیائی اور وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کا پھیلاؤ' دہشت گردی میں اضافہ' بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور نسلی صفائی۔ دنیا کی انتشار زدگی کی اس تصویر کو دو نہایت اثر آفریں کتابوں میں دکھایا گیا ہے جو 1993ء میں شائع ہوئی تھیں: پہلی کتاب ہے "آوٹ آف کنٹرول" جو زبگنیف برزنیسکی نے لکھی تھی اور دوسری کتاب ہے "پینڈیموینم" جو ڈینیئل پیٹرک موئن ہان نے لکھی تھی۔

ریاستی تعریف کی طرح انتشار والی تعریف بھی حقیقت کے قریب ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہو رہا ہے یہ اس کی گرافک اور بالکل درست تصویر پیش کرتی ہے نیز ریاستی تعریف کے برعکس یہ عالمی سیاست میں سرد جنگ کے خاتمے سے رونما ہونے والی اہم تبدیلیوں کو بھی نمایاں کرتی ہے مثلاً جیسا کہ 1993ء کے شروع میں دنیا بھر میں 48 جنگیں نسلی بنیادوں پر ہوئیں اور سابق سوویت یونین میں "سرحدوں سے متعلق علاقائی نسلی دعوے اور جھگڑے" موجود ہیں جن میں سے 30 کی نوعیت عسکری ہے۔ تاہم یہ تعریف ریاستی تعریف کی نسبت حقیقت سے اتنی زیادہ قریب ہے کہ غیر حقیقی سی لگتی ہے۔ دنیا میں ممکن ہے

کہ انتشار ہو لیکن اتنا بھی نہیں کہ دنیا میں کوئی نظام ہی نہیں رہا۔ انتشار کا ایک آفاقی اور ہمہ گیر تصور دنیا کو سمجھنے کیلئے چند اشارے مہیا کرتا ہے جو حالات کا نظم اور ان کی قدر بندی' انتشار کے رجحانات کی پیش گوئی' انتشار کی مختلف اقسام اور ان کے ممکنہ اسباب اور نتائج میں فرق و امتیاز اور حکومتی پالیسی سازوں کیلئے رہنما خطوط وضع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

دنیاؤں کا موازنہ: حقیقت پسندی' کفایت اور پیش گوئیاں

مذکورہ چاروں تعریفیں حقیقت پسندی اور کفایت کے مختلف امتزاج کو پیش کرتی ہیں۔ قیاساً انہیں ملحقہ تعریفوں کے ذریعے رد کیا جا سکتا ہے اور مثال کے طور پر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں بیک وقت تفریق اور اتحاد کے عمل جاری ہیں۔ درحقیقت دونوں طرح کے رجحانات موجود ہیں اور سادہ کی نسبت زیادہ پیچیدہ ماڈل حقیقت سے زیادہ قریب تر ہوگا۔ دو بیک وقت مخالف رجحانات یعنی تفریق اور اتحاد کا ماڈل یہ واضح کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ کن حالات کے تحت ایک رجحان غالب ہوگا اور کن کے تحت دوسرا۔ چیلنج یہ درپیش ہے کہ ایک ایسی تعریف وضع کی جائے جو نہایت اہم واقعات و حالات کیلئے موزوں ہو اور یکساں دانشورانہ تجرید کی سطح پر دوسری تعریفوں کی نسبت رجحانات کی بہتر تفہیم میں ممد و معاون ہو۔

مذکورہ چاروں تعریفیں ایک دوسرے سے موافقت نہیں رکھتی ہیں۔ ایک دنیا دو نہیں ہو سکتی ہے یعنی مشرق و مغرب یا شمال و جنوب' نہ ہی قومی ریاستیں بین الاقوامی معاملات میں بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں جبکہ وہ خانہ جنگیوں کے فروغ کی وجہ سے ٹوٹ رہی ہیں اور شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔ دنیا یا تو ایک ہے یا دو یا 184 ریاستیں یا امکاناً ان گنت قبائلی' نسلی گروپوں اور قومیتوں پر مشتمل ہے۔

اگر دنیا کو سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کے تصور کے تحت دیکھا جائے تو بہت سی مذکورہ دشواریوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اس میں دنیا کو ایک یا دو میں تقسیم کر کے حقیقت مسخ نہیں کی جاتی ہے۔ نہ ہی یہ ریاستی اور انتشاری تعریفوں کے مانند حقیقت سے دور جا پڑتی ہے۔ یہ دنیا کا ایک آسانی سے سمجھ میں آ جانے والا فریم ورک فراہم کرتی ہے' بڑھتے ہوئے جھگڑوں میں سے اہم اور غیر اہم کے درمیان تفریق کرتی ہے' مستقبل کے حوالے سے پیش گوئی کرتی ہے

اور پالیسی میکروں کو رہنما خطوط مہیا کرتی ہے۔ یہ ان تعریفوں سے زیادہ موافقت رکھتی ہے جو ایک دوسرے سے موافقت نہیں رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تہذیبی سوچ بتاتی ہے:

☆ دنیا میں اتحاد کی طاقتیں حقیقی ہیں اور بعینہ وہ جو کہ ثقافتی اثبات اور تہذیبی شعور کی جوابی طاقتوں کو پیدا کرتی ہیں۔

☆ دنیا ایک مفہوم میں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن مرکزی تفریق اس طرح سے رونما ہوئی ہے کہ ایک طرف تو مغرب ہے جو کہ غالب تہذیب ہے اور باقی سب دوسرے جو کہ ایک دوسرے سے بہت معمولی اشتراک رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا ایک مغربی وحدت اور غیر مغربی کثرت میں بٹی ہوئی ہے۔

☆ قومی ریاستیں عالمی معاملات میں اہم کردار ہیں اور رہیں گی لیکن ان کے مفادات' اتحاد اور جھگڑے زیادہ تر ثقافتی اور تہذیبی عوامل کے تحت صورت پذیر ہوں گے۔

☆ درحقیقت دنیا انتشار زدہ ہے اور قبائلی اور قومیتی جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے لیکن وہ جھگڑے جو بہت زیادہ خطرے کا باعث ہیں وہ ان ریاستوں یا گروپوں کے مابین ہیں جو کہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

عالمی سیاست کا نیا دور

لہٰذا تہذیبی تعریف بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کو سمجھنے کیلئے ایک بہت ہی سادہ نہیں بلکہ ایک نسبتاً سادہ نقشہ پیش کرتی ہے تاہم کوئی تعریف ہمیشہ کیلئے کارآمد نہیں ہوتی ہے۔ عالمی سیاست کا سرد جنگ کا ماڈل چالیس برس تک کارآمد اور متعلقہ رہا لیکن 1980ء کی دہائی کے اواخر میں بے کار ہوگیا اور کسی مرحلے پر تہذیبی تعریف بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہوگی تاہم موجودہ زمانے میں یہ اہم اور کم اہم معاملات میں تفریق کیلئے کارآمد رہنما ہے۔ مثال کے طور پر 1993ء کی ابتداء میں دنیا میں اڑتالیس نسلی جھگڑوں میں سے نصف مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے مابین ہوئے تھے۔ تہذیبی نظریے ہی کے تحت اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور امریکی وزیر خارجہ ان جھگڑوں کو سلجھانے کیلئے کوشاں ہوئے ہیں جن میں بڑھ کر وسیع جنگوں میں بدل

جانے کا بڑا امکان پوشیدہ ہے۔

تعریفیں پیش گوئیوں کا باعث بنتی ہیں اور کسی تعریف کے مسلمہ اور کارآمد ہونے کا دارومدار اس امر پر بھی ہوتا ہے کہ دوسری تعریفوں کے مقابلے میں اس کی پیش گوئیاں کتنی زیادہ درست نکلیں۔ مثال کے طور پر ایک ریاستی تعریف نے جان میرشائمر کو پیشگوئی کرنے کی راہ دکھائی کہ ''یوکرائن اور روس کے درمیان جو صورتحال موجود ہے وہ ان میں سلامتی کے حوالے سے باہمی تعاون کو توڑ دے گی۔ ایسی بڑی طاقتیں جن کے درمیان طویل اور غیر محفوظ سرحد واقع ہو' جیسا کہ روس اور یوکرائن میں ہے' اکثر سلامتی کے خدشات کے تحت مقابلے بازی پر اتر آتی ہیں' روس اور یوکرائن لازماً اس محرک پر غالب آجائیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی سے رہنا سیکھیں گے لیکن اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ان کیلئے بے سود ہوگا۔'' دوسری طرف ایک تہذیبی سوچ روس اور یوکرائن کے درمیان قریبی' ثقافتی' شخصی اور تاریخی رشتوں پر زور دے گی اور دونوں ملکوں میں روسیوں اور یوکرائینیوں کے باہم میل جول کو نمایاں کرے گی اور اس کے بجائے آرتھوڈوکس مشرقی یوکرائن اور یونی ایٹ مغربی یوکرائن کو الگ الگ کرنے والے تہذیبی تقسیمی خط کو واضح کرے گی جو کہ ریاستوں کے ''حقیقت پسندانہ'' تصور کے تحت متحد اور اپنی شناخت آپ والی اکائیوں کے تناظر میں طویل مدت سے ایک تاریخی حقیقت چلی آرہی ہے۔ میرشائمر اس کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیتا ہے۔ جہاں ایک ریاستی تعریف روس یوکرائن جنگ کے امکان کو نمایاں کرتی ہے وہاں ایک تہذیبی سوچ اس امکان کو گھٹاتی ہے اور اس کے بجائے یوکرائن کے دو حصوں میں منقسم ہونے کے امکان کو نمایاں کرتی ہے' جو ثقافتی عوامل کی بنیاد پر کسی شخص کو چیکوسلواکیہ سے زیادہ متشددانہ مگر یوگوسلاویہ کے مقابلے میں کم متشددانہ علیحدگی کی پیشگوئی کی راہ کشادہ کرتی ہے۔ یہ متضاد پیش گوئیاں متضاد پالیسی ترجیحات کو ابھارتی ہیں۔

میرشائمر کی ممکنہ جنگ اور یوکرائن پر روسی حملے کی ریاستی پیش گوئی اس کو نیوکلیائی ہتھیار رکھنے کے حوالے سے یوکرائن کی حمایت کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک تہذیبی سوچ روس اور یوکرائن کے درمیان تعاون کو بڑھاوا دیتی ہے' یوکرائن پر اپنے نیوکلیائی ہتھیاروں

سے دست برداری کیلئے زور دیتی ہے'یوکرائن کے اتحاد اور آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے ٹھوس معاشی امداد اور دوسرے اقدامات کو فروغ دیتی ہے اور یوکرائن کی ممکنہ تقسیم کیلئے ہنگامی منصوبہ بندی کی پشت پناہی کرتی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بہت سے ایسے واقعات ہیں جو تہذیبی تعریف سے موافقت رکھتے ہیں جن کی اس کے ذریعے پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ ان میں شامل ہیں سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کا ٹوٹنا' ان کے سابقہ علاقوں میں جاری جنگیں' دنیا بھر میں مذہبی بنیاد پرستی کا ابھار' تشخص کے حوالے سے روس' ترکی اور میکسیکو کے اندر ہونے والی کوششیں' امریکہ اور جاپان کے مابین تجارت کے حوالے سے جھگڑے میں شدت' اسلامی ریاستوں کی طرف سے عراق اور لیبیا پر مغربی دباؤ کی مزاحمت' اسلامی اور کنفیوشسی ریاستوں کی نیوکلیائی ہتھیار اور ان کو پھینکنے کے وسائل کے حصول کی کوششیں' چین کا بطور ''اجنبی'' عظیم طاقت کے فروغ پاتا ہوا کردار' کچھ ملکوں میں نئی جمہوری حکومتوں کا استحکام اور بعض دوسرے ملکوں میں ان کا نہ ہونا' نیز مشرقی ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ میں اضافہ۔

ابھرتی ہوئی دنیا سے تہذیبی تعریف کے متعلق ہونے کو ان واقعات کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے جو اس تعریف پر پورا اترتے ہیں یہ واقعات 1993ء کے پہلے چھ ماہ میں رونما ہوئے:۔

☆ سابقہ یوگوسلاویہ میں کروٹوں' مسلموں اور سربوں کے درمیان لڑائی کا تسلسل اور شدت۔

☆ مغرب کا بوسنیائی مسلموں کی بامعنی امداد کرنے میں ناکام ہونا یا سربوں کے مظالم کی مذمت کے مانند کروٹوں کے مظالم کی مذمت میں ناکامی۔

☆ کروشیا میں سربوں کو کروٹ حکومت کے ساتھ صلح کے حوالے سے اقوام متحدہ سلامتی کونسل کے دوسرے ارکان کا ساتھ دینے میں روس کی نارضامندی نیز ایران اور دوسری مسلم قوموں کی طرف سے بوسنیائی مسلموں کی حفاظت کیلئے 18000 فوجیوں کی فراہمی کی پیشکش۔

☆ آرمینیائیوں اور آذریوں کے درمیان جنگ میں شدت' ترکوں اور ایرانیوں کا مطالبہ کہ آرمینیائی اپنی مہمات ترک کر دیں۔ ترک فوجی دستوں کا آذربائیجانی سرحدوں پر صف بندی کرنا اور ایرانی فوجوں کا آذربائیجانی سرحد کو پار کر جانا اور روس کا انتباہ کہ ایران کا یہ اقدام ''جھگڑے کو بڑھائے گا'' اور ''اس کو بین الاقوامیت کی خطرناک حدود میں لے جائے گا۔''

☆ وسطی ایشیا میں روسی فوجوں اور ''مجاہدین'' گوریلاؤں میں جاری لڑائی۔

☆ ویانا میں ہونے والی انسانی حقوق کی کانفرنس کے موقع پر امریکی وزیر خارجہ کی سربراہی میں ''ثقافتی نسبتیت'' کو مسترد کرنے والے مغرب اور ''مغربی آفاقیت'' کو مسترد کرنے والی اسلامی اور کنفیوشسی ریاستوں کے اتحاد کے مابین کشمکش۔

☆ روس اور ناٹو کے فوجی منصوبہ سازوں میں ''شمال سے خطرے'' کی بنیاد پر ایک ہی انداز میں دوبارہ توجہ مرکوز کرنا۔

☆ بظاہر تہذیبی خطوط پر ہونے والی ووٹنگ جس نے بیجنگ کی جگہ سڈنی کو اولمپکس 2000ء کیلئے منظور کروا دیا۔

☆ چین کا پاکستان کو میزائل کے اجزاء فروخت کرنا' اس کے نتیجے میں چین پر امریکی پابندیوں کا نفاذ نیز چین اور امریکہ میں ایران کو مبینہ طور پر نیوکلیائی ٹیکنالوجی کی فراہمی پر کشمکش۔

☆ امریکہ کے پرزور احتجاج کے باوجود چین کا پابندیوں کو توڑتے ہوئے نیوکلیائی ہتھیار کی آزمائش کرنا نیز شمالی کوریا کا اس کے نیوکلیائی ہتھیاروں کے پروگرام کے حوالے سے ہونے والے مذاکرات میں مزید شمولیت سے انکار۔

☆ اس امر کا انکشاف کہ امریکی دفتر خارجہ ایران اور عرق کے حوالے سے ''دوہری تحدید'' کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔

☆ امریکی وزارت دفاع کی طرف سے دو ''بڑے علاقائی جھگڑوں'' کے حوالے سے نئی سٹریٹجی کا اعلان' جن میں سے ایک شمالی کوریا اور دوسرا ایران' عراق کے خلاف ہوگا۔

☆ ایرانی صدر کا چین اور ہندوستان سے اتحادوں کیلئے آواز بلند کرنا تاکہ ''ہم بین الاقوامی واقعات پر حرف آخر کہہ سکیں۔''

☆ نئی جرمن قانون سازی جس کے تحت پناہ گزینوں کے داخلے پر سخت پابندیاں لگا دی جائیں گی۔

☆ بحر اسود کے بیڑے کی تقسیم اور دوسرے مسائل کے حوالے سے روسی صدر بورس یلسن اور یوکرائنی صدر لیونائیڈ کراوچک کے مابین سمجھوتہ۔

☆ امریکہ کی طرف سے بغداد پر بمباری' اس کی مغربی حکومتوں کی طرف سے متفقہ حمایت نیز اس کی قریباً تمام مسلم حکومتوں کی طرف سے مذمت کہ یہ مغرب کے ''دہرے معیارات'' کی ایک اور مثال ہے۔

☆ امریکہ کا سوڈان کو دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرنا اور مصری شیخ عمر عبدالرحمٰن اور اس کے پیروکاروں کو ''امریکہ کے خلاف شہری دہشت گردی کی جنگ'' کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتاری۔

☆ آخرکار ناٹو میں پولینڈ' ہنگری' چیک ری پبلک اور سلوویکیا کی رکنیت کے بھرپور امکانات۔

☆ 1993ء میں ہونے والے روسی انتخابات جنہوں نے واضح کر دیا ہے کہ روس اس حوالے سے ایک ''کٹا ہوا ملک'' ہے کہ مغرب کو چیلنج کیا جائے یا اس سے دوستی کی جائے۔

تہذیبی تعریف کی موزونیت 1990ء کی دہائی کے آغاز سے کسی بھی چھ ماہ کے دوران رونما ہونے والے واقعات کی تقابلی فہرست بنا کر مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

سرد جنگ کے ابتدائی برسوں میں کینیڈین سیاستدان لیسٹر پیٹرسن نے نشاندہی کی تھی کہ غیر مغربی معاشروں میں ابھار اور احیاء رونما ہونے والا ہے۔ اس نے تنبیہ کی کہ ''یہ تصور کرنا بالکل لایعنی ہوگا کہ یہ نئے سیاسی معاشرے جو مشرق میں وجود میں آنے کو ہیں وہ ان معاشروں میں شامل ہوں گے جن سے کہ مغرب مانوس ہے۔ ان قدیم تہذیبوں کا احیاء نئی صورتیں اختیار کرے گا۔'' اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہ بین الاقوامی تعلقات

''صدیوں تک''یورپی ریاستوں کے درمیان تعلقات رہے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ''بہت زیادہ دوررس مسائل کسی واحد تہذیب کے اندر قوموں کے مابین نہیں بلکہ بذات خود تہذیبوں کے ہی درمیان رونما ہوں گے۔'' سرد جنگ کی طویل دو قطبیتی نے ان پیش رفتوں کے رونما ہونے میں دیر کروادی جن کو پیٹرسن نے وجود میں آتا ہوا دیکھا تھا۔سرد جنگ کے اختتام نے ثقافتی اور تہذیبی قوتوں کو آزاد کر دیا ہے جن کو اس نے 1950ء کی دہائی میں ہی شناخت کر لیا تھا اور عالموں اور مبصروں کی ایک بڑی تعداد اب عالمی (گلوبل) سیاست میں ان عوام کے نئے کردار کو تسلیم اور واضح کر رہی ہے۔

☆☆☆

باب 2

تہذیبیں: تاریخ اور زمانۂ حال میں

تہذیبوں کی ساخت

انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ انسانیت کے ارتقا کو کسی دوسرے تناظر میں سوچنا بھی ناممکن ہے۔ تہذیبوں کی کہانی نسلوں پر محیط ہے جو قدیم سومیری اور مصری تہذیب سے شروع ہو کر کلاسیکی اور میسوامریکی اور عیسائی اور اسلامی تہذیبوں تک آتی ہے نیز چینی اور ہندو تہذیبوں کے متواتر ظہور سے ساری تاریخ کے دوران میں تہذیبیں ہی لوگوں کو وسیع ترین شناخت عطا کرتی آئی ہیں۔ نتیجتاً تہذیبوں کے اسباب' ظہور' عروج' تعامل' کارناموں' زوال اور بربادی کو ممتاز تاریخ دانوں' عمرانیات دانوں اور بشریات دانوں نے دریافت کیا ہے جن میں دوسروں کے علاوہ میکس ویبر' ایمائیل ڈرخائیم' اوسوالڈ سپنگلر' پٹیریم سوروکن' آرنلڈ ٹائن بی' الفرڈ ویبر' اے ایل کروبر' فلپ بیگبی' کیرول کیگلے' رشٹن کولبرن' کرسٹوفر ڈاسن' ایس این آئزن سٹیڈ' فرنینڈ براڈل' ولیم ایچ میک نیل' ایڈا بوزمین' امانوئیل ویلر سٹائن اور فیلپ فرنینڈیز ارمیسٹو شامل ہیں۔ ان اور دیگر مصنفین نے تہذیبوں کے تقابلی تجزیے پر مشتمل بہت سا عالمانہ اور پروقار ادب تخلیق کیا ہوا ہے۔ اس ادب پر نقطۂ نظر' طریقۂ کار' اہمیت اور تصورات کے حوالے سے فرق حاوی ہیں۔ تاہم تہذیبوں کی ساخت' شناخت اور حرکیات کے مرکزی موضوع کے حوالے سے سب میں اشتراک موجود ہے۔

اول: واحد کے صیغے میں اصطلاح ''تہذیب'' اور اصطلاح ''تہذیبیں'' میں فرق ہے۔ ''تہذیب'' کا نظریہ اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی فلسفیوں نے ''بربریت'' کے برعکس اختراع کیا تھا۔ تہذیب یافتہ معاشرہ ابتدائی (قدیم) معاشرے سے یوں مختلف ہے کہ یہ منضبط' شہری اور تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ تہذیب یافتہ ہونا اچھا ہونا تھا اور غیر تہذیب یافتہ ہونا برا ہونا تھا۔ تہذیب کے تصور نے ایک معیار' ایک کسوٹی مہیا کر دی جس کے ذریعے معاشروں کے متعلق فیصلہ کیا جا سکتا تھا اور انیسویں صدی کے دوران میں یورپیوں نے ایسا پیمانہ (کرائٹیریا) وضع کرنے کیلئے بہت سی دانشورانہ' سفارتی اور سیاسی توانائی وقف کر دی جس کے ذریعے غیر یورپی معاشروں کے متعلق فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ''تہذیب یافتہ'' ہیں نیز فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ انہیں یورپی غلبے والے بین الاقوامی نظام میں شامل کیا جانا ہے تاہم اسی اثناء میں لوگ جمع کے صیغے میں اصطلاح ''تہذیبیں'' استعمال کرتے رہے۔ اس کا مطلب تھا ''کسی تہذیب کی ایک تصور بلکہ ایک خاص تصور کے طور پر تعریف متعین کرنے سے دست برداری'' اور اس مفروضے سے دوری کہ تہذیب یافتہ ہونے کا بس ایک ہی معیار ہے اور وہ براڈل کے الفاظ میں ''انسانی اشرافیہ'' تک محدود ہے' چند مراعات یافتہ لوگ یا گروپ۔ اس کے بجائے بہت سی تہذیبیں موجود تھیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے انداز میں تہذیب یافتہ تھی۔ مختصر یہ کہ واحد کے صیغے میں ''تہذیب'' نے اپنی کچھ مہریں گنوا دیں اور جمع کے صیغے میں ایک تہذیب درحقیقت واحد کے صیغے میں بالکل غیر تہذیب یافتہ ہو سکتی ہے۔

تہذیبیں جمع کے صیغے میں اس کتاب کا موضوع ہیں۔ تاہم واحد اور جمع میں فرق اضافی ہے اور واحد کے صیغے میں تہذیب کا نظریہ یوں دوبارہ ابھرتا ہے کہ ایک آفاقی عالمی تہذیب موجود ہے۔ یہ دلیل دیرپا نہیں ہو سکتی ہے لیکن یہ اس سوال کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے جیسا کہ اس کتاب کے آخری باب میں کیا جائے گا آیا تہذیبیں زیادہ تہذیب یافتہ ہو رہی ہیں یا نہیں۔

دوم: جرمنی سے باہر ایک تہذیب ایک ثقافتی اکائی ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں جرمن فلسفیوں نے تہذیب جو کہ میکانیات' ٹیکنالوجی اور مادی قوتوں پر مشتمل ہوتی ہے اور

ثقافت جو کہ ایک معاشرے کی اقدار' آدرشوں اور اعلیٰ تر دانش ورانہ فنی و اخلاقی صفات پر مشتمل ہوتی ہے' دونوں میں واضح فرق بیان کیا تھا۔ یہ تفریق جرمن فکر میں تو موجود رہی ہے لیکن کہیں اور قبول نہیں کی گئی۔ کچھ ماہرین بشریات نے تو اس تعلق کو الٹ دیا اور انہوں نے تصور پیش کیا کہ ثقافت قدیم' جامد' غیر شہری معاشروں کی خاصیت ہوتی ہے جبکہ پیچیدہ' ترقی یافتہ شہری اور متحرک معاشرے ''تہذیبیں'' ہوتے ہیں۔ تاہم ثقافت اور تہذیب میں امتیاز کرنے کی یہ کوششیں بارآور نہیں ہوئیں اور جرمنی سے باہر براڈل کے ساتھ بھرپور اتفاق رائے موجود ہے کہ یہ جرمن انداز میں توہمانہ خواہش ہے کہ ''ثقافت'' کو اس کی بنیاد ''تہذیب'' سے الگ کیا جائے۔

تہذیب اور ثقافت دونوں لوگوں کے مجموعی طرز حیات کو بیان کرتے ہیں اور ایک تہذیب وسیع تناظر میں ثقافت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں ''اقدار' معیارات' ادارے اور سوچ کی قسمیں شامل ہوتی ہیں جس کو کسی معاشرے میں نسلیں متواتر اولین اہمیت دیتی ہیں۔'' براڈل کے نزدیک ایک تہذیب ''ایک خالی جگہ'' ایک ''ثقافتی علاقہ'' ہوتی ہے ''ثقافتی خصوصیات اور مظہر کا مجموعہ'' ہوتی ہے۔ ویلر سٹائن اس کی یوں تعریف بیان کرتا ہے ''تہذیب دنیا کے متعلق نقطۂ نظر' رسم و رواج' ساختوں اور ثقافت (مادی ثقافت اور اعلیٰ ثقافت دونوں) کا ایک خصوصی سلسلۂ علت و معمول ہوتی ہے جو ایک قسم کا تاریخی کل وضع کرتا ہے اور جو اس مظہر کی دیگر خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ وجود پذیر ہوتا ہے۔'' ڈاسن کے مطابق ایک تہذیب ''کسی مخصوص اصلی' ثقافتی تخلیقی عمل کی پیداوار ہوتی ہے جو کہ مخصوص لوگوں کا فعل ہوتا ہے۔'' جبکہ ڈرخائیم اور ماز کے نزدیک ''مخصوص تعداد کی قوموں پر مشتمل ایک اخلاقی ماحول کی ایک قسم جس میں ہر قومی ثقافت کل کی صرف ایک خصوصی صورت ہوتی ہے۔'' سپنگلر کے نزدیک تہذیب ثقافت کی ناگزیر منزل ہوتی ہے۔...... ترقی یافتہ نوع انسان جس کی اہلیت رکھتی ہے وہ انتہائی خارجی اور مصنوعی حالتیں ...... ایک نتیجہ' وجود پذیر ہوتی ہوئی چیز سے متصل وجود پذیر ہو چکی چیز۔'' تہذیب کی ہر تعریف میں ثقافت موجود ہے۔

تہذیب کی تعریف متعین کرنے والے کلیدی ثقافتی عناصر وہ ہیں جنہیں ایتھنزیوں

نے کلاسیکی شکل میں وضع کیا تھا۔

خون، زبان، مذہب، طرز حیات ایسی چیزیں تھیں جو یونانیوں میں مشترک تھیں اور جو انہیں فارسیوں اور دوسرے غیر یونانیوں سے ممتاز کرتی تھیں۔ تاہم تہذیبوں کی تعریف متعین کرنے والے سارے معروضی عناصر میں عموماً سب سے زیادہ اہم مذہب رہا ہے جیسا کہ ایتھنزی زور دیتے تھے۔ بہت بڑے درجے پر انسانی تاریخ کی بڑی تہذیبیں دنیا کے عظیم ترین مذاہب سے موافق رہی ہیں اور وہ لوگ جو نسل اور زبان کے حوالے سے تو ایک ہوں لیکن مذہب کے حوالے سے مختلف ہوں وہ ایک دوسرے کو ذبح کر سکتے ہیں جیسا کہ لبنان، سابق یوگوسلاویہ اور برصغیر میں واقع ہوا ہے۔

لوگوں میں نسل کے حوالے سے تفریق اور تہذیب کے حوالے سے تفریق میں مماثلت پائی جاتی ہے تاہم نسل اور تہذیب یکساں نہیں ہیں۔ ایک ہی نسل کے لوگ تہذیب کے تحت ایک دوسرے سے گہرائی تک الگ ہو سکتے ہیں اور مختلف نسلوں کے لوگوں کو ایک تہذیب متحد کر سکتی ہے۔ خصوصاً عظیم تبلیغی مذاہب عیسائیت اور اسلام مختلف نسلوں پر مشتمل معاشروں کو محیط ہیں۔ انسانی گروپوں میں اہم امتیازات کا تعلق ان کی اقدار، عقائد، اداروں اور سماجی ساختوں سے ہوتا ہے، ان کی جسمانی ساخت، سروں کی بناوٹ اور جلد کے رنگوں سے نہیں۔

سوم: تہذیبیں جامع ہوتی ہیں تاہم ان کی کوئی بھی تشکیلی اکائی محیط تہذیب کے حوالے کے بغیر سمجھی نہیں جا سکتی ہے۔ ٹائن بی کہتا ہے تہذیبیں "دوسروں کے سمجھے بغیر سمجھی سمجھائی ہوتی ہیں۔" ایک تہذیب ایک "کلیت" ہوتی ہے۔

ایک تہذیب ایک وسیع ترین ثقافتی اکائی ہوتی ہے۔ بستیاں، علاقے، نسلی گروپ، قومیتیں، مذہبی گروپ سب کے سب ثقافتی یکسانیت کے کسی نہ کسی درجے پر مختلف ثقافت کے حامل ہوتے ہیں۔ جنوبی اٹلی کی کسی بستی کی ثقافت ہوسکتا ہے شمالی اٹلی میں واقع بستی کی ثقافت سے جدا ہو لیکن دونوں ایک مشترکہ اطالوی ثقافت کے حامل ہوتے ہیں جو انہیں جرمن بستیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یورپی برادریاں ایسے ثقافتی اوصاف کی حامل ہیں جو ان

کو چینی یا ہندو برادریوں سے ممتاز کرتی ہے تاہم چینی' ہندو اور مغربی کسی وسیع تر ثقافتی اکائی کا حصہ نہیں ہیں۔ وہ تہذیبیں تشکیل دیتے ہیں۔ لہٰذا ایک تہذیب لوگوں کی اعلیٰ ترین ثقافتی گروپ بندی ہوتی ہے اور ثقافتی تشخص کی وسیع تر سطح جو انسانوں کو دوسری انواع سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی تعریف ہر دو حوالوں سے ہو سکتی ہے' مشترک معروضی عناصر مثلاً زبان' تاریخ' مذہب' رسم و رواج' اداروں نیز لوگوں کی موضوعی خود شناختی کے ذریعے۔

تہذیبیں سب سے بڑا ''ہم'' ہوتی ہیں جس کے اندر ہم خود کو دوسرے تمام ''وہ'' سے ممتاز کر کے سکون محسوس کرتے ہیں۔ تہذیبیں بہت زیادہ لوگوں پر بھی مشتمل ہو سکتی ہیں جیسا کہ چینی تہذیب اور بہت کم لوگوں پر بھی مشتمل ہو سکتی ہیں جیسے کے اینگلوفون کیریبیئن۔ اس کتاب کا موضوع وہ تہذیبیں ہیں جنہیں انسانی تاریخ میں عمومی طور پر بڑی تہذیبیں کہا گیا ہے۔

تہذیبوں کی واضح سرحدیں نہیں ہوتی ہیں نیز ان کا نہ کوئی آغاز ہوتا ہے اور نہ انجام۔ لوگ اپنے تشخص کا دوبارہ تعین کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وقت کے ساتھ ساتھ تہذیبوں کی ترکیب اور ساخت بدلتی رہی ہیں۔ بدیں وجہ تہذیبیں بامعنی اکائیاں ہوتی ہیں اور گو کہ ان کے درمیان خطوط واضح ہو سکتے ہیں تاہم وہ حقیقی ہوتی ہیں۔

چہارم: تہذیبیں فانی ہوتی ہیں لیکن طویل زندگی بھی پاتی ہیں۔ ان کا ''منفرد اور خصوصی جوہر ان کا طویل تاریخی تسلسل ہوتا ہے۔ تہذیب درحقیقت سب سے لمبی کہانی ہوتی ہے۔'' شہنشاہیاں عروج اور زوال پاتی ہیں' حکومتی آتی اور جاتی ہیں' تہذیبیں باقی رہتی ہیں اور ''سیاسی' سماجی' معاشی حتیٰ کہ نظریاتی نشیب و فراز سے بھی بچ نکلتی ہیں۔'' حقیقت میں بیسویں صدی میں دنیا میں موجود سب بڑی تہذیبیں یا تو ہزار برس سے موجود چلی آ رہی ہیں یا لاطینی امریکہ کی طرح کسی دوسری طویل مدت سے موجود تہذیب کی فوری پیداوار ہیں۔

جہاں تہذیبیں زندہ رہتی ہیں وہاں فنا بھی ہو جاتی ہیں۔ وہ متحرک ہوتی ہیں' وہ عروج اور زوال پاتی ہیں' وہ جذب ہوتی ہے اور ٹوٹتی ہیں اور جیسا کہ تاریخ کا ہر طالبعلم جانتا ہے وہ معدوم بھی ہوتی ہیں اور وقت کی ریت میں دفن ہو جاتی ہیں۔ ان کے ارتقا کے مراحل کو مختلف طریقوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ کیگلے تہذیبوں کو سات مراحل سے گزرتا دیکھتا

ہے۔ امتزاج' پھیلاؤ' کشمکش کا دور' آفاقی سلطنت' زوال اور خارجی یلغار۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ تہذیب کسی چیلنج کا جواب دینے کیلئے ظہور میں آتی ہے' پھر خوشحالی کے دور سے گزرتی ہے' پھر مشکلات کا دور آتا ہے' پھر آفاقی حالت ابھرتی ہے اور پھر انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ان نظریوں میں فرق موجود ہیں تاہم وہ سب تہذیبوں کو مصیبتوں میں سے وجود میں آتا ہوا پھر آفاقی حالت' پھر زوال اور پھر انتشار کے مراحل سے گزرتا دیکھتے ہیں۔

پنجم: تہذیبیں سیاسی نہیں ثقافتی اکائیاں ہوتی ہیں۔ وہ نہ تو نظم وضبط قائم کرتی ہیں' انصاف کا بندوبست کرتی ہیں' ٹیکس جمع کرتی ہیں' جنگیں لڑتی ہیں' معاہدوں کیلئے مذاکرات کرتی ہیں نہ ہی وہ کچھ جو حکومتیں کرتی ہیں۔ تہذیبوں کے درمیان سیاسی ترکیب مختلف ہوتی ہے اور ایک ہی تہذیب کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے ایک تہذیب ایک یا بہت سی سیاسی اکائیوں پر مشتمل ہو۔ یہ اکائیاں شہری ریاستیں' سلطنتیں' فیڈریشنیں' کنفیڈریشنیں' قومی ریاستیں' کثیر قومی ریاستیں ہو سکتی ہیں جو سب کی سب حکومت کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسے ہی ایک تہذیب پیدا ہوتی ہے اس کی سیاسی اکائیوں کی تعداد اور ساخت میں معمول کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ایک انتہا پر ایک تہذیب اور ایک سیاسی اکائی ایک ساتھ وجود پذیر ہو سکتی ہیں۔ لوسیان پائی کہتا ہے کہ چین ''ایک تہذیب ہے جو ایک ریاست بننے کی جستجو کر رہا ہے۔'' جاپان ایک تہذیب ہے اور ایک ریاست بھی۔ تاہم اکثر تہذیبیں ایک سے زیادہ ریاستوں کی حامل ہوتی ہیں۔ جدید دنیا میں اکثر تہذیبیں دو یا دو سے زیادہ ریاستوں کی حامل ہیں۔

آخری: علماء تاریخ میں اور دور حاضر کی دنیا میں بڑی تہذیبوں کی شناخت کے حوالے سے عمومی طور پر متفق ہیں۔ تاہم وہ اکثر تاریخ میں موجود رہنے والی تہذیبوں کی تعداد کے حوالے سے اختلاف کرتے ہیں۔ کیگلے سولہ واضح تاریخی مثالوں کا ذکر کرتا ہے جن میں بہت مشکل سے آٹھ مزید کا اضافہ کرتا ہے۔ ٹائن بی پہلے تو تعداد اکیس قرار دیتا ہے پھر تیئیس' سپنگلر آٹھ بڑی تہذیبوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ میک نیل ساری تاریخ میں 9 تہذیبوں پر بحث کرتا ہے۔ بیگبی بھی نو تہذیبیں ہی دیکھتا ہے تاہم جاپان اور آرتھوڈوکسی کو ملا

کر گیارہ جو کہ چین اور مغرب سے ممتاز ہیں۔ براڈل نو کو شناخت کرتا ہے اور روسٹووانی سات معاصر تہذیبوں کو۔ یہ فرق کسی حد تک اس بات پر منحصر ہیں آیا ثقافتی گروپ جیسے کہ چینی اور انڈین یہ سوچتے ہیں کہ وہ کل تاریخ کے دوران میں ایک یا دو یا زیادہ قریبی تعلق رکھنے والی تہذیبوں کے حامل رہ چکے ہیں' جس میں سے ایک دوسری کی پیداوار تھی۔ اختلافات کے باوجود بڑی تہذیبوں کی شناخت بلا مقابلہ ہوتی ہے۔

بڑی معاصر تہذیبیں درج ذیل ہیں:

چینی تہذیب

تمام علماء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کم از کم 1500 عیسوی سے ممتاز چینی تہذیب وجود رکھتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس سے ہزار برس پہلے سے موجود ہو' یا دو چینی تہذیبیں وجود رکھتی ہوں اور ایک نے عیسوی عہد کی ابتدائی صدیوں میں دوسری کی جگہ لی ہو۔ اپنے ''فارن افیئر ز'' والے مضمون میں میں نے اس کو ''کنفیوشسی تہذیب'' کا نام دیا تھا تاہم اس کیلئے ''چینی تہذیب'' کا نام استعمال کرنا زیادہ موزوں ہے گو کہ کنفیوشس ازم چینی تہذیب کا اہم جزو ہے تاہم چینی تہذیب کنفیوشس ازم سے سوا ایک سیاسی اکائی کے طور پر چین میں رائج ہے۔ اصطلاح ''چینی'' جس کو کہ بہت سے علماء استعمال کرتے آئے ہیں نہایت مناسب و موزوں انداز میں اس مشترکہ ثقافت کو بیان کرتی ہے جو چین اور جنوب مشرقی ایشیا کی چینی برادریوں میں اور چین کے باہر کئی متعلقہ ثقافتوں کے حامل مقامات میں رائج ہے مثلاً ویتنام اور کوریا پر چھائی ہوئی ہے۔

جاپانی تہذیب

کچھ علماء جاپانی اور چینی ثقافتوں کو واحد مشرق بعید کی تہذیب کے عنوان تلے یکجا کر دیتے ہیں تاہم اکثر علماء ایسا نہیں کرتے ہیں بلکہ جاپان کو ایک ممتاز تہذیب کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جو کہ چینی تہذیب کی پیداوار ہے جو کہ 100 عیسوی سے 400 عیسوی کے عرصے کے دوران میں ظہور میں آئی تھی۔

ہندو تہذیب

یہ بات آفاقی طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ برصغیر میں کم از کم 1500 عیسوی سے ایک یا زیادہ تہذیبیں متواتر موجود چلی آ رہی ہیں۔ انہیں عموماً انڈین' انڈک (Indic) یا ہندو کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے آخری نام کو موجودہ تہذیب کیلئے ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسری ہزاری قبل مسیح سے ہندومت کسی نہ کسی شکل میں برصغیر کی ثقافت میں مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ ''مذہب یا معاشرتی نظام سے کہیں زیادہ یہ تو انڈین تہذیب کی روح ہے۔'' یہ دور جدید میں بھی اپنے اس کردار کو برقرار رکھے ہوئے ہے حالانکہ بذات خود ہندوستان میں دیگر ثقافتی اقلیتوں کی طرح ایک بھرپور مسلم برادری موجود ہے۔ ''چینی'' کی طرح اصطلاح ''ہندو'' تہذیب کے نام کو اس کی مرکزی ریاست کے نام سے ممتاز کرتی ہے۔ اس اصطلاح کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب تہذیب کی ثقافت ریاست سے باہر بھی توسیع کر جاتی ہے۔

اسلامی تہذیب

تمام اہم علماء اس امر پر متفق ہیں کہ ایک ممتاز اسلامی تہذیب وجود رکھتی ہے۔ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے عرب میں رونما ہو کر تیزی کے ساتھ شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے آئبیریا میں پھیل گیا اور وسطی ایشیا' برصغیر اور جنوب مشرقی ایشیا تک وسعت پا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سی ممتاز ثقافتیں یا ذیلی تہذیبیں اسلام کے اندر وجود رکھتی ہیں جس میں عرب' ترک' فارسی اور ملائی شامل ہیں۔

آرتھوڈوکس تہذیب

بہت سے علماء ایک علیحدہ آرتھوڈوکس تہذیب کو متمیز کرتے ہیں جس کا مرکز روس میں ہے اور جو بازنطینی سلسلۂ نسب' ممتاز مذہب' 200 برس کی تاتار حکمرانی' بیوروکریٹک اقربا پروری' نشاۃ ثانیہ' ریفارمیشن (اصلاح)' روشن خیالی اور دوسرے مرکزی مغربی تجربوں سے

محدود استفادے کے نتیجے میں مغربی عیسائیت سے علیحدہ ہے۔

مغربی تہذیب

مغربی تہذیب کے بارے میں عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ 700 عیسوی یا 800 عیسوی کے لگ بھگ ظہور میں آئی تھی۔ علماء کا عمومی طور پر خیال یہ ہے کہ اس کے تین اہم جزو ہیں یورپ' شمالی امریکہ اور لاطینی امریکہ۔

لاطینی امریکی تہذیب

تاہم لاطینی امریکہ ایک مختلف تشخص کا حامل ہے جو کہ اس کو مغرب سے ممتاز کرتا ہے۔ گو کہ یورپی تہذیب کی پیداوار ہے تاہم لاطینی امریکہ نے یورپ اور شمالی امریکہ سے ہر ہر حوالے سے جدا راستے وضع کئے ہیں۔ اس کی ثقافت اجتماعی اور آمرانہ نوعیت کی ہے جس کا یورپ تو کسی حد تک حامل ہے لیکن جو کہ شمالی امریکہ میں موجود نہیں ہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ دونوں نے اصلاح (ریفارمیشن) کے اثرات کو محسوس کیا ہے اور انہوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ثقافتوں کو باہم ملا لیا ہوا ہے۔ تاریخی طور پر لاطینی امریکہ صرف کیتھولک رہا ہے اگر چہ یہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ لاطینی امریکی تہذیب میں مقامی ثقافتیں بھی شامل ہیں جو کہ یورپ میں تو وجود ہی نہیں رکھتیں اور یہ ثقافتیں ایک طرف تو میکسیکو' وسطی امریکہ' پیرو اور بولیویا میں اور دوسری طرف ارجنٹائن اور چلی میں مختلف ہیں۔ لاطینی امریکی سیاسی ارتقاء اور معاشی ترقی نارتھ اٹلانٹک ملکوں میں رائج نمونوں سے بالکل مختلف ہے۔ داخلی طور پر لاطینی امریکہ خود بھی اپنی اپنی شخصی شناختوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں ''ہاں' ہم مغرب کا حصہ ہیں'' دوسرے دعویٰ کرتے ہیں ''نہیں ہم اپنی منفرد ثقافت کے حامل ہیں۔'' اور بڑی مقدار میں لاطینی اور شمالی امریکی ادب اپنے اپنے ثقافتی اختلافات واضح کرتا ہے۔ لاطینی امریکہ کو یا تو مغربی تہذیب کے اندر ایک ذیلی تہذیب قرار دیا جا سکتا ہے یا مغرب سے قریبی ربط رکھنے والی جدا تہذیب مانا جا سکتا ہے۔

مغرب میں شامل ہیں یورپ' شمالی امریکہ اور دیگر یورپین آباد کار ممالک مثلاً آسٹریلیا

اور نیوزی لینڈ۔ تاہم مغرب کے دو اہم اجزاء کے درمیان تعلق وقت کے ساتھ ساتھ بدلا ہے۔ امریکی اپنی تاریخ کے بیشتر عرصہ کے دوران میں خود کو یورپ سے مختلف (الٹ) قرار دلواتے رہے ہیں۔ امریکہ آزادی' مساوات' موقع اور مستقبل کی سرزمین تھا جبکہ یورپ ترجمانی کرتا تھا جبر و تسلط' طبقاتی کشمکش' اجارہ داری' پسماندگی کی۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ امریکہ ایک علیحدہ تہذیب ہے۔ امریکہ اور یورپ کے درمیان یہ تضاد قابل لحاظ حد تک اس حقیقت کا نتیجہ تھا کہ کم از کم انیسویں صدی کے آخر تک امریکہ غیر مغربی تہذیبوں کے ساتھ محض محدود روابط رکھتا تھا' تاہم جب ایک دفعہ امریکہ عالمی منظر میں نمودار ہو گیا تو یورپ کے ساتھ وسیع تشخص کا تصور بھی وجود پذیر ہو گیا۔ جہاں انیسویں صدی کا امریکہ خود کو یورپ سے مختلف اور الٹ قرار دلواتا تھا وہاں بیسویں صدی میں امریکہ نے خود کو وسیع اکائی ''مغرب'' بشمول یورپ کا ایک جزو اور درحقیقت اس کا لیڈر قرار دلوایا۔

اصطلاح ''مغرب'' (THE WEST) اب آفاقی طور پر اس تصور کی جگہ استعمال ہوتی ہے جو کہ اصطلاح ''مغربی عیسائیت'' کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ''مغرب'' وہ واحد تہذیب ہے جو کہ ''قطب نما کی سمت'' کے ذریعے شناخت ہوتی ہے نہ کہ کسی مخصوص مذہب' جغرافیائی علاقے یا لوگوں کے نام کے ذریعے۔ یہ شناخت اس تہذیب کو تاریخی' جغرافیائی اور ثقافتی تناظر سے بالاتر کر دیتی ہے۔ تاریخی حوالے سے مغربی تہذیب یورپی تہذیب ہے۔ جدید عہد میں مغربی تہذیب یورپی امریکی (یورو امریکن) تہذیب ہے یا نارتھ اٹلانٹک تہذیب ہے۔ یورپ' امریکہ اور شمالی اٹلانٹک کو کسی نقشے پر دیکھا جا سکتا ہے مگر مغرب کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس نام ''مغرب'' (THE WEST) نے ''مغربیت'' (ویسٹرنائزیشن) کے تصور کو جنم دیا ہے اور مغربیت اور جدیدیت (ماڈرنائزیشن) کی گمراہ کن کشمکش کو بھی جنم دیا ہے۔ یہ تصور کرنا آسان ہے کہ جاپان ''مغربیت'' اپنا رہا ہے بہ نسبت یہ تصور کرنے کے کہ وہ یورپی امریکیت اپنا رہا ہے۔ تاہم یورپی امریکی تہذیب آفاقی طور پر مغربی تہذیب کی حیثیت میں جانی جاتی ہے اور یہ اصطلاح اپنی سنگین عدم استعدادوں کے باوجود یہاں استعمال کی جائے گی۔

افریقی تہذیب (امکاناً)

تہذیبوں کے بیشتر اہم علماء سوائے براڈل کے ایک علیحدہ افریقی تہذیب کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ براعظم افریقہ کا شمالی علاقہ اور اس کے مشرقی ساحلی علاقے اسلامی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر ایتھوپیا کی اپنی تہذیب رہی ہے۔ یورپی استعماریت اور آبادکاری نے ہر کہیں مغربی تہذیب کے عناصر کو رائج کیا ہے۔ جنوبی افریقہ میں فرانسیسی، ڈچ اور پھر انگریز آبادکاروں نے یورپی ثقافت کے مختلف عناصر کو رائج کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یورپی استعماریت نے صحارا کے بیشتر جنوبی علاقے میں عیسائیت کو عام کیا۔ سارے افریقہ میں قبائلی شناختیں غالب اور شدید ہیں لیکن افریقی ایک افریقی تشخص کے شعور کو بھی ترقی دے رہے ہیں اور قابل فہم حد تک ذیلی صحارائی افریقہ ایک علیحدہ تہذیب سے مربوط ہوسکتا ہے جس کی مرکزی ریاست ممکنہ طور پر جنوبی افریقہ ہوگا۔

مذہب تہذیبوں کی مرکزی تشکیلی خصوصیت ہوتا ہے اور جیسا کہ کرسٹوفر ڈاسن نے کہا ہے ''عظیم مذاہب وہ بنیاد ہوتے ہیں جس پر عظیم تہذیبیں استوار ہوتی ہیں۔'' ویبر کے پانچ ''عالمی مذاہب'' میں سے چار ---- عیسائیت، اسلام، ہندومت اور کنفیوشس ازم ---- بڑی تہذیبوں سے مربوط ہیں۔ پانچواں مذہب بدھ مت کسی بڑی تہذیب سے مربوط نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسلام اور عیسائیت کے مانند بدھ مت اول اول دو بنیادی ذیلی قسموں میں تقسیم ہوا اور عیسائیت کی طرح یہ اپنی جنم بھومی میں باقی نہیں رہا ہے۔ مہایان بدھ مت پہلی صدی عیسوی میں شروع ہو کر چین اور اس کے بعد کوریا، ویتنام اور جاپان کو برآمد ہوا۔ ان معاشروں میں بدھ مت نے مقامی ثقافتوں سے اختلاط کر لیا (مثال کے طور پر چین میں کنفیوشس مت اور تاؤمت کے ساتھ) اور ان سے مغلوب ہوگیا لہٰذا جہاں بدھ مت ان کی ثقافتوں کے اہم جزو کے طور پر رہا وہاں یہ معاشرے بدھ مت سے تشکیل نہیں ہوتے ہیں اور نہ وہ خود کو بدھ تہذیب کا حصہ قرار دلوائیں گے۔ تاہم جائز طور پر جس کو اتھرویدبدھ مت تہذیب کے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے وہ سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں وجود نہیں رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ تبت، منگولیا اور بھوٹان کی آبادیاں تاریخی حوالے سے مہایان

بدھ مت کی اس شاخ کو مانتے ہیں جو لامامت کے نام سے موسوم ہے اور یہ معاشرے بدھ تہذیب کا دوسرا علاقہ تشکیل دیتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ہندوستان میں بدھ مت کی معدومی اور چین اور جاپان کی موجود ثقافتوں میں اس کے انجذاب و قبولیت سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ بدھ مت ایک بڑا مذہب ہے تاہم کسی بڑی تہذیب کی بنیاد نہیں رہا ہے۔

تہذیبوں کے درمیان تعلقات

ٹکراؤ: تہذیبیں 1500 عیسوی سے قبل

تہذیبوں کے درمیان تعلقات دو مراحل سے گزر کر وجود پذیر ہوتے تھے اور اب ایک تیسرے مرحلے سے بھی گزرتے ہیں۔ تین ہزار برس سے زیادہ عرصے سے کہ جب تہذیبیں پہلی بار ظہور میں آئیں ان کے درمیان روابط' چند مستثنیات کو چھوڑ کر یا تو ناموجود رہے ہیں یا محدود یا توقیفی اور شدید۔ ان کے روابط کی نوعیت کو اس لفظ کے ذریعے بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے جس کو تاریخ دان استعمال کرتے ہیں "ٹکراؤ"۔ تہذیبیں زمان اور مکان کے تحت جدا جدا ہوتی تھیں۔ ایک ہی وقت میں بہت تھوڑی تعداد میں تہذیبیں وجود رکھتی تھیں اور ان میں بھی اہم اختلافات ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ بنجامن شوارٹز اور شموئیل آئزن سٹیڈ نے تہذیبوں کو محوری دور اور قبل محوری دور کی تہذیبوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم کی بنیاد اس امر پر رکھی گئی آیا یہ تہذیبیں "مابعد الطبیعیاتی اور دنیاوی نظاموں" میں تفریق رکھتی تھیں یا نہیں۔ "محوری دور کی تہذیبیں اپنی پیش رو تہذیبوں کے برعکس مابعد الطبیعیاتی دیومالا کی حامل تھیں جسے دانشوروں کا ممتاز طبقہ پیش کیا کرتا تھا۔ "یہودی پیغمبر اور مذہبی پیشوا' یونانی فلسفی اور سوفسٹ' چینی علماء' ہندو برہمن' بدھ سنگھا اور اسلامی علماء"۔ کچھ علاقوں میں ایک تہذیب کے زوال کے ساتھ دوسری تہذیب ظہور میں آتی رہی ہے۔

تہذیبیں جغرافیائی اعتبار سے بھی مختلف ہوتی تھیں۔ 1500 عیسوی تک اینڈین اور

میسوامریکن تہذیبیں دوسری تہذیبوں سے یا آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ وادئ نیل' ٹگرس'فرات' دریائے سندھ اور دریائے زرد کی اولین تہذیبیں باہمی تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ آخرکارتہذیبوں کے درمیان روابط مشرقی بحیرۂ روم' جنوب مغربی ایشیا اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں میں نمود پذیر ہوئے۔ تاہم مواصلاتی اور تجارتی تعلقات تہذیبوں کو جدا کرنے والے فاصلوں کی وجہ سے محدود تھے اور فاصلوں پر غالب آنے والے کیلئے بہت محدود وسائل دستیاب تھے جبکہ بحیرۂ روم اور بحر ہند میں تھوڑی بہت بحری تجارت ہوا کرتی تھی۔ ''سمندروں کو پھلانگنے والے جہازوں کے بجائے ست گام گھوڑے ہی 1500 عیسوی سے پہلے دنیا کی الگ الگ تہذیبوں میں وہ واحد ذرائع نقل وحمل تھے جو انہیں باہم ملاتے تھے۔''

نظریات اور ٹیکنالوجی ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک سفر کرتے تھے مگر اکثر ان میں صدیوں کا وقت لگ جاتا تھا۔ بدھ مت کو جنوبی ہندوستان میں آغاز ہونے کے چھ سو سال بعد چین میں غلبہ حاصل ہوا۔ چھپائی چین میں آٹھویں صدی عیسوی میں دریافت ہو گئی تھی اور متحرک ٹائپ گیارہویں صدی عیسوی میں لیکن یہ ٹیکنالوجی صرف یورپ میں پندرہویں صدی میں پہنچی۔ کاغذ چین میں دوسری صدی میں متعارف ہو گیا تھا مگر یہ جاپان میں ساتویں صدی میں' آٹھویں صدی میں وسطی ایشیا میں' دسویں صدی میں شمالی افریقہ میں' بارہویں صدی میں سپین میں اور تیرہویں صدی میں شمالی یورپ میں پہنچا۔ ایک اور چینی دریافت بارود عرب میں کئی صدیوں بعد پہنچی اور یورپ میں چودھویں صدی میں پہنچی۔ تہذیبوں کے درمیان تعلقات اس وقت ڈرامائی اور اہم نوعیت کے ہو جاتے تھے جب ایک تہذیب کے لوگ دوسری تہذیب کے لوگوں کو فتح کرتے اور نیست و نابود کر دیتے یا انہیں غلام بنا لیتے تھے۔ یہ تعلقات نہ صرف تشدد آمیز بلکہ قلیل وقت کیلئے ہوتے تھے اور صرف وقفے وقفے سے قائم ہوتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہو کر اسلام کے نسبتی طور پر مستحکم اور کبھی کبھار شدید بین التہذیبی روابط مغرب اور ہندوستان کے ساتھ قائم رہے ہیں تاہم بیشتر تجارتی' ثقافتی اور فوجی تعاملات تہذیبوں کے اندر ہی ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر گو کہ ہندوستان اور چین پر مختلف موقعوں پر دوسرے لوگ حملہ آور ہوتے رہے (مغل'

منگول) تاہم دونوں ریاستوں میں ''جنگجو ریاستیں'' بھی لمبی مدت تک موجود رہی ہیں۔ اسی طرح یونانی بھی فارسیوں یا دوسرے غیر یونانیوں کے بجائے آپس ہی میں لڑتے رہے اور آپس ہی میں تجارت بھی کرتے رہے۔

اثرات: مغرب کا عروج

یورپی عیسائیت آٹھویں اور نویں صدی میں ایک علیحدہ تہذیب کے طور پر ظہور میں آنا شروع ہوئی تھی۔ تاہم کئی سو برسوں تک یہ اپنی تہذیب کی سطح پر دوسری کئی تہذیبوں کے پیچھے گھسٹتی رہی۔ چین تانگ' سنگ اور منگ ادوارِ حکومت میں' اسلامی دنیا آٹھویں صدی سے بارہویں صدی عیسوی میں اور بازنطینی آٹھویں سے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران میں یورپ سے دولت' علاقے' فوجی قوت اور فنی' ادبی اور سائنسی کارناموں کے حوالے سے کہیں آگے تھے۔ گیارہویں اور تیرہویں صدیوں کے دوران میں یورپی ثقافت نے ترقی پانا شروع کی۔ اسلام اور بازنطین کی اعلیٰ تہذیبوں سے موزوں عناصر اخذ کیے گئے۔ اسی عرصے کے دوران میں ہنگری' پولینڈ' سکینڈے نیویا اور بالٹک کا ساحل مغربی عیسائیت قبول کر لیتے ہیں۔ بارہویں اور تیرہویں صدیوں کے دوران میں مغربیوں نے سپین پر تسلط پانے کی کوششیں تیز کر دیں اور بحیرۂ روم میں موثر غلبے کی جدوجہد کی تاہم بعد ازاں ترکی طاقت کے عروج کی وجہ سے ''مغربی یورپ کی پہلی سمندر پار سلطنت'' منہدم ہو گئی تاہم پندرھویں صدی عیسوی سے یورپی ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کا بھرپور آغاز ہوا اور معاشرتی تکثیریت' بڑھتی ہوئی تجارت اور ٹیکنالوجیکل کارناموں نے عالمی (گلوبل) سیاست کے ایک نئے دور کیلئے بنیاد فراہم کی۔

تہذیبوں کے درمیان وقفے وقفے سے یا محدود کثیر جہتی ٹکراؤ نے مغرب کو دوسری تہذیبوں پر مستحکم' بالادست اور یک جہت اثر و رسوخ عطا کر دیا۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں موروں (مسلمانوں) نے جزیرہ نمائے آئبیریا کو آخری مرتبہ ایک بار پھر فتح کیا اور اسی زمانے میں پرتگالیوں نے ایشیا میں اور ہسپانویوں نے امریکہ میں داخل ہونا شروع کر دیا۔

بعد کے دوسو پچاس برسوں کے دوران میں سارے کے سارے مغربی نصف کرے اور ایشیا کے اہم حصوں پر یورپی حکومت یا غلبہ قائم ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کا براہ راست کنٹرول پہلے تو امریکہ پھر ہیٹی سے ختم ہوا اور پھر بیشتر لاطینی امریکہ نے یورپی حکمرانی سے انقلابات کے ذریعے آزادی حاصل کر لی۔ تاہم انیسویں صدی کے آخری حصے میں تازہ مغربی استعماریت نے قریباً سارے افریقہ پر مغربی حکمرانی کو محیط کر دیا' برصغیر پر مغربی کنٹرول کو مضبوط کیا اور ایشیا میں ہر کہیں' نیز بیسویں صدی کے اوائل میں سوائے ترکی کے باقی سارا مشرق وسطی مغرب کے براہ راست یا بالواسطہ قبضے میں چلا گیا۔ 1800ء میں یورپی یا سابق یورپی نوآبادیات (امریکہ میں) کرۂ ارض کے 35 فیصد رقبے پر قائم تھیں۔ 1878ء میں 67 فیصد اور 1914ء میں 84 فیصد۔ 1920ء میں فیصد اپنے عروج پر تھا کیونکہ عثمانی سلطنت برطانیہ' فرانس اور اٹلی کے زیر تسلط آ گئی تھی۔ 1800ء میں برطانوی سلطنت کا رقبہ ایک کروڑ پچاس لاکھ مربع میل اور آبادی دو کروڑ تھی۔ 1900ء میں وکٹورین سلطنت' جس پر کہ سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا' 11 کروڑ مربع میل پر محیط ہو گئی تھی اور اس کی آبادی 39 کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ یورپی توسیع کے دوران اینڈیئن اور میسوامریکی تہذیبیں فنا ہو گئیں۔ انڈین اور اسلامی تہذیبیں افریقہ کے ساتھ زیرنگیں آ گئیں اور چین کے اندر دخل اندازی کی گئی اور اس پر مغربی اثر و رسوخ حاوی ہو گیا۔ صرف روسی' جاپانی اور ایتھوپیائی تہذیبیں' جن پر انتہائی مرکزیت پسندانہ بادشاہتیں قائم تھیں' مغرب کی یلغار کا سامنا کرنے اور اپنے بامعنی آزاد وجود کو برقرار رکھنے کی اہل تھیں۔ چار سو برس تک بین التہذیبی تعلقات کی نوعیت یہ رہی کہ دوسرے معاشرے مغربی تہذیب کے زیر تسلط رہے۔

اس منفرد اور ڈرامائی ترقی کی وجوہات میں شامل تھیں مغرب کا معاشرتی ڈھانچہ اور طبقاتی تعلقات' شہروں کی تعداد اور تجارت میں اضافہ' مغربی معاشروں میں بادشاہوں اور امراء اور دنیاوی اور مذہبی قدروں میں اقتدار کی نسبتی تقسیم' مغربی لوگوں میں قومی شعور کی بیداری اور ریاستی بیوروکریسی کا ارتقا۔ تاہم مغربی توسیع کا فوری سرچشمہ ٹیکنالوجی تھی۔ دور دراز کے لوگوں تک رسائی کیلئے جہاز رانی کے ذرائع کی دریافت اور ان لوگوں کو فتح کرنے کیلئے

عسکری اہلیتوں کی ترقی۔ جیفری پارکر کا تجزیہ ہے کہ ''وسیع تناظر میں مغرب کے عروج کا دارومدار قوت کی عملیت پر تھا' اس حقیقت پر کہ یورپیوں اور اس کے سمندر پار دشمنوں میں فوجی توازن اول الذکر کے حق میں تھا۔...... 1500ء سے 1750ء کے دوران میں پہلی عالمی سلطنت کے قیام میں مغربیوں کی کامیابی کا انحصار ان کی جنگ لڑنے کی اہلیتوں میں اس اضافے پر تھا جس کو ''عسکری انقلاب'' کا نام دیا گیا ہے۔ مغرب کی توسیع اس کی فوجوں کی تنظیم' نظم وضبط اور تربیت کے حوالے سے فوقیت و برتری کی مرہون منت تھی اور اسی طرح برتر ہتھیاروں' ٹرانسپورٹ' لاجسٹکس اور طبی سروسز کی جو کہ اس کی صنعتی انقلاب میں لیڈرشپ کا نتیجہ تھیں۔ **مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقدار یا مذہب (جس کو دوسری تہذیبوں کے چند ارکان نے قبول کر لیا تھا) میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ منظم تشدد کرنے میں اپنی برتری کی وجہ سے۔ مغربی اس حقیقت کو اکثر فراموش کر دیتے ہیں' غیر مغربی نہیں کرتے ہیں۔**

1910ء میں دنیا سیاسی اور معاشی حوالے سے زیادہ یکجا ہو گئی' اتنی کہ انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں تھی۔ بین الاقوامی تجارت دنیا کی خام پیداوار کے تناسب سے اتنی زیادہ تھی کہ پہلے کبھی نہیں رہی تھی اور 1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی تک کبھی نہیں رہی۔ بین الاقوامی سرمایہ کاری' کل سرمایہ کاری کے فیصد کے طور پر کسی بھی دور سے زیادہ رہی۔ تہذیب کا مطلب تھا مغربی تہذیب۔ بین الاقوامی قانون مغربی بین الاقوامی قانون تھا جو گروٹیئس کی روایت سے پیدا ہوا تھا۔ بین الاقوامی نظام خودمختار مگر ''تہذیب یافتہ'' قومی ریاستوں اور ان کی نوآبادیات کا مغربی ویسٹ فیلیا نظام تھا۔ 1500 عیسوی کے بعد کی صدیوں میں عالمی سیاست کی سب سے اہم پیش رفت مغرب کے وضع کردہ اس بین الاقوامی نظام کا ظہور تھی۔ مزید یہ کہ مغربی معاشرے غیر مغربی معاشروں کے ساتھ تو حاکم اور رعایا کا تعلق رکھتے تھے لیکن باہمی طور پر برابری کے تعلقات قائم کئے ہوئے تھے۔ واحد تہذیب کے اندر سیاسی اکائیوں کے ان تعاملات کی مشابہت چینی' انڈین اور یونانی تہذیبوں سے ہے۔ وہ ایک ثقافتی یکسانیت پر بنیاد رکھتے تھے یعنی ''زبان' قانون' مذہب'

انتظامی عمل، زراعت، زمین داری اور شاید خاندان'' یورپی لوگوں کی ''ایک مشترک ثقافت ہے اور وہ تجارت کے ایک فعال نیٹ ورک کے ذریعے وسیع روابط استوار رکھتے تھے، ان کی آمدورفت مستقل جاری رہتی تھی اور ان کے حکمران خاندانوں میں حیرت ناک باہمی روابط تھے۔'' وہ حقیقتاً بلامقصد ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے بھی رہے۔ یورپی ریاستوں کے مابین امن ایک استثنا ہی رہا، قانون نہیں۔ اگرچہ اس عرصے کے بیشتر حصے میں عثمانی سلطنت یورپ تصور کئے جانے والے رقبے کے ایک چوتھائی پر قابض رہی تاہم اس کو یورپی بین الاقوامی نظام کا جزو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

مغرب کی بین التہذیبی سیاست 150 برسوں تک بڑے مذہبی اختلافات اور مذہبی یا اقتدار کی جنگوں کے غلبے تلے رہی۔ ویسٹ فیلیا کے معاہدے کے بعد ایک پوری صدی اور ایک نصف صدی تک مغربی دنیا کے جھگڑے شہزادوں کے درمیان رہے۔ بادشاہ، مطلق العنان بادشاہ اور دستوری بادشاہ اپنی بیورو کریسیوں (انتظامیہ)، اپنی افواج، اپنی تاجرانہ معاشی طاقت اور سب سے اہم اپنے زیرحکومت علاقے کو توسیع دینے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس عمل کے دوران میں انہوں نے قومی ریاستیں تخلیق کیں اور انقلاب فرانس سے شروع ہوکر جھگڑے کے مرکزی خطوط شہزادوں کے درمیان نہیں بلکہ قوموں کے درمیان کھنچ گئے۔ جیسا کہ آر آر پامر نے 1793ء میں لکھا کہ ''بادشاہوں کی جنگیں ختم ہوئیں۔ رعایا کی جنگیں شروع ہوگئیں۔'' انیسویں صدی کا یہ خاکہ (پیٹرن) پہلی عالمی جنگ تک برقرار رہا۔

1917ء میں روسی انقلاب کے نتیجے میں قومی ریاستوں کے جھگڑے کی آگ کو نظریات کی کشمکش نے مزید بھڑکا دیا۔ پہلے تو فاشزم، کمیونزم اور لبرل جمہوریت کے درمیان اور پھر آخری دو کے درمیان۔ سرد جنگ کے دوران میں یہ نظریات دو سپر پاوروں میں مجسم ہوگئے جن میں سے ہر کوئی اپنی شناخت اپنے نظریے سے کرواتا تھا اور ان میں سے کوئی بھی روایتی یورپی مفہوم میں قومی ریاست نہیں تھی۔ مارکسزم کا پہلے روس میں، پھر چین اور ویتنام میں اقتدار میں آجانا یورپی بین الاقوامی نظام سے مابعد یورپی کثیر التہذیبی نظام تک کے عبوری مرحلے کی عکاسی کرتا ہے۔ مارکسزم یورپی تہذیب کی ایک پیداوار تھا لیکن نہ تو اس کی

جڑیں اس میں تھیں اور نہ اس نے اس کی جانشینی کی۔ جدیدیت کے بجائے انقلابی اشرافیہ نے اس کو غیر مغربی معاشروں میں برآمد کیا۔ لینن، ماؤ اور ہو اس سے اپنے اغراض کے تحت وابستہ تھے اور انہوں نے اس کو مغربی اقتدار کو چیلنج کرنے، اپنی رعایا کو متحرک و بیدار کرنے اور مغرب کے مقابلے میں اپنے اپنے ملکوں کی قومی شناخت اور خودمختاری کو تسلیم کروانے کیلئے استعمال کیا۔ تاہم سوویت یونین میں اس نظریے کے انہدام اور چین اور ویتنام میں اس میں ٹھوس تبدیلی کا یہ لازمی مفہوم نہیں ہے کہ یہ معاشرے دوسرے مغربی نظریے لبرل جمہوریت کو درآمد کر لیں گے۔ جو مغربی یہ تصور کرتے ہیں کہ ایسا ہوگا وہ غیر مغربی ثقافتوں کی تخلیقیت، تیزی وطراری اور انفرادیت پر حیران ہوں گے۔

تعاملات: ایک کثیر التہذیبی نظام

بیسویں صدی میں تہذیبوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت دوسری تمام تہذیبوں پر ایک تہذیب کے یک سمتی اثر کے غلبے کے مرحلے سے نکل کر دوسرے مرحلے میں ہے جس میں تمام تہذیبوں کے درمیان شدید، دیرپا اور کثیر سمتی تعامل واقع ہو رہا ہے۔ بین التہذیبی تعلقات کے گزشتہ دور کی دونوں مرکزی خصوصیات معدوم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

اول

تاریخ دانوں کے مرغوب الفاظ میں ''مغرب کی توسیع'' ختم ہوئی اور ''مغرب کے خلاف انقلاب'' شروع ہوا۔ مغربی طاقت میں دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں زوال غیر مساوی طور پر اور وقفوں وقفوں سے اور پلٹ پلٹ کر عمل میں آیا ہے۔ 1990ء میں دنیا کا نقشہ 1920ء کے دنیا کے نقشے سے بہت کم مشابہت رکھتا ہے۔ فوجی اور معاشی قوت کا توازن اور سیاسی اثر ورسوخ تبدیل ہوا ہے (اور اس کو آخری باب میں زیادہ تفصیل سے واضح کیا جائے گا۔) مغرب دوسرے معاشروں پر اثرات ڈالنا جاری رکھے ہوئے ہے تاہم مغرب اور دوسری تہذیبوں کے مابین تعلقات ان تہذیبوں میں ہونے والی پیش رفتوں پر

مغرب کے ردعمل کے زیر اثر ہیں۔ غیر مغربی معاشرے مغرب کی بنائی ہوئی تاریخ کے مغلوب اجزاء بنے رہنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ اپنی اور مغربی تاریخ کے بنانے اور تشکیل دینے والے بن رہے ہیں۔

دوم

ان پیش رفتوں کے نتیجے میں بین الاقوامی نظام وسیع ہو کر مغرب سے بالاتر ہو گیا ہے اور کثیر التہذیبی بن گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی ریاستوں میں صدیوں سے نظام پر مسلط جھگڑا بھی ختم ہو گیا ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں مغرب تہذیب کے طور پر ترقی کے اس مرحلے سے نکل گیا ہے جس کو ''جنگجو صورتحال'' کہا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر یہ مرحلہ ہنوز نامکمل ہے کیونکہ مغرب کی قومی ریاستیں دو نیم آفاقی ریاستوں یورپ اور شمالی امریکہ سے منسلک ہیں تاہم یہ دونوں اکائیاں اور ان کی تشکیلی اکائیاں ایک دوسرے کے ساتھ رسمی اور غیر رسمی معاہدوں اور ناطوں کے ایک غیر معمولی حد تک پیچیدہ جال (نیٹ ورک) میں جڑی ہوئی ہیں۔ سابقہ تہذیبوں کی آفاقی ریاستیں سلطنتیں ہوتی تھیں۔ تاہم جمہوریت کے مغربی تہذیب کے سیاسی روپ کے طور پر سامنے آنے سے مغربی تہذیب کی ظہور پذیر ہوتی ہوئی آفاقی ریاست ایک سلطنت نہیں بلکہ فیڈریشنوں، کنفیڈریشنوں اور بین الاقوامی نظام ہائے حکومت اور تنظیموں کا مجموعہ ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم نظریات لبرل ازم، سوشل ازم، انارکزم، کارپوریٹ ازم، مارکسزم، کمیونزم، سوشل ڈیموکریسی، کنزرویٹو ازم، قوم پرستی (نیشنل ازم)، فاشزم اور عیسائی جمہوریت ہیں۔ ان تمام میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ کسی دوسری تہذیب نے کوئی اہم سیاسی نظریہ تخلیق نہیں کیا ہے تاہم مغرب نے کوئی اہم مذہب پیدا نہیں کیا۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب غیر مغربی تہذیبوں کی پیداوار ہیں اور بیشتر معاملات میں مغربی تہذیب سے پرانے ہیں۔ دنیا جیسے جیسے مغربی مرحلے سے نکل رہی ہے وہ نظریات جنہیں پرانی مغربی تہذیب نے وضع کیا تھا زوال پا رہے ہیں اور ان کی

جگہ مذاہب اور تشخص اور وابستگی کی ثقافتی بنیادوں والی صورتوں نے لینا شروع کر دی ہے۔ مغربی تہذیب کی ایک خاص الخاص پیداوار مذہب اور بین الاقوامی سیاست کی ویسٹ فیلیا تقسیم اب اختتام کو پہنچ رہی ہے اور مذہب بقول ایڈورڈ مورٹیمر بین الاقوامی معاملات میں زیادہ شامل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مغرب کا پیدا کیا ہوا سیاسی نظریات کا بین الاقوامی تصادم اب ثقافت اور مذہب کے بین التہذیبی تصادم میں بدل رہا ہے۔

لہٰذا عالمی (گلوبل) سیاسی جغرافیہ 1920ء کی واحد دنیا سے 1960ء کی دہائی کی تین دنیاؤں سے ہوتا ہوا 1990ء کی دہائی کی آدھی درجن سے زیادہ دنیاؤں تک پہنچ گیا ہے۔ 1920ء کی مغربی عالمی سلطنت 1960ء کی دہائی کی بہت زیادہ محدود ''آزاد دنیا'' تک سکڑ گئی تھی (جس میں کمیونزم کی مخالفت میں بہت سی غیر مغربی ریاستیں بھی شامل تھیں) اور اب 1990ء کی دہائی کا مزید سکڑتا ہوا ''مغرب'' رہ گئی ہے۔ یہ تبدیلی اصطلاح کے استعمال سے عیاں ہے۔ 1988ء سے 1993ء کے دوران میں نظریاتی اصطلاحات ''آزاد دنیا'' کا استعمال بہت کم ہو گیا اور تہذیبی اصطلاح ''مغرب'' کا استعمال زیادہ ہو گیا۔ یہ امر بڑھتے ہوئے حوالوں سے بھی عیاں ہے جن میں اسلام ایک ثقافتی سیاسی مظہر ''عظیم چین'' روس اور اس کے ''ہمسائے'' اور یورپی یونین شامل ہیں۔ یہ سب اصطلاحیں ایک تہذیبی مفہوم رکھتی ہیں۔ اس تیسرے مرحلے میں بین التہذیبی تعلقات پہلے مرحلے سے کہیں زیادہ شدید ہیں اور دوسرے مرحلے سے زیادہ مساویانہ اور دوطرفہ ہیں۔ مزید یہ کہ سرد جنگ کے برخلاف کوئی واحد خلیج نہیں ہے بلکہ مغرب اور دوسری تہذیبوں اور بہت سے غیر مغربوں (Non Wests) کے مابین بہت سی خلیجیں حائل ہیں۔

ہیڈلے بل کا کہنا ہے کہ ''ایک بین الاقوامی نظام تب وجود پذیر ہوتا ہے جب دو یا زیادہ ریاستوں کے درمیان قابل تشفی روابط موجود ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے فیصلوں پر اطمینان بخش اثرات کی حامل ہوتی ہیں اور کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ایک کل کے اجزاء کے طور پر برتاؤ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔'' تاہم ایک بین الاقوامی معاشرہ صرف تبھی وجود رکھتا ہے جب ایک بین الاقوامی نظام میں ریاستیں ''مشترک مفادات اور

مشترک اقدار'' کی حامل ہوں ''خود کو قوانین کے مشترک ضابطے کا پابند تصور کرتی ہوں' مشترک اداروں کی حامل ہوں'' اور ''ایک مشترک ثقافت یا تہذیب'' کی حامل ہوں۔ اپنی پیش رو سومیری' یونانی' ہیلنی' چینی' انڈین اور اسلامی تہذیبوں کے مانند سترہویں سے انیسویں صدی کا یورپی بین الاقوامی نظام بھی ایک بین الاقوامی معاشرہ تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران میں یورپی بین الاقوامی نظام دوسری تہذیبوں کے تمام معاشروں پر حقیقتاً وسعت پا گیا تھا۔ کچھ یورپی ادارے اور سرگرمیاں ان ملکوں کو برآمد بھی کی گئی تھیں تاہم یہ معاشرے ہنوز مشترک ثقافت کے حامل نہیں ہیں جو کہ یورپی بین الاقوامی نظام کی جگہ لے۔ برطانوی بین الاقوامی تعلقات کے نظریے کے الفاظ میں دنیا خوب ترقی یافتہ بین الاقوامی معاشرہ نہیں بلکہ بہت ہے تو محض ایک ابتدائی نوعیت کا بین الاقوامی معاشرہ ہے۔

ہر تہذیب خود کو دنیا کے مرکز کے طور پر دیکھتی ہے اور اپنی تاریخ کو انسانی تاریخ کے مرکزی ڈرامے کے طور پر لکھتی ہے۔ یہ بات دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں مغرب کے حوالے سے بہت زیادہ درست ہے تاہم اس طرح کے یک تہذیبی تصورات ایک کثیر التہذیبی دنیا کے اندر اہمیت اور افادیت کھو رہے ہیں۔ تہذیبوں کے علماء نے اس صداقت کو بہت پہلے کا تسلیم کر لیا ہوا ہے۔ سپنگلر نے 1918ء میں تاریخ کے بعید نظری (مائیو پک) تصور کو رد کر دیا تھا جو کہ مغرب میں رائج تھا اور اس نے مغرب کے تناظر میں تین مراحل طے کئے تھے قدیم' وسطی اور جدید۔ اس نے کہا کہ یہ ضروری ہے کہ تاریخ کے اس ''بطلیموسی نظریے'' کی جگہ کو پرنیکسی نظریے کو لانا چاہئے اور ''یک کرداری تاریخ کے کھوکھلے بیان'' کے متبادل کے طور پر ''طاقت ور ثقافتوں کی بڑی تعداد'' کو لانا چاہئے۔ چند عشروں بعد ٹائن بی نے مغرب کے ''انانیت پسندانہ توہم'' میں ظاہر ہونے والی ''تنگ نظری اور مغائرت'' کی خوب مذمت کی تھی۔ اس توہم کے تحت سمجھا جاتا تھا کہ دنیا مغرب کے گرد گھومتی ہے اور یہ کہ ایک ''ناقابل تغیر مشرق'' موجود ہے اور یہ کہ ''ترقی'' ناگزیر ہے۔ سپنگلر کی طرح وہ تاریخ کی وحدانیت کے مفروضے کا قائل نہیں ہے۔ یہ مفروضہ کہ ''تہذیب کا بس ایک ہی دریا رواں ہے' صرف ہماری تہذیب...... اور دوسری تہذیبیں یا تو اس کی باجگزار ہوں گی یا پھر صحراؤں کی

ریت میں کھو جائیں گی۔" ٹائن بی کے پچاس برس بعد براڈل اسی طرح ایک وسیع تناظر کی اہمیت پر اصرار کرتا ہے اور کہتا ہے "دنیا میں بڑے ثقافتی جھگڑوں اور دنیا کی تہذیبوں میں اضافے" کو سمجھیں۔ تاہم جن توہمات اور تعصبات کے حوالے سے ان عالموں نے انتباہ کیا ہے وہ برقرار رہے ہیں اور بیسویں صدی کے اواخر میں اس ہمہ گیر اور تنگ نظری پر مبنی خیال کو فروغ ملا کہ مغرب کی یورپی تہذیب اب دنیا کی آفاقی تہذیب ہے۔

☆☆☆

باب 3

ایک آفاقی تہذیب؟
جدیدیت اور مغربیت

آفاقی تہذیب: مفہوم

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس عہد میں وہ کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے جس کو وی ایس نائپال ''آفاقی تہذیب'' کہتا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟ اس نظریے کا اطلاق عمومی طور پر انسانیت کی ثقافتی حوالے سے قربت پر ہوتا ہے اور دنیا بھر کے لوگوں کی مشترک اقدار' عقائد' نہاد' فعل و عمل اور اداروں کی بڑھتی ہوئی قبولیت پر۔ زیادہ خصوصی طور پر اس نظریے سے کچھ ایسی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں جو گہری تو ہیں مگر غیر متعلق ہیں' کچھ متعلق ہیں مگر گہری نہیں ہیں اور کچھ غیر متعلق اور سطحی ہیں۔

اول

تمام معاشروں کے انسانوں میں چند خاص بنیادی اقدار مشترک ہیں مثلاً قتل شر ہے اور چند خاص بنیادی ادارے مثلاً خاندان کی کوئی نہ کوئی شکل۔ بہت سے معاشروں میں اکثر لوگ ایک سا ''اخلاقی شعور'' رکھتے ہیں' خیر اور شر کے بنیادی تصورات کے حوالے سے ایک ''باریک'' کم سے کم اخلاقیات۔ اگر آفاقی تہذیب سے یہی مراد ہے تو یہ گہرا بھی ہے اور گہری اہمیت کا حامل بھی لیکن نہ تو یہ نیا ہے اور نہ ہی متعلق۔ اگر لوگ تاریخ بھر میں کچھ مشترک بنیادی اقدار اور اداروں کے حامل رہے ہیں تو اس سے انسانی رویے میں چند

مستقل باتوں کا تو پتا چلتا ہے لیکن اس سے تاریخ پر نہ تو کوئی روشنی پڑتی ہے' نہ وضاحت ہوتی ہے جو کہ انسانی رویے میں تبدیلیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر ساری انسانیت کیلئے مشترک آفاقی تہذیب وجود رکھتی ہے تو ہم انسانوں کی اہم ثقافتی گروپ بندیوں کو کس اصطلاح میں بیان کریں گے۔ انسانیت ذیلی گروپوں میں تقسیم ہے قبائل' قومیں اور وسیع تر ثقافتی اکائیاں معمول کے مطابق تہذیبیں کہلاتی ہیں۔ اگر اصطلاح تہذیب کو اعلیٰ اور محدود مفہوم میں مجموعی طور پر انسانیت کیلئے مشترک شے کیلئے استعمال کیا جائے تو یا تو کسی شخص کو لوگوں کی بڑی ثقافتی گروپ بندیوں کیلئے نئی اصطلاح وضع کرنی پڑے گی یا یہ فرض کرنا پڑے گا کہ یہ بڑی گروپ بندیاں جو انسانیت پر محیط نہیں ہیں معدوم ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر ویکلیو ہیول کہتا ہے ''اب ہم واحد گلوبل تہذیب میں جی رہے ہیں'' اور یہ کہ ''یہ ایک باریک سی پرت سے زیادہ نہیں ہے'' جو ''ثقافتوں' لوگوں' مذہبی دنیاؤں' تاریخی روایات اور تاریخی حوالے سے تشکیل شدہ رجحانات کی وسیع صورتوں کا احاطہ کرتی ہے' یہ سب ایک مفہوم میں اس کے ''نیچے'' ہوتے ہیں۔'' تاہم ''تہذیب'' کو عالمی سطح تک محدود کرنے سے محض معنیاتی کنفیوژن ہی پیدا ہوگا نیز تاریخی حوالے سے ہمیشہ تہذیب کہلوانے والی اکائیوں کو ''ثقافتیں'' یا ''ذیلی تہذیبیں'' قرار دینا معنیاتی الجھاؤ (کنفیوژن) ہی کو جنم دے گا۔

دوم:

''آفاقی تہذیب'' تہذیب یافتہ معاشروں میں مشترک چیزوں کو ہی بیان کرنے کیلئے استعمال ہو سکتی ہے مثلاً شہر اور تعلیم جو کہ انہیں ابتدائی معاشروں اور وحشیوں سے الگ کرتے ہیں۔ بہر حال یہ اصطلاح کا اٹھارہویں صدی کا صیغۂ واحد میں مفہوم ہے اور اس مفہوم میں ایک آفاقی تہذیب ظہور میں آ رہی ہے۔ تہذیب اس مفہوم میں ساری انسانی تاریخ کے دوران بتدریج وسعت پاتی رہی ہے۔

سوم:

ممکن ہے اصطلاح ''آفاقی تہذیب'' ان مفروضوں' اقدار اور فلسفوں (ڈاکٹرین) کو

بیان کرتی ہو مغربی تہذیب کے بیشتر لوگ جن کے حامل ہیں اور دوسری تہذیبوں کے کچھ لوگ۔ اس کو ڈیووس ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ ہر سال سوئٹزر لینڈ کے شہر ڈیووس میں لگ بھگ ایک ہزار کاروباری افراد' بینکار' سرکاری حکام' دانشور اور صحافی بے شمار ملکوں سے آ کر عالمی اقتصادی فورم میں یکجا ہوتے ہیں۔ قریباً سارے لوگ طبعی سائنسوں' سماجی سائنسوں' بزنس یا قانون میں یونیورسٹی ڈگری کے حامل ہوتے ہیں' لفظوں اور اعداد و شمار سے کھیلتے ہیں' انگلش روانی سے بولتے ہیں' حکومتوں کارپوریشنوں اور بین الاقوامی سطح کے تعلیمی اداروں میں ملازم ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر اکثر سفر کرتے رہتے ہیں۔ وہ عموماً انفرادیت پسندی' منڈی کی معیشتوں اور سیاسی جمہوریت کے عقائد پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ مغربی تہذیب میں بھی مشترک ہیں۔ ڈیووس کے لوگ حقیقت میں تمام بین الاقوامی اداروں' دنیا کی بہت سی حکومتوں اور بہت بڑی تعداد میں دنیا کی معاشی اور فوجی استعدادوں کو کنٹرول کرتے ہیں لہٰذا ڈیووس کی ثقافت انتہائی اہمیت رکھتی ہے تاہم عالم گیر سطح پر کتنے لوگ اس ثقافت میں حصہ دار ہیں؟ مغرب کے باہر شاید اس میں پانچ کروڑ لوگ حصہ دار ہوں گے یا دنیا کی کل آبادی کا ایک فیصد۔ یہ آفاقی ثقافت نہیں ہے اور جو لیڈر ڈیووس ثقافت میں حصہ دار ہوتے ہیں وہ اپنے معاشروں پر کوئی محفوظ گرفت نہیں رکھتے ہیں۔ ہیڈلے بل کا موقف ہے کہ "یہ دانشورانہ ثقافت صرف اشرافیہ کی سطح پر وجود رکھتی ہے۔ اس کی جڑیں بہت سے معاشروں میں زیادہ گہری ہیں ...... (اور) یہ امر غیر یقینی ہے کہ یہ ایک مشترک دانشورانہ ثقافت سے ممتاز' خواہ سفارتی سطح پر ہی سہی' ایک مشترک اخلاقی ثقافت یا مشترک اقدار کے مجموعے (سیٹ) کو محیط ہو۔"

چہارم

یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ مغربی اصرافی تانوں بانوں اور عوامی ثقافتوں کی ساری دنیا میں توسیع سے ایک آفاقی تہذیب پیدا ہو رہی ہے۔ یہ دلیل نہ تو گہرائی رکھتی ہے اور نہ یہ متعلق ہے۔ ثقافتی فیشن ساری تاریخ میں ایک سے دوسری تہذیب میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔

ایک تہذیب کی اختراعات باقاعدگی سے دوسری تہذیبیں لیتی رہتی ہیں۔ تاہم یہ ٹیکنیکیں ہوتی ہیں جو اہم ثقافتی نتائج سے عاری ہوتی ہیں یا ایسے فیشن ہوتے ہیں جو قبول کرنے والی تہذیب کی ثقافت پر کوئی اثر ڈالے بغیر آتے اور چلے جاتے ہیں۔ سابقہ صدیوں میں مغربی دنیا چینی یا ہندو ثقافت کے مختلف اجزاء سے اٹ گئی تھی۔ انیسویں صدی میں چین اور ہندوستان میں مغرب سے ثقافتی درآمدات کو مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ اس سے مغرب کی طاقت کی عکاسی ہوتی تھی۔ دلیل اب یہ ہے کہ ساری دنیا میں پاپ ثقافت اور اشیائے صرف کے پھیلاؤ سے مغربی تہذیب کی فتح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب کا جوہر میگنا کارٹا ہے میگنا میک نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر مغربیوں کا مؤخر الذکر کو کھانا اول الذکر کی قبولیت نہیں ہو سکتی ہے۔

اس سے مغرب کے حوالے سے ان کے رجحانات پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مشرق وسطیٰ میں کسی مقام پر نصف درجن نوجوان جینز پہنے' کوک پیتے' ریپ سنتے ہوئے اور مکہ کی طرف جھکتے (رکوع کرتے) ہوئے کسی امریکی ہوائی جہاز کو تباہ کرنے کیلئے بم بھی پھینک سکتے ہیں۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں امریکیوں نے لاکھوں کی تعداد میں جاپانی کاریں' ٹی وی' کیمرے اور الیکٹرانک آلات بغیر ''جاپانی ہوئے'' استعمال کئے بلکہ اس دوران میں ان میں جاپان کے خلاف قابل لحاظ حد تک احساسات پیدا ہوئے ہیں۔ محض بھولا بھالا اور سادہ گھمنڈ ہی مغربیوں کو یہ تصور کرنے کی راہ دکھا سکتا ہے کہ غیر مغربی لوگ مغربی اشیاء کو حاصل کر کے ''مغربیا'' جائیں گے۔ مغربی لوگ دنیا کو کیا بتانا چاہتے ہیں جب وہ اپنی تہذیب کو شوں شوں کرتے محلولوں' رواجی پتلونوں اور موٹا کرنے والی غذاؤں سے شناخت کرواتے ہیں؟

آفاقی عوامی ثقافت دلیل کا ایک اور روپ عمومی طور پر اشیائے صرف پہ مرکوز ہونے کے بجائے میڈیا پر مرکوز ہوتا ہے۔ کوکا کولا کے بجائے ہالی ووڈ پر' عالمی فلم' ٹیلی ویژن اور ویڈیو صنعت پر امریکی کنٹرول جہازوں کی صنعت کی نسبت بڑھ گیا ہے۔ 1993ء میں دنیا میں سب سے زیادہ جو سو فلمیں دیکھی گئیں ان میں سے 88 امریکی فلمیں تھیں اور دو امریکی

اور دو یورپی تنظیمیں عالمی سطح پر خبروں کے اکٹھا کرنے اور نشر کرنے پر حاوی ہیں۔ اس صورتحال سے دو مظہروں (فینومینا) کی عکاسی ہوتی ہے۔ پہلا مظہر ہے محبت، جنس، تشدد، پراسراریت، ہیروازم اور دولت میں انسانی دلچسپی کی آفاقیت اور منافع خور کمپنیوں، بنیادی طور پر امریکی کمپنیوں کی اپنے مفادات کیلئے ان دلچسپیوں کا استحصال کرنے کی صلاحیت۔ تاہم اس مفروضے کی تائید کرنے والے ثبوت و شواہد یا تو کم ہیں یا موجود نہیں ہیں کہ عالمی (گلوبل) ذرائع مواصلات کے پھیلتے ہوئے ابھار سے لوگوں کے رویوں اور عقائد میں اہم تبدیلی آ رہی ہے۔ جیسا کہ مائیکل ولا ہوس نے کہا ہے "تفریح ثقافتی تبدیلی کے مساوی نہیں ہو سکتی ہے۔" دوسرا مظہر یہ ہے کہ لوگ ذرائع مواصلات کو اپنی پہلے سے موجود اقدار اور تصورات کے مطابق ہی تعبیر کرتے ہیں۔ کشور محبوبانی تبصرہ کرتا ہے "یکساں بصری تمثال جو بیک وقت ساری دنیا کی بیٹھکوں (لونگ رومز) تک نشر ہوتے ہیں متضاد تصورات کو ابھار سکتے ہیں۔ مغربی لونگ روم اس وقت تالیاں بجائیں گے جب وہ کروز میزائلوں کو بغداد کو نشانہ بناتے ہوئے دیکھیں گے۔ جو لوگ باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ مغرب غیر سفید عراقیوں یا صومالیوں سے فوری انتقام لیتے ہیں جبکہ سفید سربوں سے نہیں۔ یہ کسی بھی معیار سے ایک خطرناک علامت ہے۔"

عالمی ذرائع مواصلات مغربی قوت کے سب سے اہم معاصر ظہور میں سے ایک ہیں تاہم اس مغربی اجارہ داری نے غیر مغربی معاشروں کے عوامی لیڈروں کو مغربی ثقافتی استعماریت کی مذمت کا حوصلہ دیا ہے اور وہ اپنے عوام کو اپنی مقامی ثقافتوں کی بقا اور ربط کیلئے اکسا رہے ہیں۔ ذرائع مواصلات پر مغربی غلبے نے غیر مغربی لوگوں میں مغرب کے خلاف معاندت اور اشتعال کو بڑھاوا دیا ہے۔ مزید برآں 1990ء کی دہائی میں غیر مغربی معاشروں میں جدیدیت اور معاشی ترقی کے نتیجے میں مقامی اور علاقائی میڈیا صنعتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے معاشروں کے جداگانہ ذوقوں کو تخلیق کیا۔ مثال کے طور پر 1994ء میں سی این این انٹرنیشنل نے اندازہ لگایا کہ اس کے ناظرین کی تعداد 5 کروڑ پچاس لاکھ ہے یا لگ بھگ دنیا کی کل آبادی کا ایک فیصد (جو حیران کن حد تک ڈیووس ثقافت کو ماننے

والوں کی تعداد کے مساوی ہے) اور اس کے صدر نے پیش گوئی کی کہ ان کی انگلش نشریات بالآخر مارکیٹ کے دو سے چار فیصد کیلئے پرکشش ہو جائیں گی۔ لہٰذا علاقائی (بالفاظ دیگر تہذیبی) نیٹ ورکس ظہور میں آئیں گے جو ہسپانوی، جاپانی، عربی، فرانسیسی (مغربی افریقہ کیلئے) اور دوسری زبانوں میں نشریات کریں گے۔ تین علماء نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "عالمی نیوز روم ہنوز مینار بابل سے تصادم میں ہے۔"

زبان

کسی ثقافت یا تہذیب کے مرکزی عناصر زبان اور مذہب ہوا کرتے ہیں۔ اگر ایک آفاقی تہذیب ظہور میں آ رہی ہے تو ایک آفاقی زبان اور ایک آفاقی مذہب کے ظہور میں آنے کے رجحانات بھی نمایاں ہونے چاہئیں۔ زبان کے حوالے سے اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے جیسا کہ "وال سٹریٹ جرنل" کے ایڈیٹر نے کہا "عالمی زبان انگریزی ہے۔" اس سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں جن میں سے صرف ایک ہی آفاقی تہذیب کے نظریے کی تائید میں جاتی ہے۔ اس سے مراد ہو سکتی ہے کہ دنیا کی آبادی میں انگریزی بولنے والوں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ اس مفروضے کی تائید کرنے والے شواہد عدم موجود ہیں اور جو شواہد موجود بھی ہیں وہ اس کی متضاد صورتحال کو واضح کرتے ہیں کہ دنیا میں زبانوں کے استعمال کے حوالے سے تین برسوں پر محیط ڈیٹا (اعداد و شمار) واضح کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کوئی ڈرامائی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں انگریزی بولنے والوں کا تناسب 1958ء میں 9.8 فیصد سے کم ہو کر 1992ء میں 7.6 فیصد ہو گیا۔ مغرب کی پانچ بڑی زبانیں (انگریزی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی اور ہسپانوی) بولنے والوں کا تناسب 1958ء کے 24.1 فیصد سے کم ہو کر 1992ء میں 20.8 فیصد ہو گیا۔

ایک نقطۂ نظر کے مطابق ایسی زبان جو دنیا کے 92 فیصد لوگوں کیلئے اجنبی ہو وہ کیسے عالمی زبان ہو سکتی ہے۔ تاہم دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق ایسا کہا جا سکتا ہے کیونکہ مختلف لسانی گروپوں سے تعلق رکھنے والے لوگ باہمی تبادلۂ خیال کیلئے اس زبان کو استعمال کرتے

ہیں۔ جن لوگوں کو غیر زبانوں میں اظہار خیال کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کیلئے مترجموں کی مدد لیتے ہیں لیکن یہ بہت مہنگا اور وقت ضائع کرنے والا طریقہ ہے۔ لہٰذا ساری تاریخ میں لنگوا فرینکا ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ لاطینی زبان' کلاسیکی اور وسطی عہد کی دنیاؤں کی' فرانسیسی مغرب میں کئی صدیوں تک' سواحلی افریقہ کے بہت سے حصوں میں اور بیسویں صدی کے آخری نصف عرصے میں قریب قریب ساری دنیا میں لنگوا فرینکا رہی ہیں۔ اس مفہوم میں انگریزی دنیا میں ثقافتوں کے مابین خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہے جس طرح کہ عیسوی کیلنڈر وقت کے ماپنے کیلئے' عربی اعداد دنیا میں گنتی کا ذریعہ ہیں اور دنیا کے بیشتر علاقوں میں میٹرک سسٹم (اعشاری نظام) پیمائش کا نظام ہے۔ تاہم اس انداز سے انگلش کا استعمال بین الثقافتی اظہار کیلئے مروج ہے۔ اس سلسلے میں مفروضہ یہ ہے کہ دنیا میں مختلف ثقافتیں موجود ہیں۔ لنگوا فرینکا لسانی اور ثقافتی اختلافات سے نمٹنے کا ایک طریقہ ہے نہ کہ انہیں ختم کرنے کا۔ یہ اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ تشخص اور برادری کا کیونکہ ایک جاپانی بینکار اور ایک انڈونیشی تاجر کا آپس میں انگریزی میں اظہار خیال یہ ثابت نہیں کرتا ہے کہ دونوں میں کوئی ایک مغربی ہو گیا ہے یا انگریز۔ اسی طرح نہرو کے منصوبوں کے برخلاف ہندوستان میں انگریزی کا قومی زبان کی شریک (ایسوسی ایٹ) کے طور پر استعمال اس امر کی شہادت ہے کہ ہندوستان کے ہندی نہ بولنے والے لوگ اپنی زبان اور ثقافتوں کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ایک کثیر لسانی معاشرہ کی ضرورت باقی ہے۔

دنیا بھر میں جو لوگ انگریزی بولتے ہیں وہ مختلف انگریزیاں (ENGLISHES) استعمال کرتے ہیں۔ ان میں مقامی رنگ اتنا زیادہ ملایا جاتا ہے کہ یہ برطانوی یا امریکی انگریزی سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ یہ اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ایک کا دوسرے کیلئے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ ساری تاریخ کے دوران میں زبانوں کی تقسیم دنیا میں قوت کی تقسیم کو ظاہر کرتی ہے۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانیں ...... انگریزی' مینڈرین' ہسپانوی' فرانسیسی' عربی' روسی ...... استعماری ریاستوں کی زبانیں ہیں یا تھیں' جنہوں نے دوسرے

لوگوں کو اپنی زبانیں بولنے پر ابھارا۔ قوت کی تقسیم میں تبدیلی زبانوں کے استعمال میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کی دو صدیوں تک نوآبادیاتی' تجارتی' صنعتی' سائنسی اور مالی قوت نے دنیا بھر میں اعلیٰ تعلیم' حکومت' تجارت اور ٹیکنالوجی کا ٹھوس ورثہ چھوڑا ہے۔ فرانس اور برطانیہ اپنی نوآبادیات میں اپنی زبانوں کے استعمال پر زور دیتے تھے۔ تاہم آزادی کے بعد بیشتر سابق نوآبادیات نے مختلف درجوں میں استعماری زبان کو تبدیل کر کے مقامی زبان کو رائج کرنے کی کوششیں کیں۔ سوویت یونین کے عروج کے دنوں میں پراگ سے ہنوئی تک روسی زبان کا غلبہ تھا۔ جو سوویت یونین کے انہدام کے بعد ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ دیوار برلن گرنے کے بعد متحدہ جرمنی کے لوگوں میں اپنی زبان بولنے کا احساس ظہور پذیر ہوا جو ان کے بین الاقوامی اجلاسوں میں جرمن زبان کے استعمال سے ظاہر ہوا۔ جاپان کی معاشی طاقت نے غیر جاپانیوں کو جاپانی سیکھنے پر مجبور کیا ہے۔ اسی طرح چین کی ترقی کے ساتھ ساتھ چینی زبان سیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک نقطۂ نظر کے مطابق اگر مستقبل بعید میں چین مغرب کی جگہ دنیا کی غالب تہذیب کا درجہ پا لیتا ہے تو انگلش کی جگہ مینڈرین دنیا کی لنگوا فرینکا ہو گی۔

سوویت یونین کے انہدام اور سرد جنگ کے خاتمے سے دنیا میں فراموش شدہ یا دبائی گئی زبانوں کا احیا ہو رہا ہے۔ بڑی کوششیں سابق سوویت ریاستوں میں جاری ہیں۔

مذہب

آفاقی زبان کے بجائے ایک آفاقی مذہب کے ظہور میں آنے کا امکان موجود ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں دنیا بھر میں مذاہب کا ایک عالمی (گلوبل) احیا دیکھنے میں آیا۔ اس احیا میں مذہبی تصور اور بنیاد پرستی کی تحریکوں میں شدت شامل ہیں۔ تاہم ڈیٹا بتاتا ہے کہ دنیا میں 1900ء کے 0.2 فیصد ''دہریوں'' یا ''بے عقیدہ لوگوں'' کا تناسب 1980ء میں 20.9 فیصد ہو گیا۔ ڈیٹا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دنیا کے دو بڑے مذاہب اسلام اور عیسائیت سے وابستہ دنیا کی آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں اسلام اور عیسائیت

افریقہ میں پھیلے اور جنوبی کوریا میں عیسائیت کی طرف لوگوں کی تبدیلی سامنے آئی۔ ان معاشروں میں جو تیزی سے جدید ہو رہے ہیں اور وہاں کے روایتی مذاہب جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں وہاں عیسائیت اور اسلام کے فروغ پانے کے وسیع امکانات ہیں۔ ایڈم سمتھ اور تھامس جیفرسن شہری تارکین وطن اور سیکنڈری سکول کے گریجوایٹوں کی پہلی نسل کی نفسیاتی' جذباتی' اخلاقی اور سماجی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عیسیٰؑ بھی ایسا نہیں کر سکتے ہیں تاہم ان کیلئے ایک بہتر موقع ضرور موجود ہے۔

تاہم طویل عرصے بعد محمدؐ کامیاب ہو جائیں گے۔ عیسائیت بنیادی طور پر تبدیلی' مذہب سے پھیلتی ہے جبکہ اسلام نسل افروزی اور تبدیلی' مذہب ہے۔ دنیا میں عیسائیت 1980ء میں اپنے عروج کو چھو رہی تھی جو کہ 30 فیصد تھی اور اب اس میں کمی آ رہی ہے اور یہ امکان ہے کہ 2025ء میں دنیا کی آبادی کے 25 فیصد کے لگ بھگ رہ جائے گی۔ مسلم اپنی زیادہ شرح پیدائش کی وجہ سے ڈرامائی طور پر بڑھ رہے ہیں۔ صدی کی تبدیلی کے قریب ان کا تناسب دنیا کی آبادی کا 20 فیصد ہونے کا امکان ہے اور امکان ہے کہ 2025ء میں یہ تناسب 30 فیصد تک پہنچ جائے گا۔

آفاقی تہذیب

سرچشمے

آفاقی تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کی امتیازی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی میں ''سفید آدمی کا بوجھ'' کے نظریے نے غیر مغربی معاشروں پر مغرب کے سیاسی اور معاشی غلبے کا جواز فراہم کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر آفاقی تہذیب کا تصور ان معاشروں پر مغربی ثقافتی غلبے کو جواز فراہم کر رہا ہے اور ان معاشروں کی اس ضرورت کی کہ انہیں مغربی اعمال اور ادارے بنانے چاہئیں۔ آفاقیت مغرب کی غیر مغربی ثقافتوں سے کشمکشوں کیلئے وضع کی گئی ہے۔ یہ نظریہ نائپال اور فواد عجمی جیسے تارکین وطن کیلئے اطمینان کا ایک ذریعہ ہے

اور انہیں اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ ''میں کون ہوں؟'' ایک عرب دانشور نے کہا تھا ''سفید آدمی کا حبشی'' تاہم یہ اصطلاح تارکین وطن کیلئے استعمال کی گئی تھی۔ مغرب جس کو آفاقی قرار دیتا ہے غیر مغرب اس کو مغربی کہتا ہے۔

آفاقی تہذیب کے ظہور کا نظریہ کیوں پیدا ہوا؟ اس سوال کا جواب پہلے باب میں بھی دیا گیا ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ ایک مفروضہ تو یہ ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد تاریخ ختم ہو گئی ہے اور ساری دنیا میں لبرل جمہوریت کو آفاقی فتح حاصل ہو گئی ہے۔ اس نظریے کی اساس سرد جنگ کے زمانے کے ایک مغالطے پر ہے۔ وہ یہ کہ کمیونزم کے زوال کے بعد دنیا میں آفاقی طور پر لبرل جمہوریت ہی متبادل ہو گی۔ تاہم واضح طور پر آمریت کی بہت سی شکلیں دنیا میں آج بھی موجود ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ سیکولر دنیا سے باہر مذہب متبادل کے طور پر موجود ہیں۔ جدید دنیا میں مذہب لوگوں کو متحرک و بیدار کرنے والا مرکزی عامل ہے۔ ایسا سوچنا ہی صریح حماقت ہے کہ سوویت کمیونزم کے زوال کے بعد مغرب نے ہمیشہ کیلئے دنیا کو فتح کر لیا ہے اور مسلم، چینی اور ہندوستانی اور دوسرے لوگ مغربی لبرل ازم کو واحد متبادل کے طور پر اپنانے کیلئے دوڑے آئیں گے۔ انسانیت کی سرد جنگ کی تفریق اب ختم ہو گئی ہے۔ انسانیت کی زیادہ اہم تقسیم نسلی، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر باقی ہے اور نئے جھگڑوں کو جنم دے رہی ہے۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ لوگوں میں بڑھتے ہوئے تعامل...... عمومی طور پر تجارت، سرمایہ کاری، سیاحت، میڈیا، الیکٹرونک، مواصلات...... نے ایک مشترک عالمی کلچر کو پیدا کیا ہے۔ ٹرانسپورٹیشن (ذرائع نقل و حمل) اور ذرائع مواصلات کی ترقیوں نے دولت، اشیاء، لوگوں، علم، تصورات اور نظریات کی نقل و حرکت کو آسان اور سستا بنا دیا ہے۔ کیا تجارت جھگڑوں میں کمی کی ضامن ہو سکتی ہے؟ تاریخی شواہد اس کا جواب کچھ اور دیتے ہیں۔ سابقہ برسوں میں بین الاقوامی تجارت وسیع ہونے کے باوجود ملک آپس میں لڑتے رہے۔

عمرانی نفسیات کا ''امتیازی نظریہ'' بتاتا ہے کہ لوگ خود کو ایک مخصوص تناظر میں دوسرے لوگوں سے ممتاز کر کے دیکھتے ہیں۔ لوگ اپنی شناخت اس زاویے سے وضع کرتے

ہیں کہ وہ کیا نہیں ہیں۔ ذرائع مواصلات' تجارت اور سفر میں ارتقا کے باوجود لوگوں میں اپنی اپنی تہذیبوں سے ربط کا احساس زیادہ مضبوط ہوا ہے۔

مغرب اور جدیدیت

آفاقی تہذیب کے ظہور پذیر ہونے کی ایک نہایت عام دلیل یہ ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی سے جاری جدیدیت کے طویل عملوں کا نتیجہ ہے۔ جدیدیت میں شامل ہیں: صنعت پذیری (انڈسٹریلائزیشن) شہریت پذیری' تعلیم' دولت اور سماجی بیداری کے بڑھتے ہوئے مدارج نیز زیادہ پیچیدہ اور متنوع پیشہ ورانہ ڈھانچے۔ یہ اٹھارہویں صدی میں شروع ہونے والے سائنسی اور انجینئرنگ کے علم میں حیرت ناک فروغ کا نتیجہ ہے جس نے انسان کو اپنے ماحول کو قابو میں لانے اور اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بینظیر راستے فراہم کر دیئے۔ جدیدیت ایک ایسا انقلابی عمل ہے جس کا موازنہ صرف ابتدائی معاشرے سے تہذیب میں تبدیلی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک جدید معاشرے میں لوگوں کے رجحانات' اقدار' علم اور ثقافت ایک روایتی معاشرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ جدید ہونے والی اولین تہذیب کے طور پر مغرب جدیدیت کی ثقافت کو اپنانے والوں کا رہنما ہے۔ مذکورہ مفروضے کے مطابق جیسے ہی دوسرے معاشرے تعلیم' پیشے' دولت اور طبقاتی ڈھانچے کے یکساں پیٹرنز کو اپنا لیں گے۔ جدید مغربی ثقافت دنیا کی آفاقی ثقافت بن جائے گی۔

روایتی اور جدید ثقافتوں کے مابین جو اختلافات موجود ہیں وہ غیر متنازعہ ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو معاشرے جدید ثقافتیں رکھتے ہیں وہ ایک دوسرے سے روایتی معاشروں سے زیادہ مشابہہ ہیں۔ واضح رہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں کچھ معاشرے بہت زیادہ جدید ہوں اور دیگر اب بھی روایتی ہوں' بہت کم ایک سی ہوگی' بہ نسبت اس دنیا کے جس کے تمام معاشرے جدیدیت کے قابل موازنہ اعلیٰ درجوں پر ہوں۔ لیکن ایسی دنیا کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس کے تمام معاشرے روایتی تھے؟ یہ دنیا ابھی چند سو سال پہلے ہی تو موجود تھی۔ کیا یہ دنیا مستقبل میں جدیدیت کی بنا پر ایک سی ہو جانے والی دنیا سے

کم ایک سی تھی؟ ممکنہ طور پر نہیں......

کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم

مغربی عیسائیت پہلے کیتھولک ازم اور پھر کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم' تاریخی طور پر مغربی تہذیب کی واحد سب سے زیادہ اہم خصوصیت ہے۔ جسے اب مغربی تہذیب کہا جاتا ہے وہ اپنی پہلی ہزاری کے دوران میں مغربی عیسائیت کہلاتی تھی۔ مغربی عیسائی لوگوں میں برادری کا ایک خوب ارتقا یافتہ شعور موجود تھا کہ وہ ترکوں' ہسپانوی مسلموں' بازنطینیوں اور دیگر سے ممتاز تھے اور یہ سونے کے ساتھ ساتھ خدا بھی تھا جس کے بل پر مغربی سولہویں صدی میں دنیا کو فتح کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مغربی تاریخ کی امتیازی خصوصیات میں اصلاح اور رد اصلاح اور مغربی عیسائیت کی ایک پروٹسٹنٹ شمال اور کیتھولک جنوب میں تقسیم شامل ہے۔ یہ خصوصیات مشرقی آرتھوڈوکسی میں مکمل طور پر عدم موجود ہیں اور لاطینی امریکی تجربے سے وسیع پیمانے پر خارج کر دی گئی ہیں۔

یورپی زبانیں

مذہب کے بعد ایک ثقافت کے لوگوں کو دوسری ثقافت کے لوگوں سے ممتاز کرنے والا عامل زبان ہے۔ مغرب بہت سی دیگر تہذیبوں سے اپنی زبانوں کی کثرت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ جاپانی' ہندی' مینڈرین' روسی اور حتیٰ کہ عربی اپنی اپنی تہذیبوں کی مرکزی زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ لاطینی مغرب کا ورثہ ہے تاہم بہت سی قومیں ابھریں اور پھر رومانی اور جرمنی زبانوں کی وسیع درجہ بندی میں قومی زبانوں کے گروپ بن گئے۔ عمومی طور پر سولہویں صدی سے ان زبانوں کی معاصر حیثیت کو فرض کر لیا گیا ہے۔

روحانی اور دنیاوی اقتدار کی علیحدگی

پوری انسانی تاریخ میں' پہلے تو ایک چرچ اور پھر بہت سے چرچ ریاست سے الگ وجود رکھتے تھے۔ خدا اور سیزر' چرچ اور ریاست' روحانی مقتدرہ اور دنیاوی مقتدرہ مغربی ثقافت میں

غالب ثنویت رہی ہے۔ صرف ہندو تہذیب میں مذہب اور سیاست اتنے امتیازی طور پر الگ الگ تھے۔ اسلام میں خدا سیزر ہوتا ہے' چین اور جاپان میں سیزر خدا ہوتا ہے۔ آرتھوڈوکسی میں خدا سیزر کا نائب ہوتا ہے۔ چرچ اور ریاست کی علیٰحدگی اور ان کے مابین بار بار ہونے والے جھگڑے صرف اور صرف مغربی تہذیب کا امتیازی وصف ہیں۔ مقتدرہ کی یہ علیٰحدگی/ تقسیم مغرب میں آزادی کی ترقی میں بہت نمایاں مقام رکھتی ہے۔

قانون کی حکمرانی

تہذیب یافتہ معاشروں کیلئے قانون کی مرکزیت کا تصور رومیوں کی وراثت ہے۔ عہد وسطیٰ کے فلسفیوں نے قدرتی قانون کے تصور کو واضح کیا جس کے تحت بادشاہ اپنے اقتدار و اختیار کو عمل میں لاتے تھے اور برطانیہ میں ایک مشترکہ قانون کی روایت قائم ہوئی۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں کے دوران میں مطلق العنانیت کے زمانے میں قانون کی حکمرانی حقیقت سے زیادہ اس کی خلاف ورزی میں قائم ہوئی تاہم انسانی اقتدار و اختیار پر کسی خارجی امتناع کا نظریہ موجود رہا۔ قانون کی حکمرانی کی روایت نے دستوریت کی بنیادیں رکھیں نیز جائیداد کے حق سمیت انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی۔ بیشتر دوسری تہذیبوں میں فکر اور عمل کی تشکیل میں قانون ایک کم اہم عامل رہا ہے۔

معاشرتی تکثیریت

تاریخی طور پر مغربی معاشرہ بہت زیادہ تکثیری رہا ہے۔ ڈوئچ کے بقول مغرب کا امتیاز یہ ہے کہ ''یہاں شادی اور خونی رشتہ داریوں سے بالاتر متنوع خودمختار گروپ ابھرے اور برقرار رہے۔'' چھٹی اور ساتویں صدی میں ان گروپوں میں آغاز میں خانقاہیں' خانقاہی نظام اور گلڈز شامل تھیں تاہم یورپ کے بہت سے علاقوں میں دوسری تنظیمیں اور سوسائٹیاں وجود میں آ گئیں۔ تنظیمی تکثیریت میں طبقاتی تکثیریت نے اضافہ کیا۔ بیشتر مغربی یورپی معاشروں میں نسبتاً مضبوط اور خودمختار اشرافیہ' کثیر التعداد کسان اور تاجروں اور کاروباریوں کا ایک چھوٹا لیکن اہم طبقہ موجود رہا ہے۔ بیشتر مغربی قوموں میں مطلق العنانیت کی جڑیں

جاگیردارانہ اشرافیہ کی قوت میں تھیں۔ یورپی تکثیریت میں شہری معاشرے کی غربت، اشرافیہ کی کمزوری اور مرتکز بیوروکریسی کی قوت عدم موجود تھی جو کہ اس زمانے میں روس، چین، عثمانی سلطنت اور دوسرے غیر مغربی معاشروں میں موجود تھی۔

نمائندہ ادارے

معاشرتی تکثیریت نے ابتداء میں اشرافیہ، مذہبی پیشوائیت، تاجروں اور دوسرے گروپوں کے مفادات کی نمائندگی کرنے والی اسٹیٹ، پارلیمنٹ اور دوسرے اداروں کو ابھارا۔ ان اداروں نے جدیدیت کے سفر کے دوران میں جدید جمہوریت کے اداروں کی تشکیل میں مدد دی۔ کچھ مثالوں میں مطلق العنانیت کے زمانے میں یہ ادارے ختم کر دیئے گئے یا ان کے اختیارات بے حد محدود کر دیئے گئے تاہم جب بھی یہ سامنے آئے جیسا کہ فرانس میں ہوا انہوں نے وسیع سیاسی شرکت کیلئے وسیلے کا کام دیا۔ کسی دوسری معاصر تہذیب میں ہزار سال پرانے نمائندہ اداروں کا وجود نہیں ہے۔ لگ بھگ نویں صدی میں اطالوی شہروں میں مقامی سطح پر حکومت خود اختیاری کا آغاز ہوا اور پھر شمال کی طرف پھیلتے ہوئے اس نے "بشپوں، مقامی سرداروں اور دوسرے بڑے شرفاء کو مجبور کیا کہ وہ عام لوگوں کو اقتدار میں حصہ دیں۔" قومی سطح پر نمائندگی اور مقامی سطح پر خود مختاری دنیا کے کسی دوسرے علاقے میں موجود نہیں رہی ہے۔

انفرادیت پسندی

مغربی تہذیب کی مذکورہ بالا کئی خصوصیات نے انفرادیت پسندی کے ایک شعور اور انفرادی حقوق اور آزادیوں کے شعور کے ظہور میں آنے میں حصہ لیا جو کہ دوسرے تہذیب یافتہ معاشروں کے درمیان منفرد بات ہے۔ انفرادیت پسندی کو چودھویں اور پندرھویں صدی میں فروغ ملا اور انفرادی انتخاب کے حق کو سترہویں صدی میں مغرب میں حاوی قبولیت حاصل ہو گئی۔ جس کو ڈوئچ "رومیو جیولیٹ انقلاب" کا نام دیتا ہے۔ اس نظریے میں سب افراد کیلئے مساوی حقوق کی بات کی گئی تھی...... "وہ مرد جو انگلستان میں سب سے

زیادہ غریب ہے' سب سے زیادہ امیر فرد کے جتنا ہی جینے کا حق رکھتا ہے'' یہ اصول وضع کیا گیا خواہ آفاقی طور پر اس کو قبول نہیں کیا گیا۔ انفرادیت پسندی بیسویں صدی کی تہذیبوں میں مغرب کا امتیازی نشان رہی ہے۔ پچاس ملکوں سے ایک ہی جیسے نمونے لے کر تجزیہ کیا گیا تو انفرادیت پسندی کے اشاریے میں جو بیس ملک سرفہرست آئے ان میں پرتگال اور اسرائیل کو چھوڑ کر باقی سب کے سب مغربی ملک تھے۔ ایک اور مصنف نے ثقافت گیر تجزیہ کیا جس میں انفرادیت پسندی اور جماعیت پسندی کے غلبے کو جانچا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مغرب میں انفرادیت پسندی کا چلن ہے اور اجماعیت پسندی کا باقی ہر کہیں۔ وہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ''مغرب میں جو اقدار اہم ہیں وہ باقی ساری دنیا میں کم اہمیت رکھتی ہیں۔'' مغربی اور غیر مغربی ہر دو کا موقف ہے کہ انفرادیت پسندی مغرب کا طرۂ امتیاز ہے۔

مذکورہ بالا فہرست مغربی تہذیب کی خصوصیات کا مکمل احاطہ تو نہیں کرتی ہے نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ تمام خصوصیات آفاقی اور مستقل طور پر مغربی معاشروں میں موجود رہتی ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ خصوصیات ہمیشہ اور آفاقی طور پر موجود نہیں تھیں۔ مغربی تاریخ میں بہت سے مستبد حکمرانوں نے قانون کی حکمرانی کو نظر انداز کیا اور نمائندہ اداروں کو معطل کیا۔ اس سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ دوسری تہذیبوں میں ان خصوصیات میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ واضح سی بات ہے کہ یہ موجود ہیں۔ قرآن اور شریعت اسلامی معاشروں میں بنیادی قوانین پر مشتمل ہیں۔ جاپان اور ہندوستان میں مغرب سے مساوی طبقاتی نظام موجود ہے۔ (اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ دونوں طویل مدت سے واحد غیر مغربی جمہوری معاشرے ہیں۔) الگ الگ ان خصوصیات میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو صرف اور صرف مغرب ہی سے مخصوص ہو تاہم ان کے امتزاج نے مغرب کو امتیازی وصف عطا کیا تھا اور کیا ہے۔ سادہ بات ہے کہ یہ تصورات' اعمال اور ادارے دوسری تہذیبوں کی نسبت مغرب میں زیادہ حاوی ہیں۔ یہ خصوصیات مغربی تہذیب کی روح و رواں کا کم سے کم حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ خصوصیات مغربی ہیں تاہم مغرب کیلئے جدید نہیں ہیں۔ تاہم یہی خصوصیات ہیں جنہوں نے مغرب کو خود جدید ہونے اور دنیا کو جدید بنانے میں پیشرو کا کردار عطا کر دیا ہے۔

مغرب کو جواب اور جدیدیت

مغرب کی توسیع نے غیر مغربی معاشروں میں جدیدیت اور مغربیت ہر دو کو فروغ دیا ہے۔ ان معاشروں کے سیاسی اور دانشور لیڈر مغربی اثر کا جواب تین طرح سے دیتے ہیں: جدیدیت اور مغربیت کو رد کر کے، دونوں کو قبول کر کے، جدیدیت کو قبول کر کے اور مغربیت کو رد کر کے۔

استرداد

جاپان نے 1542ء سے انیسویں صدی کے وسط تک مغرب کو رد کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ جدیدیت کی محض محدود اشکال قابل قبول تھیں مثلاً بارودی ہتھیاروں کا حصول۔ اور مغربی ثقافت بشمول عیسائیت کی درآمد پر سخت پابندی تھی۔ سترہویں صدی کے وسط میں مغربیوں کو مکمل طور پر دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔ اس استردادی رویے کا خاتمہ 1854ء میں کموڈور پیری کی جاپان کی زبردستی کشادگی اور 1868ء کی میجی اصلاح کے تحت مغرب سے سیکھنے کی ڈرامائی کوششوں کے نتیجے میں رونما ہوا۔ چین میں بھی کئی صدیوں تک جدیدیت اور مغربیت پر زبردست پابندیاں عائد رہیں۔ اگرچہ 1601ء میں عیسائی مبلغین کو چین میں داخل ہونے کی اجازت تھی تاہم انہیں 1722ء میں چین بدر کر دیا گیا۔ جاپان کے برخلاف چین کی استردادی پالیسی کی جڑیں چین کے اپنے بارے میں مرکزی سلطنت کے تصور اور تمام دوسرے لوگوں پر چینی ثقافت کی برتری کے پختہ عقیدے میں ہیں۔ جاپانی علیٰحدگی کی طرح چینی علیٰحدگی کا خاتمہ بھی مغربی ہتھیاروں کے ذریعے ہوا جب 40-1839ء کے دوران میں برطانیہ نے چین پر جنگ افیون مسلط کر دی۔ ان مثالوں سے پتا چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے دوران میں مغربی طاقت نے غیر مغربی معاشروں کیلئے قطعی علیٰحدگی پسندانہ حکمت عملیوں کو اپنائے رکھنے میں پہلے دشواریاں کھڑی کیں اور آخر کار بالکل ناممکن بنا دیا۔

بیسویں صدی میں ذرائع نقل و حمل (ٹرانسپورٹیشن) اور ذرائع مواصلات میں ہونے والی پیش رفتوں نیز عالمی (گلوبل) انحصار باہمی نے علیٰحدگی کو گراں تر بنا دیا۔ ایک ایسی دنیا میں جو بہت زیادہ جدید اور باہمی طور پر انتہائی مربوط ہو گئی ہے سوائے کچھ چھوٹی، علیحدہ اور

دیہاتی برادریوں کے جو ایک ہی سطح پر زیست کرنا چاہتی ہوں جدیدیت اور مغربیت کا مکمل استرداد بہت زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ ڈینیل پائپس اسلام کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''صرف چند انتہائی بنیاد پرست جدیدیت اور مغربیت کو رد کرتے ہیں۔ وہ ٹیلی ویژنوں کو دریاؤں میں پھینکتے ہیں' کلائی کی گھڑیوں (رسٹ واچز) پر پابندی لگاتے ہیں اور انجنوں کے استعمال کو رد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے پروگرام کے ناقابل عمل ہونے نے ان گروپوں کی قبولیت کو بہت محدود کر دیا ہے اور کئی معاملوں میں' جیسے' سادات کے قاتل' مسجد نبوی پر حملہ کرنے والے اور کچھ ملائیشیائی ڈاکوہ گروپ...... متشددانہ کارروائیوں میں ان کی ناکامیوں نے انہیں صرف چند نشانات ہی چھوڑ کر معدوم کر دیا ہے۔'' بیسویں صدی کے اواخر میں مکمل طور پر استردادی پالیسیوں کا مقدر ہی یہ تھا کہ وہ محض چند نشانات چھوڑ کر معدوم ہو جائیں۔ ٹائن بی کے الفاظ میں جوش کوئی منطقی راستہ نہیں ہے۔

کمال ازم

مغرب کو دوسرا ممکنہ جواب ٹائن بی کی اصطلاح میں ''ہیروڈیئن ازم'' ہے یعنی جدیدیت اور مغربیت ہر دو کی قبولیت۔ اس جواب کی بنیاد ان مفروضوں پر ہے کہ جدیدیت ناگزیر اور ضروری ہے۔ مقامی ثقافت جدیدیت کے مقابلے میں پسماندہ ہے اور اس کو لازماً ترک یا ختم کر دیا جانا چاہئے اور جدیدیت کو کامیابی سے اپنانے کیلئے معاشرے کو پوری طرح مغربی ہونا چاہئے۔ جدیدیت اور مغربیت ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور ایک دوسرے کے نفاذ کی راہیں کشادہ کرتی ہیں۔ یہ سوچ انیسویں صدی کے جاپانی اور چینی دانشوروں کی اس دلیل سے واضح ہوتی ہے کہ جدید ہونے کیلئے ان کے معاشروں کو اپنی تاریخی زبانیں ترک کر دینی چاہئیں اور انگریزی کو بطور قومی زبان اپنا لینا چاہئے۔ اس میں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ یہ نظریہ مغربیوں سے زیادہ غیر مغربیوں کی اشرافیہ میں مقبول ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ'' کامیابی کیلئے تمہیں لازماً ہمارے جیسا ہونا چاہئے' ہمارا راستہ ہی واحد راستہ ہے۔'' دلیل یہ ہوتی ہے کہ'' ان (غیر مغربی) معاشروں کی مذہبی اقدار' اخلاقی مفروضے اور معاشرتی ساختیں' صنعت پذیری (انڈسٹریل ازم) کی اقدار اور اعمال کے مقابلے میں

اوپری اور بعض اوقات درشت ہوتی ہیں۔'' لہٰذا معاشی ترقی کیلئے ضروری ہو گا کہ ''معاشرے اور زندگی کو انقلابی انداز میں منہدم کر کے نئے سرے سے تشکیل دیا جائے اور خود وجود کے معانی کو بھی نئے سرے سے تعبیر کرنا ہوگا۔'' پائپس اسلام کے حوالے سے اس سے ملتے جلتے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے:

''اسلام کیلئے کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہے۔ **جدیدیت کے لیے مغربیت لازمی ہے**...... اسلام جدیدیت کا کوئی متبادل پیش نہیں کرتا ہے...... سیکولرازم سے گریز ممکن نہیں ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ اس فلسفیانہ طریقے کو اپنانا پڑتا ہے جو ان سے متصل ہے۔ اسی طرح سیاسی اداروں کا معاملہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوہر کیلئے عرض لازمی ہوتا ہے' اگر مغربی تہذیب سے کچھ سیکھنا ہو تو اس کے غلبہ و تسلط اور برتری کو بھی تسلیم کرنا ہو گا۔ یورپی زبانوں اور مغربی تعلیمی اداروں سے گریز ناممکن ہے گو کہ مؤخر الذکر آزاد فکری اور سہل زیست کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جب تک مسلم مغربی ماڈل کو واضح طور پر قبول نہیں کریں گے وہ نہ تو ٹیکنالوجی کے حامل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ترقی کر سکتے ہیں۔''

ان الفاظ کے تحریر کئے جانے سے ساٹھ برس پہلے مصطفیٰ کمال اتاترک انہیں نتائج پر پہنچ چکا تھا اور اس نے عثمانی سلطنت کے ملبے پر نئے ترکی کو تعمیر کیا اور اسے مغربی اور جدید بنانے کی وسیع کوششوں کا آغاز کیا۔ اس راستے پر گامزن ہو کر اور اسلامی ماضی کو رد کر کے اتاترک نے ترکی کو ایک ''کٹا پھٹا ملک'' بنا دیا۔ ایک ایسا معاشرہ جو مذہب' ورثے' رسم و رواج اور اداروں کے حوالے سے مسلم تھا لیکن اس کی حکمران اشرافیہ اس کو جدید' مغربی اور مغرب کے ہم پلہ بنانا چاہتی تھی۔ بیسویں صدی کے اواخر میں بہت سے ملکوں نے کمال ازم کا راستہ اپنایا ہے اور وہ غیر مغربی تشخص کی جگہ مغربی تشخص کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی کوششیں کا باب نمبر 6 میں تجزیہ کیا گیا ہے۔

اصلاح پسندی

استرداد مشتمل ہوتا ہے کسی معاشرے میں سکڑتی ہوئی جدید دنیا سے الگ تھگ کرنے کے ناامیدانہ عمل پر۔ کمال ازم شامل ہوتا ہے کسی صدیوں پرانی ثقافت کو تباہ کرنے کے دشوار اور

مصیبت طلب عمل پر اور اس کی جگہ کسی دوسری تہذیب سے در آمد کی گئی ثقافت کو رواج دینے پر۔ ایک تیسرا راستہ یہ ہے کہ معاشرے کی مقامی ثقافت کی مرکزی اقدار' اعمال اور اداروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جدیدیت کو اپنایا جائے۔ یہ راستہ غیر مغربی اشرافیہ میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہے۔ چین میں ''چنگ سلطنت'' کے آخری مرحلے میں نعرہ تھا'' کی یونگ'' یعنی ''چینی تعلیمات برائے بنیادی اصول' مغربی تعلیمات برائے عملی استعمال۔'' جاپان میں ''واکون' یوسی'' یعنی ''جاپانی روح' مغربی تکنیک'' مصر میں 1830ء کی دہائی میں محمد علی نے ''ضرورت سے زیادہ مغربیت سے بچتے ہوئے تکنیکی جدیدیت کی کوششیں کیں۔'' تاہم یہ کوششیں اس وقت ناکام ہو گئیں جب برطانیہ نے اس کو اپنی جدیدیت پر مبنی اصلاحات کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ علی ماذوری تبصرہ کرتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ''جاپان کی طرح مصر کی تکنیکی جدیدیت کا مقدر ثقافتی مغربیت کے بغیر ممکن نہیں تھا' نہ ہی اس کا مقدر اتاترک کی وضع کردہ ثقافتی مغربیت کے ذریعے تکنیکی جدیدیت کا حصول تھا۔'' تاہم انیسویں صدی کے اواخر میں جمال الدین افغانی' محمد عبدہٗ اور دوسرے اصلاح پسندوں نے اسلام اور جدیدیت کی مفاہمت کی کوششیں کیں۔ اس استدلال کے ساتھ کہ ''اسلام اور جدید سائنس اور مغربی فلسفہ و فکر کے بہترین اجزاء مشترک ہیں۔'' اور ''جدید سائنسی' تکنیکی یا سیاسی تصورات اور اداروں کی قبولیت کا اسلامی جواز'' پیش کیا۔ (اس میں دستوریت اور نمائندہ حکومت جیسے سیاسی تصورات شامل ہیں۔) یہ رجحان نصف صدی تک محیط رہا جس کا دورانیہ 1870ء سے 1920ء تک ہے پھر کمال ازم ظہور میں آیا جس کو بنیاد پرستی کی صورت میں خالص اصلاح پسندی نے دھندلا دیا۔

استرداد پسندی' کمال ازم اور اصلاح پسندی مختلف مفروضوں پر استوار ہیں کہ کیا ممکن ہے اور کیا مطلوب ہے۔ استرداد پسندی کیلئے جدیدیت اور مغربیت غیر مطلوب ہیں اور دونوں کا استرداد ممکن ہے۔ کمال ازم کیلئے جدیدیت اور مغربیت ہر دو مطلوب ہیں۔ مؤخر الذکر اس لئے کہ یہ اول الذکر کے حصول کیلئے ناگزیر ہے۔ دونوں کا حصول ممکن ہے۔ اصلاح پسندی کیلئے جدیدیت مغربیت کے بغیر مطلوب اور ممکن ہے مغربیت غیر مطلوب ہے لہٰذا کمال ازم اور استرداد پسندی میں جدیدیت اور مغربیت کی مطلوبیت اور غیر مطلوبیت

کے حوالے سے تنازع موجود ہے اور کمال ازم اور اصلاح پسندی میں یہ تنازع موجود ہے آیا مغربیت کے بغیر جدیدیت کو حاصل کیا جا سکتا ہے؟

واضح سی بات ہے کہ کوئی غیر مغربی معاشرہ ان تینوں سے مختلف کوئی اپنا ہی راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ مغربیت اور جدیدیت کا باہمی ربط بہت گہرا اور قریبی ہے۔ جیسے جیسے غیر مغربی معاشرے جدیدیت قبول کرنے کے راستے پر آہستہ آہستہ گامزن ہو رہے ہیں' مغربیت کی شرح گھٹ رہی ہے اور مقامی ثقافتوں کا احیا ہو رہا ہے۔ مزید جدیدیت مغربی اور غیر مغربی معاشروں میں تہذیبی توازن قوت کو بگاڑ دے گی اور مقامی ثقافتوں سے وابستگی مضبوط ہو جائے گی۔

تبدیلی کے ابتدائی مرحلے میں جدیدیت کو مغربیت فروغ دیتی ہے۔ بعد کے مرحلے میں جدیدیت عدم مغربیت کو فروغ دیتی ہے اور دو طریقوں سے مقامی ثقافت کا احیا کرتی ہے۔ معاشرے کی سطح پر جدیدیت معاشرے کی معاشی' فوجی اور سیاسی طاقت کو مجموعی طور پر بڑھا دیتی ہے اور اس معاشرے کے لوگوں میں اپنی ثقافت پر اعتماد کو بڑھا دیتی ہے نیز لوگ ثقافتی اعتبار سے فخر کرنے لگتے ہیں۔ انفرادی سطح پر جب روایتی بندھن اور سماجی رشتے ٹوٹتے ہیں اور تشخص کا بحران جنم لیتا ہے تو جدیدیت' بیگانگی اور اجنبیت کے احساسات کو پیدا کرتی ہے۔ اس کا حل مذہب پیش کرتا ہے۔

المختصر جدیدیت کا مطلب لازماً مغربیت نہیں ہے۔ غیر مغربی معاشرے جدید ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں اپنی ثقافت کو ترک کیے اور مغربی اقدار' اداروں اور اعمال کو مکمل طور پر اپنائے بغیر یہ تصور غلط ہے کہ مغربی تہذیب صیغۂ واحد میں صدیوں سے قائم دیگر تہذیبوں پر فتح پا گئی ہے۔ اس کے بجائے جدیدیت ان ثقافتوں کو مضبوط کرتی ہے اور مغرب کی نسبتی قوت کو گھٹاتی ہے۔ بنیادی حوالوں سے دنیا جدید زیادہ ہو رہی ہے اور مغربی کم۔

............☆☆☆............

دوسرا حصہ

تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن

باب 4

مغرب کا زوال: قوت واقتدار' ثقافت اور مقامیت

مغربی قوت واقتدار: برتری اور زوال

دوسری تہذیبوں کے تناظر میں مغرب کی قوت واقتدار کی دو تصویریں موجود ہیں۔ پہلی تصویر تو مغرب کی بھرپور فتح اور قریب قریب کامل برتری کی ہے۔ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ سے مغرب کی واحد مبارز (چیلنجر) قوت نابود ہو گئی ہے اور اس کے نتیجے میں دنیا بڑی مغربی قوموں کے اہداف' ترجیحات اور مفادات کے تناظر میں تشکیل پا رہی ہے اور تشکیل پائے گی' جس میں شاید جاپان ان قوموں کا ساتھ دے گا۔ جس طرح امریکہ واحد سپر پاور کی حیثیت میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر سیاسی اور سلامتی کے معاملات و مسائل پر فیصلے صادر کر رہا ہے اسی طرح معاشی حوالوں سے امریکہ' جاپان اور جرمنی کے ساتھ مل کر فیصلے کر رہا ہے۔ مغرب وہ واحد تہذیب ہے جو دوسری تہذیبوں اور علاقوں میں اپنے مفادات رکھتی ہے اور کسی دوسری تہذیب یا علاقے کی سیاست' معیشت اور سلامتی پر اثر انداز ہونے کی اہلیت و استعداد کی حامل ہے۔ دوسری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے معاشروں کو اپنے مفادات اور اہداف کے حصول اور تحفظ کیلئے عمومی طور پر مغربی اعانت کی ضرورت ہے۔ ایک مصنف نے اس صورتحال کا خلاصہ بیان کیا ہے کہ مغربی قومیں:

☆ بین الاقوامی بینکاری نظام کی مالک ہیں اور اس کو چلاتی ہیں۔

☆ تمام ہارڈ کرنسیوں کو کنٹرول کرتی ہیں۔

☆ دنیا کے بڑے گاہکوں میں شامل ہیں۔

☆ دنیا میں تیار شدہ اشیاء (فنشڈ گڈز) کی سب سے زیادہ فراہمی کرتی ہیں۔

☆ بین الاقوامی سرمائے کی منڈیوں پر حاوی ہیں۔

☆ کئی معاشروں میں قابل لحاظ اخلاقی لیڈر شپ کیلئے کوشاں ہیں۔

☆ وسیع پیمانے پر فوجی مداخلت کی استعداد رکھتی ہیں۔

☆ سمندری راستوں پر قبضہ رکھتی ہیں۔

☆ انتہائی ترقی یافتہ تحقیق کرواتی ہیں اور اس حوالے سے ارتقایافتہ ہیں۔

☆ جدید تکنیکی تعلیم میں رہنما کردار کی حامل ہیں۔

☆ خلا میں رسائی میں برتری رکھتی ہیں۔

☆ خلائی جہاز سازی کی صنعت میں برتر ہیں۔

☆ بین الاقوامی ذرائع مواصلات میں برتر ہیں۔

☆ ہائی ٹیک ہتھیار سازی کی صنعت میں برتر ہیں۔

مغرب کی دوسری تصویر بالکل مختلف ہے۔ یہ تصویر ایک زوال پاتی ہوئی تہذیب کی ہے۔ دوسری تہذیبوں کے تناظر میں عالمی' سیاسی' معاشی اور فوجی طاقت میں اس کا حصہ کم ہو رہا ہے۔ سرد جنگ میں مغرب کی جیت نے فتح کے مزے نہیں بلکہ تھکن کو جنم دیا ہے۔ مغرب داخلی طور پر تیزی سے مسائل اور حاجات کا شکار ہو رہا ہے مثلاً یہ سست معاشی پیداوار' جمود کی شکار آبادیوں' بیروزگاری' بڑے حکومتی خساروں' کام کی اخلاقیات کے زوال' بچتوں کی کم شرحوں کا سامنا کر رہا ہے نیز بہت سے ملک بشمول امریکہ معاشرتی انتشار' منشیات اور جرائم سے دوچار ہیں۔ معاشی طاقت تیزی سے مشرقی ایشیا کو منتقل ہو رہی ہے اور فوجی طاقت اور سیاسی اثر و رسوخ بھی ہاتھ سے جانا شروع ہو گئے ہیں۔ ہندوستان معاشی ترقی کے آسمان میں پرواز کرنے ہی والا ہے اور اسلامی دنیا مغرب کیلئے درشت ہے۔ دوسرے معاشروں کی مغرب کی ہدایات اور احکامات کی پابندی کرنے میں رضامندی ختم ہو رہی ہے'

نیز اسی طرح مغرب کا اعتماد اور برتری کا ارادہ کافور ہو رہا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر نے دیکھا کہ امریکہ کے حوالے سے زوالی مفروضے پر بہت زور و شور سے بحث مباحثہ ہوا۔ 1990ء کی دہائی کے وسط میں اسی نتیجے کو اخذ کرنے والا ایک متوازن تجزیہ سامنے آیا:

کئی اہم حوالوں سے امریکہ کی نسبتی قوت و اقتدار کو تیزی سے زوال آئے گا۔ خام معاشی اہلیتوں کے حوالے سے امریکہ کے جاپان اور آخر کار چین کے ساتھ تعلقات مزید بگڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ فوجی حوالے سے امریکہ اور بہت سی ابھرتی ہوئی علاقائی طاقتوں (ممکنہ طور پر ایران' ہندوستان اور چین) کے درمیان مؤثر استعدادوں کا توازن مرکز سے محیط کی طرف تبدیل ہو جائے گا۔ امریکہ کی ساختیاتی طاقت کا کچھ حصہ دوسری قوموں کو منتقل ہو جائے گا (اور اسی طرح اس کی سافٹ پاور کا کچھ حصہ بھی) ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔

دنیا میں مغرب کے مقام کو واضح کرنے والی ان دونوں تصویروں میں سے کون سی حقیقت کو بیان کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب بہرکیف یہ ہے کہ دونوں تصویریں حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ مغرب اب بھی برتر و حاوی ہے اور اکیسویں صدی میں بھی طاقت اور اثر و رسوخ کے حوالے سے پہلے نمبر پر رہے گا۔ تاہم تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں بتدریج' بے رحمانہ اور بنیادی تبدیلیاں بھی واقع ہو رہی ہیں نیز دوسری تہذیبوں کے تناظر میں مغرب کی طاقت میں زوال جاری رہے گا۔ جیسے ہی مغرب کی برتری ختم ہو گی اس کی بہت زیادہ طاقت تو معدوم ہو جائے گی اور باقی کئی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں میں منتقل ہو جائے گی۔ ایشیائی تہذیبوں کی طاقت میں اہم اضافہ ہو رہا ہے اور مزید ہو گا۔ عالمی (گلوبل) اثر و رسوخ کے حوالے سے چین ایک ایسے معاشرے کی حیثیت میں بتدریج ابھر رہا ہے جو مغرب کو چیلنج کر سکتا ہے۔ تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں تبدیلیاں غیر مغربی معاشروں میں اپنی ثقافت کے احیا اور اثبات کی طرف لے جا رہی ہیں اور لے جائیں گی نیز مغربی ثقافت کی بڑھتی ہوئی عدم قبولیت کی طرف۔

مغرب کے زوال کی تین اہم خصوصیات ہیں:

اول

یہ ایک سست رفتار عمل ہے۔ مغربی طاقت کو ابھرنے میں چار سو برس لگے تھے۔ اس کی پسپائی بھی اتنی ہی طویل ہو سکتی ہے۔ 1980ء کی دہائی میں ممتاز برطانوی عالم ہیڈلے بل نے لکھا تھا ''آفاقی بین الاقوامی معاشرے پر یورپ یا مغرب کی برتری 1990ء کی دہائی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔'' سپنگلر کی پہلی جلد 1918ء میں سامنے آئی تھی اور ''مغرب کا زوال'' بیسویں صدی کی تاریخ کا مرکزی خیال بن گیا تھا۔ یہ عمل صدی بھر پر محیط ہو گیا۔ تاہم قیاس ہے کہ یہ تیز ہو سکتا تھا۔

دوم

زوال کبھی خط مستقیم میں رونما نہیں ہوتا ہے۔ مغربی کمزوری کے عیاں ہونے کے بعد مغربی طاقت کے زوال میں وقفے، واپسی اور دوبارہ استحکام رونما ہوتا رہا ہے۔ مغرب کے کھلے جمہوری معاشروں میں احیا کی عظیم استعدادیں موجود ہیں۔ مزید یہ کہ دیگر کئی تہذیبوں کے برعکس مغرب کی طاقت کے دو مراکز رہے ہیں۔ جس زوال کا مشاہدہ بل نے 1900ء سے کیا ہے وہ مغربی تہذیب کے یورپی حصے کا زوال ہے۔ 1910ء سے 1945ء تک یورپ اپنے ہی خلاف بٹا رہا اور داخلی، معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل میں الجھا رہا تاہم 1940ء کی دہائی میں مغربی بالادستی کا امریکی مرحلہ شروع ہوا اور 1945ء میں امریکہ کو دنیا پر ویسی ہی برتری حاصل ہو گئی جیسی 1918ء میں متحدہ طاقتوں کو حاصل تھی۔ عالمی جنگ کے بعد کی نوآبادیات ختم ہونے سے یورپی قوت مزید گھٹی لیکن امریکہ کی نہیں جس نے روایتی علاقائی شہنشاہی کی جگہ ایک نئی اقوام گیر (ٹرانس نیشنل) استعماریت کے متبادل کو پیش کیا۔ تاہم سرد جنگ کے دوران میں امریکہ کی فوجی طاقت کا جوڑ سوویت فوجی طاقت کے روپ میں موجود تھا اور امریکی معاشی طاقت جاپان کے تناظر میں زوال پا گئی۔ تاہم فوجی اور معاشی احیا کی کوششیں وقفے وقفے سے ہوتی رہیں۔

سوم

طاقت کسی فرد یا گروپ کی وہ استعداد ہے جو دوسرے فرد یا گروپ کے رویے کو تبدیل کر دیتی ہے۔ کسی گروپ یا ریاست کی طاقت کا اندازہ عمومی طور پر اس کے ان ذرائع اور وسائل کو ماپ کر لگایا جا سکتا ہے جو وہ اپنے مخالف گروپوں یا ریاستوں کو متاثر کرنے کیلئے رکھتی ہے۔ طاقت کے اہم وسائل میں مغرب کا حصہ بیشتر' گو سارا نہیں' بیسویں صدی میں لپیٹ دیا گیا اور تب زوال ان تہذیبوں کی نسبت سے رونما ہونے لگا۔

علاقہ اور آبادی

1490ء میں مغربی معاشرے بلقان کے علاوہ جزیرہ نمائے یورپ کے بیشتر حصے پر قابض تھے یا اغلباً کرۂ ارض کے 52.5 ملین مربع میل میں سے (انٹارکیٹکا کو نکال کر) 1.5 مربع میل پر قابض تھے۔ 1920ء میں اپنی علاقائی توسیع کے عروج پر پہنچ کر مغرب براہ راست 25.5 ملین مربع میل یا لگ بھگ زمین کے نصف پر قابض تھا۔ 1993ء میں یہ قبضہ گھٹ کر 12.7 ملین مربع میل رہ گیا۔ مغرب واپس ہو کر اپنے یورپی مرکز اور شمالی امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک محدود ہو گیا۔ اس کے برعکس آزاد مسلم معاشروں کے علاقے میں اضافہ 1920ء کے 1.8 ملین مربع میل سے 1993ء کے 11 ملین مربع میل تک پہنچ گیا۔ اسی طرح کی تبدیلیاں آبادیوں پر کنٹرول میں رونما ہوئی ہیں۔ 1900ء میں مغربیوں کا دنیا کی آبادی میں حصہ اندازاً 30 فیصد تھا اور مغربی حکومتیں اس وقت اس آبادی کے 45 فیصد پر حکمران تھیں اور 1920ء میں 48 فیصد پر۔ 1993ء میں سوائے ہانگ کانگ کے مغربی حکومتیں سوائے مغربیوں کے کسی پر بھی حکومت نہیں کرتی تھیں۔ مغربی انسانیت کا صرف 13 فیصد ہیں اور اگلی صدی کے شروع میں کم ہو کر 11 فیصد رہ جائیں گے اور 2025ء میں 10 فیصد۔ 1993ء میں مغرب آبادی کے حوالے سے دنیا میں چینی' اسلامی اور ہندو تہذیبوں کے بعد چوتھے نمبر پر تھا۔

مقداری حوالے سے مغربی لوگ دنیا کی آبادی کی کم ہوتی ہوئی اقلیت ہیں۔ معیاری

حوالے سے بھی مغرب اور دوسری آبادیوں کے درمیان توازن بدل رہا ہے۔ غیر مغربی لوگ زیادہ صحت مند' زیادہ شہری' زیادہ تعلیم یافتہ' زیادہ باشعور ہوتے جا رہے ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں لاطینی امریکہ' افریقہ' مشرق وسطیٰ' جنوبی ایشیا' مشرقی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح تیس برس پہلے کی شرح 1/3 سے کم ہو کر 1/2 رہ گئی۔ زندگی کا متوقع دورانیہ بھی ان علاقوں میں خاصا بڑھ گیا ہے یعنی افریقہ میں 11 سال سے لے کر مشرقی ایشیا میں 23 سال تک پہنچ گیا ہے۔ 1960ء کی دہائی کے شروع میں تیسری دنیا میں بالغوں کی تعلیم کا تناسب کل آبادی کا ایک تہائی تھا۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں افریقہ کے علاوہ کوئی ملک ایسا نہیں تھا جس کی نصف آبادی پڑھی لکھی نہ ہو۔ لگ بھگ 50 فیصد ہندوستانی اور 75 فیصد چینی لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ 1970ء میں ترقی پذیر ملکوں میں لٹریسی ریٹ (شرح خواندگی) ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں اوسطاً 41 فیصد تھا۔ 1992ء میں ان کا اوسط 71 فیصد ہو گیا۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں' سوائے افریقہ کے' ہر ایج گروپ کے نام مکمل طور پر پرائمری تعلیم میں درج تھے۔ خواندگی' تعلیم اور شہریت میں ان تبدیلیوں نے زیادہ صلاحیت کی حامل معاشرتی طور پر بیدار و متحرک اور زیادہ توقعات رکھنے والی آبادیوں کو پیدا کیا ہے جنہیں ان طریقوں سے سیاسی مقاصد کیلئے ابھارا جاسکتا ہے جن طریقوں سے ناخواندہ کسانوں کو نہیں ابھارا جا سکتا۔ معاشرتی طور پر متحرک و بیدار معاشرے زیادہ طاقتور معاشرے ہوتے ہیں۔ 1953ء میں جب ایرانیوں کا 15 فیصد خواندہ تھا اور 17 فیصد سے کم شہری تھا تو روز ویلٹ اور سی آئی اے کے چند کارپردازان بغاوت کو آسانی سے دبا سکتے تھے اور شاہ کو تخت پر دوبارہ بٹھا سکتے تھے۔ بہ نسبت 1979ء کے جب ایرانیوں کا 50 فیصد خواندہ تھا اور 47 فیصد شہروں میں رہتا تھا تو امریکی فوجی طاقت شاہ کو تخت نشین نہیں رکھ سکتی تھی۔ اب بھی ایک بڑا خلا مغربیوں' جاپانیوں اور روسیوں اور چینیوں' ہندوستانیوں' عربوں اور افریقیوں کو الگ الگ کرتا ہے تاہم یہ خلا تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ عین اسی اثنا میں' ایک اور خلا پیدا ہو رہا ہے۔ مغربیوں' جاپانیوں اور روسیوں کی اوسط عمریں بڑھ رہی ہیں اور پیداواری طور پر برسر روزگار لوگوں پر بوجھ بڑھ رہا ہے۔ دوسری۔

تہذیبوں میں بچوں کا بوجھ زیادہ ہے لیکن بچے تو مستقبل کے محنت کش (ورکر) اور فوجی ہوتے ہیں۔

معاشی پیداوار

1920ء کی دہائی میں عالمی معاشی پیداوار میں مغرب کا حصہ عروج پر تھا اور دوسری عالمی جنگ کے بعد سے واضح طور پر کم ہوا ہے۔ 1750ء میں دنیا کی تیار شدہ مصنوعات میں چینیوں کا حصہ لگ بھگ ایک تہائی' ہندوستانیوں کا لگ بھگ ایک چوتھائی اور مغربیوں کا پانچویں حصے سے کم تھا۔ 1830ء میں مغرب چین سے تھوڑا اوپر ہو گیا۔ اگلے عشروں میں بقول پال بائروک مغرب کی صنعت پذیری نے باقی دنیا کی عدم صنعت پذیری کی راہ کشادہ کی۔ 1913ء میں غیر مغربی ملکوں کی تیار شدہ مصنوعات 1800ء کی نسبت اندازاً دو تہائی رہ گئیں۔ انیسویں صدی میں شروع ہو کر مغربی حصہ ڈرامائی طور پر بڑھا 1928ء میں عروج کو پہنچ کر دنیا کی تیار شدہ مصنوعات کا 84.2 فیصد ہو گیا۔ بعدازاں مغرب کا حصہ کم ہو گیا جبکہ اس کی شرح پیداوار تو معتدل رہی تاہم کم صنعت پذیر ملکوں نے اپنی پیداوار کو دوسری عالمی جنگ کے بعد تیزی سے بڑھایا۔ 1980ء میں مغرب عالمی تیار شدہ مصنوعات میں 57.8 کا حصہ دار تھا۔ اندازاً یہ وہ حصہ ہے جو وہ 120 سال قبل 1860ء کی دہائی میں رکھتا تھا۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے کی معاشی پیداوار کا قابل اعتماد ڈیٹا (اعداد و شمار) دستیاب نہیں ہے۔ تاہم 1950ء میں مغرب دنیا کی خام پیداوار میں اندازاً 64 فیصد کا حصہ دار تھا 1980ء میں یہ تناسب 49 فیصد تک کم ہو گیا۔ ایک اندازے کے مطابق 2013ء میں مغرب عالمی پیداوار میں صرف 30 فیصد کا حصہ دار ہو گا۔ ایک اور اندازے کے مطابق 1991ء میں دنیا کی سات سب سے بڑی معیشتوں میں سے چار غیر مغربی تھیں یعنی جاپان (دوسرے نمبر پر)' چین (تیسرے)' روس (چھٹے) اور ہندوستان (ساتویں)۔ 1992ء میں امریکہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت کا حامل تھا اور دوسری دس چوٹی کی معیشتوں میں پانچ مغربی تھیں اور پانچ غیر مغربی یعنی چین' جاپان' ہندوستان' روس اور برازیل۔ 2020ء

میں پانچ چوٹی کی معیشتیں پانچ مختلف تہذیبوں میں ہوں گی اور دس چوٹی کی معیشتوں میں صرف تین مغربی ملکوں میں ہوں گی۔ مغرب کا نسبتی زوال بڑی حد تک مشرقی ایشیا کے تیز رفتار عروج کے باعث واقع ہوا ہے۔

معاشی پیداوار کے خام اعداد و شمار مغرب کی معیاری، کیفیتی برتری کو قدرے دھندلا پیش کرتے ہیں۔ مغرب اور جاپان قریباً مکمل طور پر ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی کی صنعتوں پر حاوی ہیں۔ تاہم ٹیکنالوجیاں پھیل رہی ہیں اور اگر مغرب اپنی بالادستی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اس پھیلاؤ کو روکنے کیلئے جو کچھ وہ کر سکتا ہے اسے کرنا پڑے گا۔ تاہم مغرب ہی کی وضع کردہ باہم مربوط و منسلک دنیا کا شکریہ کہ دوسری تہذیبوں میں ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کی رفتار کو سست کرنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اس عمل کو سرد جنگ کی طرح کے خطرے کی عدم موجودگی نے بھی بڑھایا ہے، جس نے ٹیکنالوجی کے کنٹرول کو مؤثر بنا دیا تھا۔

یہ قرین قیاس دکھائی دیتا ہے کہ تاریخ کے بیشتر حصے میں چین دنیا کی سب سے بڑی معیشت رہا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ اور غیر مغربی معاشروں کی معاشی ترقی اب تاریخی تانے بانے کی واپسی کو پیدا کر رہی ہے۔ یہ ایک سست رفتار عمل ہو گا لیکن اگر اس سے پہلے نہیں تو بیسویں صدی کے وسط میں دنیا کی بڑی تہذیبوں میں معاشی پیداوار کی تقسیم اور تیار شدہ پیداوار 1800ء کے مشابہ ہے۔ دنیا کی معیشت پر مغرب کی دو سو سالہ برتری اب ختم ہو گئی ہے۔

فوجی استعداد

فوجی قوت کی چار جہتیں ہوتی ہیں۔ 1 مقداری...... فوجیوں کی تعداد، ہتھیاروں، آلات اور وسائل کی تعداد، 2 ٹیکنالوجیکل...... ہتھیاروں اور آلات کی بہتری اور اثر پذیری، 3 تنظیمی...... فوجیوں کا ربط و اتحاد، ڈسپلن، تربیت اور مورال نیز کمانڈ اور کنٹرول کے رشتوں کا مؤثر ہونا اور 4 معاشرتی...... معاشرے کا فوجی قوت کو مؤثر طور پر بڑھانے میں راضی ہونا اور اس کی استعداد رکھنا۔ 1920ء کی دہائی میں مغرب ان سب جہتوں میں ہر کسی سے بہت

آگے تھا۔ اس کے بعد کے برسوں میں دوسری تہذیبوں کے تناظر میں مغرب کی فوجی طاقت میں زوال رونما ہوا ہے۔ جدیدیت اور معاشی ترقی ریاستوں میں وسائل اور خواہش پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنی فوجی استعداد کو بڑھائیں اور کچھ ریاستیں ایسا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ 1930ء کی دہائی میں جاپان اور سوویت یونین نے بہت طاقتور افواج تخلیق کی تھیں جیسا کہ انہوں نے دوسری عالمی جنگ میں مظاہرہ کر کے دکھا دیا۔ سرد جنگ کے دوران میں سوویت یونین کے پاس دنیا کی دو سب سے طاقتور افواج میں سے ایک تھیں۔ اس وقت مغرب دنیا میں کسی بھی جگہ بھرپور روایتی فوجی یلغار کی استعداد میں اجارہ داری رکھتا ہے۔ وہ اپنی اس استعداد کو برقرار رکھتا ہے کہ نہیں' یہ غیر یقینی ہے تاہم یہ منطقی طور پر یقینی دکھائی پڑتا ہے۔ اس لئے کہ آنے والے عشروں میں کوئی غیر مغربی ریاست یا ریاستوں کا گروپ اس کے مقابل استعداد پیدا نہیں کر سکے گا۔

مجموعی طور پر سرد جنگ کے بعد کے برسوں میں عالمی فوجی استعدادوں میں ارتقا کے حوالے سے پانچ بڑے رجحانات حاوی رہے:

اول

سوویت یونین کی مسلح افواج سوویت یونین کے ختم ہوتے ہی ختم ہو گئیں۔ روس کے علاوہ' صرف یوکرائن کے پاس ہی بھرپور فوجی استعدادیں ہیں۔ روسی فوجیں بہت بڑی تعداد میں کم کی گئی ہیں اور وسطی یورپ اور بالٹک ریاستوں سے انہیں پیچھے ہٹا لیا گیا ہے۔ وارسا پیکٹ (معاہدۂ وارسا) ختم ہو گیا ہے۔ امریکی بحریہ کو چیلنج کرنے کا ہدف ترک کر دیا گیا ہے۔ فوجی آلات کو یا تو ضائع کر دیا گیا ہے یا انہیں تباہ ہونے کیلئے پھینک دیا گیا ہے اور بیکار کر دیا گیا ہے۔ بجٹ میں دفاع کیلئے مختص رقوم میں بہت زیادہ کمی کر دی گئی ہے۔ افسروں اور فوجیوں میں مورال گر گیا ہے۔ اسی اثناء میں روسی فوج اپنے مشنوں کا دوبارہ تعین کر رہی ہے اور روسیوں کو تحفظ فراہم کرنے اور ہمسائے میں موجود علاقائی تنازعوں سے نمٹنے کیلئے اپنی تشکیل نو کر رہی ہے۔

دوم

روس کی فوجی استعدادوں میں واضح کمی سے مغربی فوجی اخراجات' افواج اور استعدادوں میں آہستہ رفتار سے مگر اہم زوال پیدا ہوا ہے۔ امریکی فوجی اخراجات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سرد جنگ کے مقابلے میں فوجوں میں کمی کر دی گئی ہے۔ کل فوجی 2.1 ملین سے گھٹ کر 1.4 ملین رہ گئے ہیں۔ ہتھیاروں کی خریداری میں بھی بہت زیادہ کمی ہوئی ہے۔ 1980ء کی دہائی کے آغاز سے برطانیہ' جرمنی اور قدرے کم درجے میں فرانس اپنے فوجی اخراجات اور استعدادوں میں ایسی ہی کمی کر رہے ہیں۔

سوم

مشرقی ایشیا کے رجحانات روس اور مغرب کے رجحانات سے مختلف ہیں۔ بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات اور افواج میں اضافہ رواج بن گیا ہے۔ چین اس سلسلے میں دوسروں کیلئے مثال ہے۔ چینی معاشی ترقی اور فوج سازی میں اضافے سے دوسری مشرقی ایشیائی قومیں بھی اپنی فوجوں کو جدید بنا رہی ہیں اور انہیں بڑھا رہی ہیں۔ جاپان اپنی انتہائی جدید فوجی استعدادوں کو مسلسل بڑھا رہا ہے۔ تائیوان' جنوبی کوریا' تھائی لینڈ' ملائیشیا' سنگاپور اور انڈونیشیا سب کے سب اپنی فوجوں پر زیادہ خرچ کر رہے ہیں اور روس' امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی اور دوسرے ملکوں سے ہوائی جہاز' ٹینک اور بحری جہاز خرید رہے ہیں۔ جہاں 1985ء اور 1993ء کے درمیان میں ناٹو کے فوجی اخراجات کم ہوئے ہیں وہاں مشرقی ایشیائی ملکوں کے فوجی اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

چہارم

فوجی استعدادیں بشمول وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کے' دنیا بھر میں پھیل رہی ہیں۔ جیسے ہی ملک معاشی حوالے سے ترقی پاتے ہیں' وہ ہتھیار سازی کی اہلیت پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً 1960ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی کے دوران میں تیسری

دنیا میں لڑاکا ہوائی جہاز بنانے والے ملکوں کی تعداد ایک سے بڑھ کر آٹھ ہو گئی' ٹینک بنانے والے ملک ایک سے چھ ہو گئے' ہیلی کاپٹر ایک سے چھ اور ٹیکٹیکل میزائل بنانے والے صفر سے سات ہو گئے۔ 1990ء کی دہائی میں دفاعی صنعت میں عالمیت (گلوبلائزیشن) واقع ہوئی جو آگے چل کر مغربی فوجی برتری کو ختم کر کے رکھ دے گی۔ بہت سے غیر مغربی معاشرے یا تو نیوکلیائی ہتھیار رکھتے ہیں (روس' چین' اسرائیل' ہندوستان' پاکستان اور ممکنہ طور پر شمالی کوریا) یا پھر انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں (ایران' عراق' لیبیا اور ممکنہ طور پر الجیریا) یا پھر ضرورت محسوس کرتے ہوئے خود کو انہیں حاصل کرنے کی حالت میں لا رہے ہیں (جاپان)۔

پنجم

ان سب پیش رفتوں نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں فوجی حکمت عملی اور قوت کے مرکزی رجحان کو علاقائی بنا دیا ہے۔ علاقائیت نے روس اور مغرب کو افواج میں کمی کی راہ سجھائی ہے جبکہ دوسری ریاستوں کو فوجی طاقت میں اضافے کا جواز فراہم کیا ہے۔ روس مزید عالمی فوجی استعداد نہیں رکھتا ہے لیکن وہ اپنے ہمسایوں کے حوالے سے اپنی حکمت عملی اور فوجی قوت کو مرتکز کر رہا ہے۔ چین اپنی حکمت عملی اور قوتوں کو مقامی اقتدار بڑھانے اور مشرقی ایشیا میں چینی مفادات کے دفاع کیلئے نئے سرے سے کمر باندھ چکا ہے۔ اسی طرح یورپی ملک ناٹو اور یورپی یونین کے ذریعے اپنی قوتوں کی جہت متعین کر رہے ہیں تاکہ مغربی یورپ کے محیط پر عدم استحکام سے نمٹ سکیں۔ امریکہ نے عالمی سطح پر سوویت یونین کو روکنے اور اس سے لڑنے کی اپنی فوجی منصوبہ بندی میں واضح طور پر تبدیلی کر کے علاقائی جھگڑوں سے نمٹنے کیلئے تیاری شروع کر دی ہے یعنی خلیج فارس اور شمال مشرقی ایشیا میں۔ تاہم امریکہ ان اہداف کو پانے کیلئے فوجی استعدادیں نہیں رکھتا ہے۔ عراق کو شکست دینے کیلئے امریکہ نے اپنے فعال ٹیکٹیکل ہوائی جہازوں میں سے 75 فیصد' جدید جنگی ٹینکوں میں سے 42 فیصد' ہوائی جہاز برداروں میں سے 46 فیصد' اپنے فوجی جوانوں میں سے 37 فیصد اور

اپنے بحری فوجیوں میں سے 46 فیصد خلیج فارس میں صف آرا کئے تھے۔ مستقبل میں فوجوں میں نمایاں کمی کے بعد امریکہ مغربی نصف کرے سے باہر علاقائی طاقتوں کے خلاف ایک یا دو سے زیادہ مرتبہ یلغار نہیں کر سکے گا۔ ساری دنیا میں فوجی سلامتی کا انحصار قوت کی عالمی تقسیم اور سپر پاوروں کے اقدامات پر نہیں بلکہ دنیا کے ہر علاقے کے اندر قوت کی تقسیم اور تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے اقدامات پر بڑھ رہا ہے۔

مختصر یہ کہ مجموعی طور پر مغرب اکیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں سب سے زیادہ طاقتور تہذیب رہے گا۔ اس کے بعد سائنسی ٹیلنٹ' تحقیق اور استعدادوں کی ترقی کے حوالے سے ممکن ہے وہ اپنی برتری برقرار رکھے نیز غیر فوجی (سویلین) اور فوجی ٹیکنالوجیکل ایجادات میں۔ تاہم طاقت کے دوسرے سرچشموں پر کنٹرول تیزی سے غیر مغربی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں یا نمایاں ملکوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ ان سرچشموں (وسائل) پر مغرب کا کنٹرول 1920ء کی دہائی میں عروج پر تھا اور اس کے بعد سے بے قاعدگی سے لیکن خاص اہمیت کا حامل زوال رونما ہو رہا ہے۔ 2020ء میں یعنی اپنے عروج کے سو سال بعد مغرب دنیا کے 24 فیصد حصے پر قابض ہوگا (49 فیصد سے ہوگا یہ زوال)' دنیا کی کل آبادی کے 10 فیصد (یہ کمی 48 فیصد سے رونما ہوگی) قیاساً 20-15 فیصد معاشرتی طور پر متحرک و بیدار آبادی' دنیا کی معاشی پیداوار کا 30 فیصد (70 فیصد کی چوٹی سے کم ہوگا) قیاساً 25 فیصد تیار شدہ مصنوعات کا (48 فیصد سے کم ہوگا) اور عالمی فوجی افرادی قوت کا 10 فیصد سے کم۔

1919ء میں وڈرو ولسن' لائیڈ جارج اور جارج کلیمینسیو مل کر حقیقت میں دنیا کو کنٹرول کرتے تھے۔ پیرس میں بیٹھ کر فیصلہ کرتے تھے کہ کون سے ملکوں کو باقی رہنا ہے اور کون سے ملکوں کو نہیں' کون سے نئے ملک تخلیق کئے جائیں گے اور ان کی سرحدیں کون سی ہوں گی اور ان پر کون حکومت کرے گا نیز مشرق وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے حصوں کو فاتح طاقتیں کس طرح آپس میں تقسیم کریں گی۔ وہ یہ بھی فیصلہ کرتے تھے کہ روس کے اندر فوجی مداخلت کرنی ہے اور چین سے تجارتی رعایتیں واپس لے لینی ہیں۔ ایک سو سال بعد سیاستدانوں کا کوئی چھوٹا گروپ اس نوع کی قوت و اختیار استعمال کرنے کی اہلیت نہیں رکھے گا۔ اگر کوئی

ایسا گروپ ہوا بھی تو اس میں تین مغربی شامل نہیں ہوں گے بلکہ دنیا کی سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے لیڈر شامل ہوں گے ریگن، تھیچر، متراں اور کوہل کے جانشین ہوں گے ڈینگ ژیاؤ پنگ، ناکاسونے، اندرا گاندھی، یلسن، خمینی اور سوہارتو۔ مغربی برتری کا عہد ختم ہو جائے گا۔ اسی دوران میں مغرب کا زوال اور دوسرے طاقت کے مراکز کا عروج عالمی مقامیت کے عمل اور غیر مغربی ثقافتوں کے احیا کو فروغ دے گا۔

مقامیت: غیر مغربی ثقافتوں کا احیا

دنیا میں ثقافتوں کی تقسیم طاقت کی تقسیم کی عکاسی کرتی ہے۔ تجارت ہو سکتا ہے پرچم کی پیروی کرتی ہو یا نہیں لیکن ثقافت قریباً ہمیشہ طاقت کی پیروی کرتی ہے۔ ساری تاریخ کے دوران میں ایک تہذیب کی قوت کی توسیع کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر اس کی ثقافت بھی پھلی پھولی ہے نیز ہمیشہ ہی اس قوت کے ذریعے اپنی اقدار، اعمال اور ادارے دوسرے معاشروں میں پھیلانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ایک آفاقی تہذیب کیلئے آفاقی قوت ضروری ہے۔ رومی طاقت نے کلاسیکی دنیا کی حدود میں ایک آفاقی کے قریب تہذیب کو تخلیق کیا تھا۔ انیسویں صدی میں یورپی طاقت نے نوآبادیت (کالونیئل ازم) کی صورت میں اور بیسویں صدی میں امریکی اجارہ داری نے مغربی ثقافت کو بیشتر معاصر دنیا میں پھیلا دیا۔ یورپی نوآبادیت ختم ہو گئی۔ امریکی اجارہ داری محدود ہو گئی۔ مغربی ثقافت بھی اس کے ساتھ ہی مٹنے لگی جبکہ مقامی، تاریخی جڑیں نمایاں ہونے لگیں، زبانیں، عقیدے اور ادارے اپنا اثبات کروانے لگے۔ غیر مغربی معاشروں کی بڑھتی ہوئی طاقت جو جدیدیت سے پیدا ہوئی ہے، وہ ساری دنیا میں غیر مغربی ثقافتوں کا احیا کر رہی ہے۔

جوزف نائی کا کہنا ہے کہ "ہارڈ پاور" یعنی ایسی طاقت جو کہ معاشی اور فوجی قوت پر گرفت رکھتی ہو اور "سافٹ پاور" یعنی ایسی طاقت جو اپنی ثقافت اور نظریے کے بل پر دوسرے ملکوں کو وہ چاہنے پر مجبور کرے جو وہ چاہتی ہے" کے درمیان ایک فرق موجود ہے جیسا کہ نائی نے تسلیم کیا ہے کہ دنیا میں ہارڈ پاور میں ایک وسیع پھیلاؤ عمل میں آرہا ہے اور

بڑی قومیں ''ماضی کے مقابلے میں اب اپنی طاقت کو اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرنے میں دشواریاں محسوس کر رہی ہیں۔'' نائی مزید لکھتا ہے کہ اگر کسی ریاست کی ثقافت اور نظریہ پرکشش ہے تو دوسرے ''اس کی لیڈر شپ'' کی پیروی کرنے کیلئے مزید راضی ہوں گے اور اسی لئے سافٹ پاور ''اسی طرح اہم ہے جس طرح کہ ہارڈ کمانڈ پاور اہم ہے۔'' تاہم ثقافت اور نظریے کو کیا چیز پرکشش بناتی ہے؟ وہ تب پرکشش بنتے ہیں جب ان کی جڑیں ہارڈ پاور میں ہوں۔ معاشی اور فوجی ہارڈ پاور میں اضافے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ثقافت یا سافٹ پاور میں خود اعتمادی، فخر اور برتری کے احساس کو پیدا کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں میں اس کیلئے بہت زیادہ کشش پیدا کر دیتے ہیں۔ معاشی اور فوجی طاقت میں زوال خود پر شک (بے اعتمادی)، تشخص کے بحران اور دوسری ثقافتوں میں معاشی، فوجی اور سیاسی کامیابی کی چابیوں کی تلاش کو جنم دیتا ہے۔ جیسے جیسے غیر مغربی معاشرے اپنی معاشی، فوجی اور سیاسی طاقت بڑھائیں گے وہ اپنی اقدار، اداروں اور ثقافت کی خوبیوں کے زیادہ گن گائیں گے۔ 1950ء کی دہائی اور 1960ء کی دہائی میں کمیونسٹ نظریہ اس لئے دنیا بھر کے لوگوں کو کھینچتا تھا کہ وہ سوویت یونین کی معاشی کامیابی اور فوجی قوت سے جڑا ہوا تھا۔ یہ کشش اس وقت ختم ہو گئی جب سوویت معیشت جمود کا شکار ہوئی اور سوویت فوجی قوت کو برقرار رکھنے کی اہل نہیں رہی۔ مغربی اقدار اور ادارے دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اس لئے پرکشش لگتے رہے ہیں کہ وہ مغربی طاقت اور دولت کے سرچشمے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عمل صدیوں تک جاری رہا۔ بقول ولیم میک نیل 1000ء سے 1300ء کے درمیان عیسائیت، رومی قانون اور مغربی ثقافت کے دوسرے عناصر کو ہنگرین، پولز اور لتھوینیائیوں نے قبول کیا اور ''مغربی تہذیب کی یہ قبولیت مغربی شہزادوں کی فوجی قوتوں کے خوف اور ستائش کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔'' جیسے ہی مغربی طاقت کو زوال آئے گا تو مغرب کی دوسری تہذیبوں پر انسانی حقوق، لبرل ازم اور جمہوریت جیسے مغربی تصورات نافذ کرنے کی اہلیت میں بھی زوال آئے گا اور ایسا ہی زوال ان قدروں کی دوسری تہذیبوں کیلئے کشش میں ہوگا۔

ایسا پہلے ہی ہو چکا ہے۔ غیر مغربی لوگ کئی صدیوں سے معاشی خوشحالی' ٹیکنالوجیکل ترقی' فوجی طاقت اور سیاسی استحکام کے حوالے سے مغربی معاشروں سے حسد کرتے ہیں۔ وہ اس کامیابی کا راز مغربی اقدار اور اداروں میں پاتے ہیں اور جب وہ اس کلید کے حوالے سے ایسا سوچتے ہیں تو وہ اسے اپنے معاشروں میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امیر اور طاقتور بننے کیلئے انہیں مغرب جیسا بنا ہوگا۔ تاہم اب یہ کمال پسندانہ رجحانات مشرقی ایشیا میں غائب ہو گئے ہیں۔ مشرقی ایشیائی اپنی ڈرامائی معاشی ترقی کو مغربی ثقافت کی درآمد نہیں بلکہ اپنی ثقافت سے انسلاک کی مرہون منت قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ وہ اس لئے کامیاب ہو رہے ہیں کہ وہ مغرب سے مختلف ہیں۔ اسی طرح جب غیر مغربی معاشرے محسوس کرتے ہیں کہ مغرب کے تناظر میں وہ کمزور ہیں تو خود انحصاری' لبرل ازم' جمہوریت اور آزادی کی مغربی اقدار کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ اب جبکہ وہ زیادہ عرصہ کمزور نہیں رہیں گے بلکہ رفتہ رفتہ طاقتور ہو رہے ہیں تو وہ انہی اقدار کو تنقید کا نشانہ بنانے سے نہیں ہچکچاتے ہیں جنہیں وہ پہلے اپنے مفادات کے حصول کیلئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ مغرب کے خلاف بغاوت درحقیقت مغربی اقدار کی آفاقیت کو تسلیم کرنے کے مصداق تھا اب غیر مغربی اقدار کی برتری کو تسلیم کرنا جائز ہو گیا ہے۔

اس قسم کے رجحانات کا ظہور رونالڈ ڈورے کے الفاظ میں ''دوسری نسل کی مقامیت کے مظہر'' کا ظہور ہے۔ سابق مغربی نوآبادیات اور آزاد ملکوں جیسے چین اور جاپان ہر دو میں ''پہلی' جدید'' یا ''بعد آزادی'' نسل نے غیر ملکی (مغربی) یونیورسٹیوں سے مغربی کاسموپولیٹن زبان میں تربیت حاصل کی تھی۔ چونکہ وہ ٹین ایج میں پہلی بار سمندر پار گئے تھے اس لئے انہوں نے مغربی اقدار اور طرز زندگی سے گہرے اثرات قبول کئے۔ اس کے برعکس کہیں زیادہ بڑی دوسری نسل کی اکثریت نے پہلی نسل کی بنائی ہوئی ملکی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ نیز نوآبادیاتی زبان کے بجائے مقامی زبان ان کی تعلیم کیلئے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ ان یونیورسٹیوں نے ''عالمی میٹرو پولیٹن ثقافت کے ساتھ زیادہ کمزور تعلق پیدا کیا ہے۔'' اور ''علم کو عمومی طور پر محدود اور کمزور تراجموں کے ذریعے مقامی بنالیا گیا

ہے۔'' ان یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ پہلی مغربی تربیت یافتہ نسل سے ناراض ہیں اور اسی لئے ''مقامیت پسند حزب اختلاف کی تحریکوں کی اپیلوں پر کان دھرتے ہیں۔'' جیسے جیسے مغربی اثر کم ہو رہا ہے ویسے ویسے نوجوان لیڈر طاقت اور دولت کے حصول کیلئے مغرب کی طرف سے نظریں پھیر رہے ہیں۔ انہیں کامیابی کے ذرائع اپنے ہی معاشرے میں ڈھونڈنے ہیں اور اسی لئے انہیں اس معاشرے کی ثقافت اور اقدار کو نبھانا ہوگا۔

مقامیت کے عمل کو دوسری نسل کا انتظار کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ پہلی نسل کے اہل' ذہین اور قبول کرنے پر آمادہ لیڈر ہی خود کو مقامی بنا لیتے ہیں۔ تین نمایاں مثالیں ہیں محمد علی جناحؒ' ہیری لی اور سولومن بندرانائیکے۔ وہ آکسفورڈ' کیمبرج اور لنکن ان (LINCOLN'S INN) کے ذہین ترین گریجوایٹ تھے' اسی طرح زبردست قانون دان تھے اور اپنے اپنے معاشروں کی کلی طور پر مغربی بن چکی اشرافیہ کے رکن تھے۔ جناحؒ ایک پختہ (Committed) سیکولرسٹ تھے' لی ایک برطانوی وزیر کے الفاظ میں ''سوئز کے مشرق میں بہترین بلڈی (نسلی) برطانوی تھا۔'' بندرانائیکے تو تھا ہی عیسائی۔ تاہم آزادی کیلئے اور آزادی کے بعد انہیں اپنی قوموں کی لیڈری کیلئے مقامی بننا پڑا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی ثقافت کی طرف پلٹے اور اس عمل کے دوران میں وقت پڑنے پر انہوں نے اپنی شناختیں' نام' لباس اور عقائد بدلے۔ برطانوی قانون دان محمد علی جناحؒ پاکستان کے قائداعظم بن گئے۔ ہیری لی کوان یو بن گیا۔ سیکولرسٹ جناحؒ پاکستانی ریاست کی بنیاد کے طور پر اسلام کے پرجوش حامی بن گئے۔ برطانیہ زدہ لی نے مینڈرین سیکھی اور کنیفوشس ازم کا سرگرم مبلغ بن گیا۔ عیسائی بندرانائیکے نے بدھ مت قبول کر لیا اور سنہالی قوم پرستی اختیار کی۔

مقامیت 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے دوران میں دنیا بھر میں غیر مغربی معاشروں کا روزمرہ کا چلن بن گئی ہے۔ اسلامی معاشروں میں اسلام کا احیا اور ''دوبارہ اسلامی بننا'' مرکزی ۔لات ہیں۔ ہندوستان میں مغربی صورتوں اور اقدار کو رد کرنے اور سیاست اور معاشرے کو ''ہندو بنانے'' کا رجحان غالب ہے۔ مشرقی ایشیا میں حکومتیں

کنفیوشس ازم کو فروغ دے رہی ہیں اور سیاسی اور دانشور لیڈر اپنے ملکوں کی ''ایشیائیت'' پر زور دے رہے ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں جاپان ''نی ہون جن رون یا جاپان اور جاپانی کے نظریئے'' کے خبط میں مبتلا ہو گیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ روس دوبارہ ایک ''کٹا پھٹا'' ملک بن گیا ہے اور مغرب پسندوں اور سلاوو فائلوں کے درمیان کلاسیکی کشمکش پھر نمودار ہو گئی ہے۔ تاہم ایک دہائی سے اول الذکر سے مؤخر الذکر کی طرف رجحان زیادہ ہو گیا ہے کہ مغرب پسند گورباچوف نے یلسن کو راہ دے دی ہے جو طرز میں روسی' عقائد میں مغربی ہے مگر جس کو ان قوم پرستوں سے خطرہ ہے جو روسی آرتھوڈوکس مقامیت کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

مقامیت کو جمہوریت کے پیراڈاکس سے بھی فروغ ملتا ہے۔ غیر مغربی معاشروں کے مغربی جمہوری اداروں کو قبول کرنے سے مقامیت پسند اور مغرب دشمن تحریکوں کی حوصلہ افزائی اور اقتدار تک رسائی ہوئی ہے۔ 1960ء کی دہائی اور 1970ء کی دہائی میں ترقی پذیر ملکوں کی مغرب کی حامی اور مغربیت زدہ حکومتوں کو بغاوتوں اور انقلابوں سے خطرہ ہوتا تھا۔ 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی میں اب انہیں انتخابات کے ذریعے اقتدار سے بے دخلی کے خطرے کا سامنا ہے۔ جمہوریت پذیری جدیدیت سے تنازعے میں ہے اور جمہوریت وراثتی طور پر کاسمو پولیٹن پذیری کا نہیں بلکہ محدودیت کا عمل ہوتی ہے۔ غیر مغربی معاشروں کے سیاستدان مغربی بن کر انتخابات نہیں جیت سکتے ہیں بلکہ انہیں اس کیلئے زیادہ عوامی مطالبات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جو کہ عمومی طور پر نسلی' قوم پرستانہ اور مذہبی ہوتے ہیں۔

اس کا نتیجہ نکلا ہے مغرب سے تعلیم حاصل کرنے والی اور مغرب اساس اشرافیہ کے خلاف عوامی تحریک۔ اسلامی بنیاد پرست گروپوں نے مسلم ملکوں میں منعقد ہونے والے انتخابات میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور الجیریا میں تو اقتدار میں آ گئے ہوتے اگر فوج 1992ء کے انتخابات کو ردنہ کر دیتی۔ ہندوستان میں انتخابی حمایت کیلئے فرقہ وارانہ نعروں اور فرقہ وارانہ تشدد کو فروغ ملا ہے۔ سری لنکا میں جمہوریت نے 1956ء میں سری لنکا فریڈم پارٹی کو اس اہل بنایا کہ وہ مغرب اساس' اشرافی' یونائیٹڈ نیشنل پارٹی کو اقتدار

سے نکال باہر کرے اور 1980ء کی دہائی میں پاٹھیکا چنتا نایا کو سنہالی قوم پرستی کی تحریک کو ابھارنے کے قابل بنایا۔ 1949ء سے پہلے مغربی اور جنوبی افریقی ہر دو اشرافیہ جنوبی افریقہ کو مغربی ریاست کے طور پر دیکھتے تھے۔ نسل کشی کے عہد حکومت کے بعد مغربی اشرافیہ نے رفتہ رفتہ جنوبی افریقہ کو مغربی کیمپ سے باہر پایا جبکہ سفید فام جنوبی افریقی خود کو مغربی کے طور پر تصور کر رہے ہیں۔ تاہم مغربی بین الاقوامی نظام میں اپنے مقام کو دوبارہ پانے کیلئے انہیں مغربی جمہوری ادارے متعارف کروانا ہوں گے جو انتہائی مغرب زدہ سیاہ فام اشرافیہ کو اقتدار میں لانے پر منتج ہو سکتے ہیں تاہم اگر دوسری نسل کی مقامیت کا عامل بروئے عمل آتا ہے تو ان کے جانشین زوسا' زولو اور صورت شکل سے افریقی نظر آنے والے ہوں گے اور جنوبی افریقہ خود کو ایک افریقی ریاست کے طور پر زیادہ پہچان کروانے لگے گا۔

انیسویں صدی سے پہلے بہت مرتبہ بازنطینی' عرب' چینی' عثمانی' مغل اور روسی مغرب کے مقابلے میں اپنی طاقت اور کارناموں پر بہت زیادہ پر اعتماد تھے۔ ان زمانوں میں وہ مغرب کو اس کی ثقافتی کمتری' ادارہ جاتی پسماندگی' کرپشن او زوال پر ہدف ملامت بناتے تھے۔ جونہی مغرب کی کامیابی کو زوال آئے گا یہ رجحانات دوبارہ ظاہر ہو جائیں گے۔ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ''وہ مزید اسے اختیار نہیں کر سکتے۔'' ایران اس کی نمایاں مثال ہے لیکن ایک مبصر کہتا ہے کہ ''ملائیشیا' انڈونیشیا' سنگاپور' چین اور جاپان میں مغربی اقدار کو رد تو کیا گیا ہے مگر زیادہ سختی سے نہیں۔'' ہم مغربی نظریات کے زیر تسلط ''ترقی کے عہد کا اختتام'' دیکھ رہے ہیں اور ایک ایسے عہد کو نمودار ہوتا دیکھ رہے ہیں جس میں مختلف اور بہت سی تہذیبیں ایک ساتھ موجود ہوں گی' ایک دوسرے سے تعامل کریں گے' باہمی مقابلہ کریں گی اور ایک دوسرے کے ساتھ نبھا کریں گی۔ مقامیت کا یہ عالمی عمل دنیا کے بہت سے حصوں میں مذہب کے احیا میں ظہور پذیر ہوا ہے نیز زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایشیائی اور اسلامی ملکوں میں ثقافتی احیا کی صورت میں نمایاں ہوا ہے جو کہ ان ملکوں کی معاشی اور آبادیاتی حرکیات کا نتیجہ ہے۔

خدا کی واپسی

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دانشور اشرافیہ کا عمومی طور پر یہ مفروضہ تھا کہ معاشی اور سماجی جدیدیت انسانی وجود کے ایک اہم عامل کے طور پر مذہب کو ختم کر دے گی۔ اس مفروضے کو اس رجحان کو خوش آمدید کہنے والوں اور دریافت کرنے والوں ہر دو نے پیش کیا تھا۔ جدید سیکولرسٹوں نے اس بات کو سراہا کہ سائنس، منطقیت اور عملیت پسندی نے توہمات، اساطیر، غیر عقلیت پسندیوں اور رسوم کو مٹا دیا ہے جو کہ زندہ مذاہب کی روح تھے۔ ابھرتا ہوا معاشرہ رواداری، عقلی، عملیت پسند، ترقی پسند، انسان دوست اور سیکولر ہوگا۔ دوسری طرف پریشان کنزرویٹو (روایت پسند) مذہبی عقائد، مذہبی اداروں اور مذہب کی انسانی رویوں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر فراہم کرنے والی اخلاقی رہنمائی کے فقدان کے برے نتائج سے خبردار کرتے رہے۔ حتمی نتیجہ ہوگا انارکی، محرومی، تہذیبی زندگی کی جڑوں کا کٹنا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا ''اگر تم خدا نہیں رکھو گے (اور وہ ایک حاسد خدا ہے) تو تمہیں ہٹلر یا سٹالن (جیسے زمینی خداؤں) کی تعظیم کرنا پڑے گی۔''

بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے ثابت کر دیا کہ یہ امیدیں اور خوف غلط تھے۔ معاشی اور سماجی جدیدیت عالم گیر ہوگئی اور اسی اثنا میں مذہب کا ایک عالمی (گلوبل) احیا رونما ہوا۔ گلز کیپل نے اس احیا کو ''خدا کی واپسی'' کی اصطلاح میں بیان کیا ہے، یہ ہر براعظم میں چھا چکا ہے، ہر تہذیب پر حاوی ہو گیا ہے اور درحقیقت ہر ہر ملک پر غالب آ چکا ہے۔ 1970ء کی دہائی کے وسط میں کیپل نے تبصرہ کیا تھا کہ سیکولر پذیری کا رجحان اور سیکولرازم سے مذہب کی مصالحت کا رجحان واپس جا چکا ہے۔ ایک نئی مذہبی سوچ صورت پذیر ہوگی، معاشرے کی مقدس بنیادوں کو بحال کرتے ہوئے سیکولر اقدار کو اپنانے کا مقصد تادیر نہیں رہے گا۔ خدا سے دوری کی وجہ سے جدیدیت بہت سی ناکامیوں اور پسپائیوں سے دوچار ہوتی ہوئی ناکام ہوگئی ہے۔

مذاہب کے اس احیا میں چند مذاہب کی توسیع بھی شامل ہے، جس میں انہوں نے ان

معاشروں میں نئے لوگ بھرتی کئے جہاں پہلے ان کو ماننے والے موجود نہیں تھے۔ تاہم زیادہ وسیع تناظر میں احیائے مذہب روایتی مذہبی برادریوں کو نئی صورت دینے کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ عیسائیت' اسلام' یہودیت' ہندومت' بدھ مت' آرتھوڈوکسی سب مذاہب کے پیروکار سابقہ عمومی ایمان کے بجائے وابستگی' تعلق اور عمل میں زیادہ متحرک ہو رہے ہیں۔ ان سب مذاہب میں بنیاد پرستانہ تحریکیں ابھری ہیں جو مذہبی عقائد کے مطابق ذاتی' سماجی اور پبلک رویوں اور اداروں کو عسکری قوت کے ذریعے خالص بنانا چاہتی ہیں تاہم یہ سب بیسویں صدی کے آخر پر ابھرنے والی اس بنیادی مذہبی لہر کی محض سطح پر ہی ہیں جو انسانی زندگی کو ایک مختلف رخ دینا چاہتی ہے۔ عالم گیر مذہبی احیا بنیاد پرستوں کی سرگرمیوں سے کہیں بالاتر امر ہے۔ ہر ہر معاشرے میں یہ روزمرہ کی زندگی اور لوگوں کے کاموں اور حکومتوں کے منصوبوں اور پراجیکٹوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ بن رہا ہے۔ سیکولر کنفیوشسی ثقافت میں ثقافتی ابھار ایشیائی اقدار کے اثبات کی صورت اپنا رہا ہے لیکن باقی دنیا میں مذہبی اقدار کے اثبات میں خود کو ظاہر کر رہا ہے۔ جیسا کہ جارج ویگل نے تبصرہ کیا ہے کہ "دنیا کی سیکولر پذیری بیسویں صدی کے اواخر میں غالب معاشرتی حقائق میں سے ایک ہے۔"

سابق کمیونسٹ ریاستوں میں مذہب کا احیا ڈرامائی طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔ نظریے کے انہدام سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرتے ہوئے البانیہ سے ویتنام تک مذہبی احیا چھا چکے ہیں۔ روس میں آرتھوڈوکسی میں ایک زبردست احیا رونما ہوا ہے۔ 1944ء میں 30 فیصد روسیوں نے جن کی عمریں 25 سال سے کم تھیں' بتایا کہ وہ دہریت سے خدا پرستی کی طرف لوٹے ہیں۔ 1988ء میں ماسکو اور اس کے گردونواح میں چرچوں کی تعداد 50 تھی جو 1993ء میں 250 ہو گئی۔ سیاسی لیڈر مذہب کا احترام کرنے لگے اور حکومت اس کی حمایت کرنے لگی۔ 1993ء میں ایک مشاہدہ کرنے والے نے رپورٹ دی کہ روسی شہروں میں "گرجوں کی گھنٹیوں کی صداؤں سے فضا معمور ہے۔ تازہ چمکائے گئے گنبد دھوپ میں دمک رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں چرچ ملبوں پر پوری شان و شوکت کے ساتھ بحال ہو گئے ہیں۔ شہر میں سب سے پررونق جگہ چرچ ہوتے ہیں۔" سلاوک جمہوریاؤں میں

آرتھوڈوکسی کے احیا کے ساتھ ہی وسطی ایشیا میں اسلامی احیا چھا گیا ہے۔ 1989ء میں وسطی ایشیا میں 160 فعال مساجد اور ایک مدرسہ تھا' 1993ء کے شروع میں 10000 مساجد اور 10 مدرسے قائم ہو چکے تھے جبکہ اس احیا میں کچھ بنیاد پرست سیاسی تحریکیں شامل تھیں اور بیرونی ملکوں سعودی عرب' ایران اور پاکستان نے انہیں بڑھاوا دیا۔ بنیادی طور پر یہ ایک وسیع البنیاد مرکزی دھارے کی ثقافتی تحریک تھی۔

اس عالمی مذہبی احیا کو کس طرح واضح کیا جا سکتا ہے؟ الگ الگ ملکوں اور تہذیبوں میں مخصوص وجوہات اس احیا کا باعث ہیں۔ تاہم ایسی توقع کرنا غلط ہے کہ بڑی تعداد میں مختلف وجوہات دنیا کے بیشتر علاقوں میں ایک سے نتائج کو جنم دے سکتی ہیں۔ ایک عالمی مظہر کو عالمی وضاحت درکار ہوتی ہے۔ گو مخصوص ملکوں میں بہت سے واقعات' منفرد عوامل سے متاثر ہوئے ہوں گے تاہم کچھ عمومی وجوہات لازماً موجود رہی ہوں گی۔ وہ وجوہات کون سی ہیں؟

عالمی مذہبی احیا کی سب سے زیادہ واضح' سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ طاقتور وجہ وہی ہے جو کہ مذہب کی موت کا بھی باعث بنی تھی یعنی سماجی' معاشی اور ثقافتی جدیدیت کے عمل' جنہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ساری دنیا کو احاطہ کر لیا تھا۔ تشخص کے مدتوں سے قائم سرچشمے اور نظام ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ لوگ دیہاتوں سے شہروں میں منتقل ہو گئے' اپنی جڑوں سے الگ ہو گئے اور نئے روزگار اپنانے لگے یا بیروزگار ہو گئے۔ وہ بڑی تعداد میں اجنبیوں سے تعامل کرنے لگے اور نئے رشتوں سے واقف ہوئے۔ انہیں تشخص کے نئے سرچشموں' مستحکم برادری کی نئی صورتوں اور نئے اخلاقی تصورات کی ضرورت پڑی تاکہ انہیں مقصد اور معنی کا احساس میسر آ سکے۔ مذہب' خواہ بنیاد پرستانہ خواہ مرکزی دھارے کا' ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ جیسا کہ لی کوان یو نے مشرقی ایشیا کے حوالے سے واضح کیا:

> ''ہمارے معاشرے زرعی ہیں جو دو یا تین نسلوں بعد صنعتی ہو جائیں گے۔
> مغرب میں جو کچھ دو سو برس یا اس سے زیادہ مدت میں واقع ہوا ہمارے

ہاں لگ بھگ پچاس برس یا اس سے کم میں واقع ہو رہا ہے۔ اگر تم تیز رفتاری سے ترقی کرنے والے ملکوں کا مشاہدہ کرو یعنی کوریا' تھائی لینڈ' ہانگ کانگ اور سنگاپور...... تو تمہیں وہاں ایک نمایاں مظہر دکھائی دے گا...... آباؤ اجداد کی پرستش' شامان ازم...... جو زیادہ طمانیت بخش نہیں ہے۔ وہاں انسان کے مقصد کے حوالے سے اعلیٰ وضاحتوں کی تلاش موجود ہے' ہم یہاں کیوں ہیں؟ اس کا انسلاک معاشرے کے بڑے تناؤ والے مرحلوں سے ہے۔''

لوگ محض عقل کے سہارے نہیں جیتے ہیں۔ لوگ جب تک اپنی ذات (SELF) کو متعین نہیں کر لیتے وہ اپنے ذاتی مفاد کے حصول کیلئے حساب کتاب کے ساتھ اور عقلی طور پر جدوجہد نہیں کر سکتے۔ تیز رفتار سماجی تبدیلی کے زمانوں میں مستحکم شناختیں معدوم ہو گئیں۔ ذات (SELF) کو لازماً متعین کرنا ہو گا اور نئی شناختیں تخلیق کرنا ہوں گی۔ ان لوگوں کیلئے جو اس سوال کا سامنا کر رہے ہیں کہ میں کون ہوں؟ میرا تعلق کہاں سے ہے؟ مذہب بھرپور جواب فراہم کرتا ہے اور مذہبی گروپ ان چھوٹی سماجی برادریوں کے متبادل ہیں جو شہری بننے میں کھوئی گئی ہیں۔ جیسا کہ حسن الترابی نے کہا ہے تمام مذاہب ''لوگوں کو شناخت اور زندگی کی سمت عطا کرتے ہیں۔'' اس عمل میں لوگ تاریخی شناختوں کو دوبارہ دریافت کرتے ہیں یا انہیں تخلیق کر لیتے ہیں۔ ان کے آفاق گیر اہداف جو ہوں سو ہوں مذاہب لوگوں کو صاحب عقیدہ اور بے عقیدہ کے امتیاز میں تشخص عطا کر دیتے ہیں۔ ایک اعلیٰ داخلی گروپ اور دوسرا مختلف اور کمتر خارجی گروپ۔

برنارڈ لیوس کہتا ہے کہ مسلم دنیا میں ''ہنگامی حالات میں ان مسلموں میں جو اپنی بنیادی شناخت اور مذہبی برادری میں وابستگی کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسلام کی متعین کردہ اکائی میں شناخت اور وابستگی چاہتے ہیں نہ کہ کسی نسلی یا علاقائی معیار سے۔'' گلز کیپل اسی طرح تشخص کی تلاش کی مرکزیت کو نمایاں کرتا ہے ''نیچے سے دوبارہ اسلامی بننے کا عمل ایک ایسی دنیا میں ایک تشخص کی تعمیر نو کا واحد اور اہم ترین ذریعہ ہے جو کہ

اپنا معنیٰ کھو چکی ہے اور بیگانہ و اجنبی اور بے شکل ہو گئی ہے۔" ہندوستان میں جدیدیت کے پیدا کردہ تناؤ (ٹینشن) اور بیگانگی سے نجات پانے کیلئے "ایک نئی ہندو شناخت تشکیل پا رہی ہے۔" روس میں مذہبی احیا نتیجہ ہے "تشخص کی جذباتی آرزو کا' جو صرف آرتھوڈوکس چرچ' روس کے ہزار سالہ ماضی سے اٹوٹ بندھن ہی مہیا کر سکتا ہے۔" جبکہ اسلامی جمہوریاؤں میں "ماسکو کی کئی عشروں تک دبائی گئی شناختوں کے اثبات کی وسطی ایشیائیوں کی انتہائی طاقتور آرزو" نے اسی نوع کا احیا پیدا کیا ہے۔ خاص طور پر بنیاد پرستانہ تحریکیں "انتشار کے تجربے' تشخص کے زیاں' جدید معاشرتی اور سیاسی تانوں بانوں کے تیز رفتار تعارف سے پیدا ہونے والی سماجی ساختوں' سیکولر ازم' سائنسی کلچر اور معاشی ترقی کو معنی اور تحفظ دینے کیلئے" وجود میں آئی ہیں۔ ولیم ایچ میک نیل کی رائے ہے کہ "نئی انسانی ضروریات کا جواب فراہم کرنے کیلئے مذہبی بنیاد پرستی کی تحریکیں نمودار ہوئی ہیں۔...... یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ یہ تحریکیں ان ملکوں میں پیدا ہوئی ہیں جن کی آبادی زیادہ تر قدیمی دیہاتی انداز میں زندگی بسر کرتی ہے اور زمین پر آبادی کا دباؤ انہیں ایسا کرنا ناممکن بنا دیتا ہے نیز جہاں شہری اساس مواصلات عامہ' دیہاتوں میں سرایت کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کے قدیمی ڈھانچے کو تباہ کر رہی ہے۔" زیادہ وسیع مفہوم میں دنیا بھر میں مذہبی احیا ردعمل ہے سیکولر ازم' اخلاقی اضافیت اور ذاتی شمولیت کا اور نظام' ڈسپلن' کام' تعاون باہمی اور انسانی اخوت کی اقدار کی تائید نو ہے۔ مذہبی گروپ ان سماجی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں جنہیں ریاست کے بیورو کریٹ چھوڑ جاتے ہیں۔ ان میں شامل ہیں طبی امداد اور ہسپتال کی خدمات' کنڈر گارٹن اور سکول' بوڑھوں کی دیکھ بھال' قدرتی او دوسرے حادثوں میں بھرپور امداد و اعانت اور معاشی سختیوں کے دنوں میں بہبود اور سماجی امداد۔ نظام اور شہری معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ نے خلا پیدا کر دیئے ہیں جنہیں مذہبی' اکثر بنیاد پرست گروپ پر کرتے ہیں۔

اگر روایتی طور پر غالب مذاہب بے جڑ لوگوں کو جذباتی اور اخلاقی ضروریات پوری کرنے میں مدد نہیں دیتے ہیں تو دوسرے مذہبی گروپ ایسا کرنے کیلئے سامنے آ جاتے ہیں اور اس عمل کے دوران میں اپنی رکنیت اور سماجی اور سیاسی زندگی میں مذہب کی اہمیت کو

بڑھاتے ہیں۔ تاریخی طور پر جنوبی کوریا ایک اکثریتی بدھ ملک تھا۔ جس میں عیسائی کل آبادی کا ایک سے تین فیصد تھے۔ جونہی جنوبی کوریا معاشی ترقی کے میدان میں آگے بڑھا تو وسیع پیمانے پر شہر پذیری اور پیشوں میں اختلاف سامنے آئے۔ ''لاکھوں لوگ جو شہروں میں منتقل ہو گئے اور بہت سے وہ لوگ جو دیہاتوں میں رہ گئے تھے ان کے لیے کوریا کے زرعی عہد کا بدھ مت اپنی کشش کھو بیٹھا۔ عیسائیت نے الجھن (کنفیوژن) اور تبدیلی کے دور میں شخصی نجات اور انفرادی مقدر کے پیغام کے ساتھ ایک یقینی سہولت پیش کر دی۔'' 1980ء کی دہائی میں عیسائی' زیادہ تر پریسبائٹیرین اور کیتھولک جنوبی کوریا کی کل آبادی کا 30 فیصد ہو گئے تھے۔

اسی طرح کی متوازی تبدیلی لاطینی امریکہ میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ پروٹسٹنٹ لاطینی امریکہ میں 1960ء کی اندازاً ستر لاکھ کی تعداد سے زیادہ ہو کر 1990ء میں 5 کروڑ ہو گئے۔ 1989ء میں لاطینی امریکہ کے کیتھولک بشپوں نے تسلیم کر لیا کہ اس کی وجوہات میں ''شہری زندگی کی ضروریات سے نمٹنے میں کیتھولک چرچوں کا تساہل'' شامل ہے۔ نیز ''اس کی ساخت میں آج کے زمانے کے لوگوں کی نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہلیت کا نہ ہونا۔'' ایک برازیلی تبصرہ نگار پادری نے لکھا ہے کہ کیتھولک چرچ کے برعکس پروٹسٹنٹ چرچ کسی شخص کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں— انسانی گرم جوشی' شفا بخشی' ایک روحانی تجربہ۔'' لاطینی امریکہ کے غریبوں میں پروٹسٹنٹ ازم کا پھیلاؤ بنیادی طور پر ایک مذہب کی جگہ کسی دوسرے مذہب کا لے لینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو مذہبی وابستگی میں اور نام کے اور مفعول و مجہول قنوطیت پسند کیتھولکوں کے بجائے فعال اور سرگرم ایونجلکوں کی حیثیت میں کردار ادا کرنے کے عمل میں واضح اضافہ ہے۔ مثال کے طور پر 1990ء کی دہائی کی ابتدا میں برازیل میں آبادی کا 20 فیصد خود کو پروٹسٹنٹ کے طور پر اور 73 فیصد کیتھولک کے طور پر شناخت کرواتا تھا تاہم اتوار کے دن پروٹسٹنٹ چرچوں میں 20 ملین اور کیتھولک چرچوں میں لگ بھگ 12 ملین لوگ حاضری دیتے تھے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب کے مانند عیسائیت بھی جدیدیت کے حوالے سے احیا کے عمل سے گزر رہی ہے اور

لاطینی امریکہ میں یہ کیتھولک کے بجائے پروٹسٹنٹ روپ اختیار کر رہی ہے۔

جنوبی کوریا اور لاطینی امریکہ میں ان تبدیلیوں سے واضح ہوتا ہے کہ بدھ مت اور رواجی کیتھولک ازم جدیدیت کے پیدا کئے ہوئے مسئلوں میں گرفتار لوگوں کی نفسیاتی' جذباتی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی مذہبی وابستگی میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں ان کا دارومدار اسی معاملے پر ہے کہ مروجہ مذہب ان ضروریات کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ کنیفوشس ازم اپنے جذباتی ڈھیلے پن کی وجہ سے کشش سے محروم ہو گیا ہے۔ کنیفوشسی ملکوں میں پروٹسٹنٹ ازم اور کیتھولک ازم اسی طرح سے جگہ بنا سکتے ہیں جس طرح لاطینی امریکیوں کیلئے ایونجیلکل پروٹسٹنٹ ازم' جنوبی کوریائیوں کیلئے عیسائیت اور مسلمانوں اور ہندوؤں کیلئے بنیاد پرستی۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں جیسے چین میں معاشی پیداوار اپنے عروج کو پہنچی ویسے ہی عیسائیت بھی پھیلی ''خصوصاً نوجوانوں میں۔'' قریباً 50 ملین چینی عیسائی ہیں۔ چینی حکومت ان کے اضافے کو روکنے کیلئے منسٹروں' مبلغوں اور ایوانجلسٹوں کو جیلوں میں ڈال دیتی ہے۔ مذہبی تقریبات اور سرگرمیوں پر پابندی لگاتی ہے اور 1994ء میں تو ایک قانون منظور کیا گیا ہے جس کے مطابق غیر ملکیوں کے مذہبی سکول قائم کرنے پر امتناع عائد کر دیا گیا ہے نیز مذہبی گروپوں کی آزادانہ یا بیرون ملک سے مالی امداد حاصل کر کے سرگرمیوں پر قدغن لگا دی گئی ہے۔ چین کی طرح سنگاپور کی آبادی کا لگ بھگ پانچ فیصد عیسائی ہے۔ 1980ء کی دہائی کے آخر اور 1990ء کی دہائی کے آغاز میں وزرائے حکومت نے ایوانجلسٹوں کو خبردار کیا کہ وہ ملک کے ''خوبصورت مذہبی توازن'' کو خراب کرنے سے باز رہیں۔ حکومت نے کیتھولک تنظیموں کے اہلکاروں سمیت مذہبی کارکنوں کو حراست میں لے لیا اور عیسائی گروپوں اور افراد کو مختلف طریقوں سے ہراساں کیا گیا۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سابق سوویت آرتھوڈوکس جمہوریاؤں میں سیاسی آزادی کے ساتھ ہی مغربی چرچ نئے سرے سے ابھرنے والے آرتھوڈوکس چرچوں سے مقابلہ کرتے ہوئے حرکت میں آ گئے ہیں۔ یہاں بھی چین کی طرح ان کے مذہب تبدیل کروانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

جیسے ہی آرتھوڈوکس چرچ نے نمود کی روسی پارلیمان نے 1993ء میں ایک قانون کا مسودہ منظور کیا جس کے تحت غیر ملکی مذہبی گروپوں پر ریاست سے باقاعدہ اجازت حاصل کرنے یا تبلیغی اور تدریسی کاموں کی انجام دہی کیلئے کسی مقامی مذہبی گروپ سے انسلاک کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ تاہم صدر یلسن نے اس کو باقاعدہ قانون کا درجہ دینے کیلئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ مجموعی طور پر ریکارڈ تو یہ بتاتا ہے کہ جہاں کہیں وہ الجھتے ہیں ''خدا کی واپسی'' مقامیت کا راگ الاپتی ہے۔ اگر لوگوں کی جدیدیت کے حوالے سے مذہبی ضروریات کو ان کے روایتی عقائد پورا نہیں کر پاتے تو وہ جذباتی طور پر مذہبی درآمدات سے طمانیت پانے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

جدیدیت کی نفسیاتی' جذباتی اور معاشرتی اذیتوں کے علاوہ مذہبی احیا کے محرکات میں مغرب کی پسپائی اور سرد جنگ کا خاتمہ بھی شامل ہیں۔ غیر مغربی تہذیبیں انیسویں صدی کے شروع سے مغرب سے نظریات درآمد کر کے اور انہیں پروان چڑھا کر مغرب سے نبرد آزما رہیں۔ غیر مغربی اشرافیہ نے انیسویں صدی میں مغربی لبرل اقدار کو اپنایا اور اس کا پہلا اظہار لبرل قوم پرستی کی صورت میں مغرب کی مخالفت کر کے کیا۔ بیسویں صدی میں روسی' ایشیائی' عرب' افریقی اور لاطینی امریکی اشرافیہ نے سوشلسٹ اور مارکسی نظریات درآمد کیے اور انہیں قوم پرستی سے ملا کر مغربی سرمایہ داری اور مغربی استعمار کی مخالفت کی۔ سوویت یونین میں کمیونزم کے انہدام' چین میں اس نظام میں سخت تجدید اور دیرپا ارتقا پانے میں سوشلسٹ معیشتوں کی ناکامی نے اب ایک نظریاتی خلا پیدا کر دیا ہے۔ مغربی حکومتوں' گروپوں اور بین الاقوامی اداروں مثلاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے اس خلا کو نئی آرتھوڈوکس معاشیات اور جمہوری سیاست کے ذریعے پر کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ غیر مغربی ثقافتوں پر ان نظریات کے پائیدار اثرات غیر یقینی ہوں گے۔ تاہم لوگوں نے حال میں ہی ایک سیکولر خدا کو ناکام ہوتے دیکھا ہے اور نئے سیکولر دیوتاؤں کی عدم موجودگی میں وہ سکون اور جذبے کے ساتھ حقیقی شے کی طرف رخ کریں گے۔ مذہب نظریے پر فتح پا چکا ہے اور مذہبی قوم پرستی نے سیکولر قوم پرستی کی جگہ لے لی ہے۔

مذہبی احیا کی تحریکیں سیکولر دشمن، آفاقیت دشمن اور اپنے عیسائی روپ کے سوا مغرب دشمن ہیں۔ بروس بی لارنس نے ''جدیدیت'' اور ''جدت'' میں جو فرق بیان کیا ہے اس کے مطابق مذہبی تحریکیں ''جدت'' سے مربوط نسبتیت، انا پرستی اور صارفیت کی مخالف ہیں۔ وہ شہریت پذیری، صنعت پذیری، ترقی، سرمایہ داری، سائنس اور ٹیکنالوجی کو مسترد نہیں کرتی ہیں۔ اس مفہوم میں وہ جدیدیت دشمن نہیں ہیں جیسا کہ لی کوان یو نے تبصرہ کیا ہے کہ وہ جدیدیت کو قبول کرتی ہیں اور ''سائنس اور ٹیکنالوجی کی ناگزیریت اور طرز ہائے حیات میں ان کی لائی ہوئی تبدیلیوں کو'' قبول کرتی ہیں لیکن ''وہ اس نظریے کو قبول نہیں کرتیں کہ انہیں جدید ہونا چاہئے۔'' حسن الترابی کہتے ہیں کہ نہ تو قوم پرستی اور نہ سوشل ازم نے اسلامی دنیا میں ترقی کو جنم دیا ہے۔ ''مذہب ترقی کی موٹر ہے'' اور موجودہ دور میں ایک خالص اسلام وہی کردار ادا کرتا ہے جو مغرب کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ اخلاقیات نے کیا تھا۔ نہ ہی مذہب جدید ریاست کی ترقی سے غیر ہم آہنگ ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی کی تحریکیں زیادہ ترقی یافتہ اور ظاہری طور پر زیادہ سیکولر مسلم معاشروں میں مضبوط رہی ہیں جیسے کہ الجیریا، ایران، مصر، لبنان اور تیونس۔ خصوصاً بنیاد پرست تحریکوں سمیت مذہبی تحریکیں اپنے پیغام کی نشرواشاعت کیلئے جدید مواصلاتی اور تنظیمی تکنیکوں کے استعمال میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ اس بات کی انتہائی ڈرامائی تصویر کشی وسطی امریکہ میں پروٹسٹنٹ ٹیلی ایوانجل ازم کی کامیابی سے ہوتی ہے۔

مذہبی احیا کے شرکاء ہر شعبۂ زندگی سے آتے ہیں لیکن دو شعبوں سے تو بہت کثرت میں آتے ہیں، دونوں شہری ہیں اور دونوں متحرک ہیں۔ شہروں کی طرف حال ہی میں ہجرت کرنے والوں کو عمومی طور پر جذباتی، معاشرتی اور مادی امداد و اعانت و رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے جو دوسرے ذرائع کی نسبت مذہبی گروپ زیادہ فراہم کرتے ہیں جیسا کہ ریگز ڈیبرے نے کہا ہے کہ ان کیلئے مذہب ''لوگوں کی افیم نہیں ہوتا ہے بلکہ کمزور کیلئے حیاتین (وٹامن) ہوتا ہے۔'' ڈورے کے ''دوسری نسل کی مقامیت کے مظہر'' کا دوسرا بنیادی شعبہ نیا درمیانہ طبقہ ہے۔ جیسا کہ کیپل نے نشاندہی کی ہے کہ اسلامی بنیاد پرست گروپوں کے سرگرم کارکن ''پرانے کنزرویٹو (روایت پرست) یا جاہل دہقان نہیں ہیں۔'' دوسروں کی

طرح مسلم احیا بھی ایک شہری مظہر ہے اور ان لوگوں کیلئے پرکشش ہے جو جدیدیت نہاد اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور پیشوں' حکومت اور تجارت میں کیریئر بناتے ہیں۔ مسلموں میں نوجوان مذہبی ہیں' ان کے والدین سیکولر ہیں۔ یہی معاملہ ہندومت کے حوالے سے رونما ہوا ہے' جہاں احیا پسندانہ تحریکوں کے لیڈر مقامی دوسری نسل سے آئے ہیں اور بیشتر'' کامیاب کاروباری اور انتظام کار (ایڈمنسٹریٹرز) ہیں'' جنہیں ہندوستانی اخبارات نے لقب دیا ہے:

......زعفرانی رنگ کے لباس والے...... 1990ء کی دہائی کے شروع میں ان کے حمایتیوں کی اکثریت کا تعلق ''ہندوستان'' کے ٹھوس درمیانے طبقے سے تھا۔ جنوبی کوریا میں اسی قسم کے لوگ کثرت سے 1960ء کی دہائی اور 1970ء کی دہائی میں کیتھولک اور پریسبائٹیریئن چرچوں میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مذہب' خواہ مقامی ہو یا درآمد شدہ' جدید ہوتے ہوئے معاشروں کی ابھرتی ہوئی اشرافیہ کو معانی اور سمت مہیا کرتا ہے۔ رونالڈ ڈورے کا کہنا ہے کہ کسی روایتی مذہب کو اہمیت دینے کا مطلب ہے ''دوسری غالب'' قوموں کے مقابلے میں مساوی احترام کا دعویٰ اور اکثر اس کے ساتھ ہی اور زیادہ شدت سے دوسری غالب قوموں کی اقدار اور طرز زندگی کو اپنانے والے مقامی حکمران طبقے کی مخالفت۔ ولیم میک نیل کہتا ہے کہ دوسری چیزوں سے زیادہ' اسلام کی تجدید' خواہ اس کی فرقہ وارانہ صورت کوئی بھی ہو' اس یورپی اور امریکی اثر کی نامنظوری یا استرداد ہے جو مقامی معاشرے' سیاست اور اخلاق پر پڑا ہے۔ اس تناظر میں غیر مغربی مذاہب کا احیا غیر مغربی معاشروں میں مغرب دشمنی کا سب سے طاقتور اظہار ہے۔ یہ احیا محض جدت کا استرداد نہیں ہے' بلکہ یہ تو مغرب کا اور مغرب سے وابستہ سیکولر' نسبتی اور روبہ تنزل ثقافت کا استرداد ہے۔ یہ تو غیر مغربی معاشروں کی ''مغرب زدگی'' کا استرداد ہے۔ یہ تو مغرب سے ثقافتی آزادی کا اعلامیہ ہے۔ ایک فخریہ بیان کہ ''ہم جدید تو ہوں گے لیکن ہم تم نہیں ہوں گے۔''

☆☆☆

باب 5

معاشیات' آبادی اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں

مقامیت اور مذہب کا احیا عالمی (گلوبل) مظہر ہیں۔ تاہم یہ زیادہ تر ایشیا اور اسلام کی طرف سے مغرب کو کیے گئے چیلنجوں اور ثقافتی اثبات سے بہت زیادہ نمایاں ہے۔ یہ بیسویں صدی کے آخری ربع میں جاندار تہذیبیں رہی ہیں۔ اسلامی چیلنج مسلم دنیا میں اسلام کے حاوی ہوتے ہوئے ثقافتی' معاشرتی اور سیاسی احیا نیز مغربی اقدار اور اداروں کے استرداد میں ظاہر ہوا ہے۔ ایشیائی چیلنج تمام مشرقی ایشیائی تہذیبوں...... چینی' جاپانی' بدھ اور مسلم تہذیبوں میں ظاہر ہوا ہے جو مغرب سے اپنے ثقافتی فرق پر اصرار کرتی ہیں اور جو اشتراکات وہ رکھتی ہیں اس کے حوالے سے بدھ مت سے اکثر خود کو شناخت کرواتی ہیں۔ ایشیائی اور مسلم ہر دو مغربی ثقافت پر اپنی اپنی ثقافتوں کی برتری پر زور دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری غیر مغربی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ...... ہندو' آرتھوڈوکس' لاطینی امریکی' افریقی...... اپنی اپنی ثقافتوں کے امتیازی وصف پر زور دے سکتے تھے لیکن 1990ء کی دہائی کے وسط میں وہ مغربی ثقافت پر برتری کے اظہار سے ہچکچاتے رہے ہیں۔ ایشیا اور اسلام مغرب کے حوالے سے اپنے بڑھتے ہوئے پراعتماد دعووں میں تنہا ہیں تاہم بعض اوقات مل بھی جاتے ہیں۔

ان چیلنجوں کے پیچھے متعلق لیکن الگ الگ وجوہات کارفرما ہیں۔ ایشیائی دعوے

داری کی جڑیں معاشی ترقی میں ہیں جبکہ اسلامی دعوے داری معاشرتی بیداری اور کثرت آبادی سے پھوٹی ہے۔ ان چیلنجوں میں سے ہر ایک اکیسویں صدی میں عالمی ریاست پر انتہائی تخریبی اثر ڈالے گا۔ تاہم ان اثرات کی نوعیت میں بہت خاص فرق ہیں۔ چینی اور دوسرے ایشیائی معاشروں کی معاشی ترقی نے ان کی حکومتوں کو دوسرے ملکوں سے معاملے کرتے وقت زیادہ مطالبہ کرنے کے محرکات اور ذرائع مہیا کر دیئے ہیں۔ مسلم ملکوں میں آبادی میں اضافے اور خصوصاً 15 سے 24 برس کی عمر کے لوگوں میں اضافے نے بنیاد پرستی، دہشت گردی، بغاوت اور ترک وطن کیلئے رنگروٹ مہیا کر دیئے ہیں۔ معاشی ترقی ایشیائی حکومتوں کو مضبوط بناتی ہے، آبادی میں اضافہ مسلم حکومتوں اور غیر مسلم معاشروں کیلئے خطرہ ہے۔

ایشیائی دعوے داری

مشرقی ایشیا کی معاشی ترقی بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دنیا میں سب سے زیادہ اہم پیش رفتوں میں سے ایک رہی ہے۔ اس عمل کا آغاز 1950ء کی دہائی میں جاپان سے ہوا اور ایک وقت تھا کہ جاپان کو عظیم استثنا تصور کیا جاتا تھا یعنی ایک ایسا غیر مغربی ملک جو کامیابی کے ساتھ جدید اور معاشی طور پر ترقی یافتہ ہو۔ تاہم ترقی کا عمل چار ٹائیگروں (ہانگ کانگ، تائیوان، جنوبی کوریا، سنگاپور) تک وسعت اختیار کر گیا اور پھر چین، ملائیشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا تک پھیل گیا نیز یہ فلپائن، ہندوستان اور ویتنام میں جگہ بنا رہا ہے۔ ان ملکوں میں ایک دہائی یا اس سے زیادہ عرصے سے اوسطاً 8 سے 10 فیصد یا زیادہ سالانہ شرح پیداوار چلی آرہی ہے۔ اسی طرح ایشیا اور دنیا کے درمیان اور بعدازاں ایشیا کے اندر تجارت ڈرامائی انداز میں وسعت اختیار کر گئی۔ یہ ایشیائی کارکردگی یورپی اور امریکی معیشتوں کی درمیانی نشوونما نیز باقی دنیا میں چھائے ہوئے جمود سے ڈرامائی طور پر مختلف ہے۔

لہٰذا استثنا صرف جاپان ہی نہیں ہے بلکہ رفتہ رفتہ سارا ایشیا ہی استثنا کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ مغرب کے ساتھ دولت اور غیر مغرب کے ساتھ ترقی پذیری کا تشخص بیسویں

صدی میں برقرار نہیں رہے گا۔ اس تبدیلی ہیئت کی رفتار بہت تیز ہے۔ جیسا کہ کشور محبوبانی نے واضح کیا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کو اپنی فی کس آمدنی کو دگنا کرنے میں بالترتیب 58 برس اور 47 برس لگے تھے تاہم جاپان نے 33 برس میں یہ ممکن کر دکھایا' انڈونیشیا نے سترہ' جنوبی کوریا نے گیارہ اور چین نے دس برس میں۔ 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے پہلے نصف میں چین کی معیشت میں اوسطاً 8 فیصد سالانہ کے حساب سے ترقی ہوئی اور ٹائیگر اس کے قریب قریب تھے۔ 1993ء میں ورلڈ بینک نے اعلان کیا کہ ''چین کا معاشی علاقہ امریکہ' جاپان اور جرمنی کے ساتھ دنیا کا چوتھا ترقیاتی مرکز'' بن چکا ہے۔ بے شمار تجزیوں کے مطابق اکیسویں صدی کے شروع میں چینی معیشت دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن جائے گی۔ 1990ء کی دہائی میں ایشیا میں دنیا کی سب سے بڑی معیشتوں میں سے دوسری اور تیسری واقع تھیں اور 2020ء تک ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ دنیا کی پانچ سب سے بڑی معیشتوں میں سے چار اور دس سب سے بڑی معیشتوں میں سے سات کا حامل ایشیا ہوگا۔ اس وقت ایشیائی معاشرے عالمی معاشی پیداوار میں 40 فیصد کے حصہ دار ہوں گے۔ مسابقتی معیشتوں میں سے بھی زیادہ ایشیائی ہوں گی۔ گو کہ ایشیائی معاشی ترقی کے درجے جلد کم ہو گئے ہیں اور توقع سے زیادہ تیزی سے لیکن جو ترقی پہلے ہی ہو چکی ہے اس کے ثمرات ایشیا اور دنیا میں اب بھی بہت زیادہ ہیں۔

مشرقی ایشیائی معاشی ترقی ایشیا اور مغرب بالخصوص امریکہ کے درمیان طاقت کے توازن کو تبدیل کر رہی ہے۔ کامیاب معاشی ترقی اس کو جنم دینے والوں میں خود اعتمادی اور ادعا کو فروغ دے رہی ہے۔ دولت کو' طاقت کی طرح نیکی' اخلاقی اور ثقافتی برتری کا ثبوت تصور کیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے وہ معاشی حوالے سے ارتقا کر رہے ہیں' مشرقی ایشیائی اپنی ثقافتوں کی انفرادیت جتانے سے نہیں ہچکچاتے ہیں اور اپنی اقدار اور طرز زندگی کی مغرب اور دوسرے معاشروں کے مقابلے میں برتری کے راگ الاپتے ہیں۔ ایشیائی معاشروں میں امریکہ کے مطالبات اور مفادات کے حوالے سے تابعداری گھٹ رہی ہے اور وہ امریکہ یا دوسرے مغربی ملکوں کے دباؤ کی مزاحمت کے زیادہ اہل ہوتے جا رہے ہیں۔

سفیر ٹومی کوبل نے 1993ء میں کہا کہ ایشیا بھر میں ایک ''ثقافتی نشاۃ ثانیہ پھیل رہی ہے۔'' اس میں ایک ''بڑھتی ہوئی خود اعتمادی'' شامل ہے جس کا مطلب ہے کہ ایشیائی ''مزید ہر مغربی یا امریکی شے کو بہترین سمجھنا ضروری نہیں جانیں گے۔'' اس نشاۃ ثانیہ کی نمود ایشیائی ملکوں کا فرداً فرداً اپنی امتیازی ثقافتی شناختوں پر اصرار ہے نیز ایشیائی ملکوں کی یکسانیتوں پر جو انہیں مغربی ثقافت سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس ثقافتی احیا کی اہمیت مشرقی ایشیا کے دو بڑے معاشروں کے مغربی ثقافت کے ساتھ بدلتے ہوئے تعامل سے ظاہر ہے۔

جب مغرب نے انیسویں صدی کے وسط میں خود کو چین اور جاپان پر مسلط کیا تو کمال ازم سے وقتی طور پر فریفتگی کے بعد حاوی ہوتی ہوئی اشرافیہ نے ایک اصلاح پسندانہ حکمت عملی اپنا لی۔ میجی احیا کے ساتھ جاپان میں اصلاح پسندوں کا ایک جاندار (DYNAMIC) گروپ اقتدار میں آیا۔ جس نے مغربی تکنیکوں' اعمال اور اداروں کو مستعار لیا اور جاپانی جدیدیت کا عمل شروع کیا تاہم انہوں نے ایسا اس طرح کیا کہ روایتی جاپانی ثقافت کے جوہر محفوظ رہیں جس نے کئی حوالوں سے جدیدیت کو تقویت دی۔ دوسری طرف چین میں چنگ عہد حکومت مغربی اثر کو کامیابی سے اپنانے میں ناکام رہا۔ چین کو جاپان اور یورپی طاقتوں سے شکست ہوگئی' انہوں نے چین کا استحصال کیا' اس کی تذلیل کی۔ 1910ء میں اس سلطنت کے انہدام کے بعد تقسیم اور خانہ جنگی ہوئی اور چینی دانشور اور سیاسی لیڈر مغربی تصورات کو اپنانے لگے۔ اس میں شامل ہیں: سن یات سین کے تین اصول ''قوم پرستی' جمہوریت اور عوامی بہبود'' لیاؤ چی چاؤ کا لبرل ازم' ماؤزے تنگ کا مارکسی لینن ازم' 1940ء کی دہائی کے آخر میں سوویت یونین سے درآمد نے مغربی درآمدات ...... قوم پرستی' لبرل ازم' جمہوریت' عیسائیت ...... پر فتح پالی اور چین ایک سوشلسٹ معاشرے کے طور پر معروف ہوا۔ جاپان میں دوسری عالمی جنگ میں مکمل شکست نے مکمل ثقافتی اضمحلال پیدا کیا۔ ایک مغربی نے جو کہ جاپان میں گہری دلچسپی رکھتا ہے تبصرہ کیا کہ ''جنگ نے جاپان کے نظام کو مکمل طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے خیال میں ہر شے اپنی قدر کھو بیٹھی تھی اور بیکار قرار دے کر پھینک دی گئی۔'' اس کی جگہ ہر شے جو کہ مغرب خصوصاً فاتح امریکہ سے

وابستہ تھی اسے اچھا اور قابل حصول سمجھا گیا۔ پس جاپان نے اسی طرح امریکہ کی نقل کی جس طرح کہ چین نے سوویت روس کی نقل کی تھی۔

1970ء کی دہائی کے اواخر میں معاشی ترقی میں کمیونزم کی ناکامی اور جاپان اور دوسرے ایشیائی معاشروں میں سرمایہ داری کی کامیابی نے چینی لیڈر شپ کو سوویت ماڈل سے دوری اختیار کرنے کی راہ دکھائی۔ ایک دہائی بعد سوویت یونین کے انہدام نے اس درآمد کو مزید بے سود قرار دلوادیا۔ تب چینیوں نے اس سوال کو سامنے پایا کہ مغرب کی طرف رخ کیا جائے یا داخلی رخ اپنایا جائے۔ بہت سے دانشوروں اور بعض دوسرے لوگوں نے کلی مغربیت پذیری کی وکالت کی' یہ ایک ایسا رجحان ہے جو کہ تیان آن من چوک کے حوالے سے تخلیق کی گئیں ٹیلی ویژن سیریز ''ریور ایلیجی'' (دریا کا نوحہ) اور ''گاڈیس آف ڈیموکریسی'' (جمہوریت کی دیوی) میں اپنی ثقافتی اور عوامی مقبولیت کی انتہا کو پہنچا۔ تاہم مغربی اساسیت نے نہ تو بیجنگ میں چند سو لوگوں اور نہ ہی دیہاتوں میں 800 ملین دہقانوں کی تائید و حمایت پائی۔ انیسویں صدی کے اواخر کی نسبت بیسویں صدی کے اواخر میں مغربیت پذیری عملی طور پر موجود نہیں تھی۔ اس کے بجائے لیڈر شپ نے ''تی یونگ'' کا ایک نیا روپ اپنایا یعنی سرمایہ داری اور عالمی معیشت میں شمولیت کے ساتھ ساتھ سیاسی مطلق حاکمیت اور روایتی چینی ثقافت سے دوبارہ وابستگی اختیار کی۔ حکومت نے مارکسی لیننن ازم کے انقلابی جواز کی جگہ ابھرتی ہوئی معاشی ترقی کے فراہم کردہ عملی جواز اور چینی ثقافت کی امتیازی خصوصیات کے مہیا کردہ قوم پرستانہ جواز کو اپنایا۔ ایک مبصر نے تبصرہ کیا ''تیان آن من کے بعد کی حکومت نے چینی قوم پرستی کو جواز کے نئے سرچشمے کے طور پر شدت سے اپنایا'' اور اپنے اقتدار اور رویے کو جائز قرار دلوانے کیلئے شعوری طور پر امریکہ دشمنی کو ابھارا۔ لہٰذا ایک چینی ثقافتی قوم پرستی ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ 1994ء میں ہانگ کانگ کے ایک لیڈر نے اس صورتحال کو ان لفظوں میں سمو دیا کہ ''ہم چینی پہلے کبھی قوم پرستی کے احساس سے مملو نہیں تھے۔ ہم چینی ہیں اور چینی ہونے پر فخر کرتے ہیں'' 1990ء کی دہائی کی ابتدا میں خود چین میں ''مصدقہ و مسلمہ چینیت کی طرف رجوع کی مقبول عوام خواہش پیدا ہوئی' جو

کہ خصوصیات کے اعتبار سے پدرسری' مقامیت پسندانہ اور مطلق العنانیت کی حامل ہے۔ اس تاریخی ظہورنو میں جمہوریت اپنی کوئی قدر نہیں رکھتی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح کہ لینن ازم جو کہ محض ایک اور درآمد تھا۔''

بیسویں صدی کے شروع میں چینی دانشور' ویبر کے تجزیے کے عین مطابق' کنفیوشس ازم کو چینی پسماندگی کی جڑ قرار دیتے تھے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں چینی سیاسی لیڈر' مغربی سماجی سائنسدانوں کے تجزیے کے عین مطابق کنفیوشس ازم کو چینی ترقی کے سرچشمے کے طور پر قبول کررہے ہیں۔ 1980ء کی دہائی میں چینی حکومت نے کنفیوشس ازم میں دلچسپی لینا شروع کی اور پارٹی لیڈروں نے اس کو چینی ثقافت کا ''مرکزی دھارا'' (مین سٹریم) قرار دیا۔ کنفیوشس ازم لی کوان یو کیلئے بھی ایک جنون کا درجہ پا گیا جس نے اس کو سنگاپور کی کامیابی کا سرچشمہ جانا اور باقی دنیا کیلئے کنفیوشسی اقدار کا مبلغ بن گیا۔ 1990ء کی دہائی میں تائیوانی حکومت نے خود کو ''کنفیوشسی فلسفے کا وارث'' قرار دے دیا اور صدر لی ٹینگ ہوئی نے تائیوان کی جمہوریت پذیری کی جڑیں چینی ''ثقافتی ورثے'' میں شناخت کیں جو کہ ماضی میں کاؤیاؤ (اکیسویں صدی قبل ازمسیح) تک پھیلا ہوا ہے۔ خواہ وہ جمہوریت یا مطلق العنانیت کو جائز قرار دینے کی کوشش کررہے ہوں' چینی لیڈر درآمدی مغربی تصورات کے بجائے اپنی مشترکہ چینی ثقافت میں جواز تلاش کررہے ہیں۔

حکومت جس قوم پرستی کو فروغ دے رہی ہے وہ ہان قوم پرستی ہے جو چینی آبادی کے 90 فیصد حصے میں موجود لسانی' علاقائی اور معاشی اختلافات کو دبانے میں معاون ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ان غیر چینی نسلی اقلیتوں کے ساتھ فرق واضح کرتی ہے جو چینی آبادی کے دس فیصد سے بھی کم ہیں لیکن 60 فیصد رقبے پر قابض ہیں۔ اس سے حکومت کو عیسائیت' عیسائی تنظیموں اور عیسائی تبدیلی مذہب کی کوششوں کی مخالفت کیلئے بنیادیں بھی مہیا ہوتی ہیں جو کہ مارکسی لینن۔ زم کے انہدام سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کیلئے ایک متبادل مغربی عقیدہ پیش کرتی ہیں۔

اسی دوران میں 1980ء کی دہائی میں جاپان کی کامیاب معاشی ترقی نے اس تصور کو

غلط قرار دے دیا جس کے تحت امریکی معیشت اور معاشرتی نظام کو ناکام بلکہ "زوال یافتہ" سمجھا جا رہا تھا اور جس کے تحت جاپانی مغربی ماڈلوں سے زیادہ دوری اختیار کرتے ہوئے اس سوچ کی طرف زیادہ مائل ہو رہے تھے کہ ان کی کامیابی کا سرچشمہ تو بس ان کی اپنی ثقافت ہی ہے۔ جاپانی ثقافت جو 1945ء میں فوجی بربادی کا باعث بننے کی وجہ سے مسترد کر دی گئی تھی 1985ء میں معاشی فتح کا سبب بنی اور نتیجتاً لائق پرستش تصور کی جانے لگی۔ جاپانیوں کی مغربی معاشرے سے بڑھتی ہوئی مطابقت پذیری انہیں "یہ ادراک کروانے لگی کہ مغربی ہونا کوئی معجزاتی عمل نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو اپنے نظام سے خارج کر دیا۔" جہاں میجی بحالی کے دوران میں "ایشیا سے دوری اور یورپ سے انسلاک" کی پالیسی اختیار کی گئی تھی وہاں بیسویں صدی کے اواخر میں رونما ہونے والے جاپانی ثقافتی احیا نے "امریکہ سے دوری اور ایشیا سے انسلاک" کی پالیسی عطا کی۔ اقدار کا تازہ اثبات اور زیادہ مسئلے پیدا کرنے والی چیز جاپان کی "ایشیا پذیری" ہے نیز جاپان کو اس کی ممتاز تہذیب کے باوجود ایک عمومی ایشیائی ثقافت سے پہچان کرواتا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے چین کے برعکس مغرب سے ہم آہنگی اختیار کی نیز اس تناظر میں دیکھا جائے کہ مغرب اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود سوویت یونین کی طرح مکمل طور پر منہدم نہیں ہوا ہے، جاپان کے مغرب کو مکمل طور پر مسترد کر دینے کے محرکات چین کے سوویت اور مغربی ماڈلوں کے استرداد سے مماثلت نہیں رکھتے ہیں۔ دوسری طرف جاپانی تہذیب کی انفرادیت، دوسرے ملکوں میں جاپانی استعمار کی یادیں اور بہت سے دوسرے ایشیائی ملکوں میں چینیوں کی معاشی مرکزیت ایسی وجوہات ہیں جن کے نتیجے میں جاپان مغرب سے تو آسانی سے دوری اختیار کر سکتا ہے لیکن ایشیا سے منسلک نہیں ہو سکتا۔ اپنے ثقافتی تشخص کے دوبارہ اثبات کے ساتھ جاپان مغربی اور ایشیائی ہر دو ثقافتوں سے اپنے اختلافات کو نمایاں کر رہا ہے۔

جہاں چین اور جاپان اپنی اپنی ثقافتوں میں نئی قدر دریافت کر رہے ہیں وہیں عمومی طور پر مغرب سے مسابقت میں ایشیائی ثقافت میں وسیع تر قدر کا مشترکہ اثبات کر رہے ہیں۔ صنعت

پذیری اور پیداوار نے 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی میں مشرقی ایشیائیوں کو ایشیائی دعوے داری کا جواز فراہم کیا۔ رجحانات کے اس گورکھ دھندے کے چار بڑے اجزا ہیں:

اول

ایشیائی یقین رکھتے ہیں کہ مشرقی ایشیا اپنی تیز رفتار معاشی ترقی کو برقرار رکھے گا' معاشی پیداوار میں مغرب کو جلد ہی پیچھے چھوڑ جائے گا اور نتیجتاً عالمی معاملات میں مغرب کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ معاشی ترقی نے ایشیائی معاشروں میں طاقت کا ایک احساس پیدا کیا ہے نیز مغرب کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی اہلیت کا احساس بھی۔ 1993ء میں ایک نمایاں جاپانی صحافی نے واضح کیا "وہ دن گئے کہ جب امریکہ چھینکتا تھا تو ایشیا کو نزلہ ہو جایا کرتا تھا۔" اور ایک ملائیشیائی اہلکار نے اس طبی کنائے کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا "حتیٰ کہ امریکہ کو شدید بخار بھی ہو جائے تو ایشیا کو کھانسی بھی نہیں ہوگی۔" ایک اور ایشیائی لیڈر نے کہا امریکہ کے حوالے سے ایشیائی "مرعوبیت کے دور کے اختتام اور منہ توڑ جواب دینے کے دور کے آغاز پر پہنچ چکے ہیں۔" ملائیشیا کے نائب وزیراعظم نے دعویٰ کیا "ایشیا کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کا مطلب ہے کہ یہ اب غالب عالمی سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام کے سنجیدہ متبادل پیش کرنے کے درجے پر ہے۔" مشرقی ایشیائی کہتے ہیں کہ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ مغرب انسانی حقوق اور دوسری اقدار کے مغربی معیارات کے حوالے سے ایشیائی معاشروں کو مجبور کرنے کی اہلیت تیزی سے کھو رہا ہے۔

دوم

ایشیائیوں کا یقین ہے کہ یہ معاشی کامیابی ایشیائی ثقافت کی عظیم پیداوار ہے جو کہ مغرب سے برتر ہے کیونکہ مغرب ثقافتی اور معاشرتی حوالے سے زوال پا رہا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے دوران میں جب جاپان معیشت' برآمدات' تجارتی توازن اور زرمبادلہ کے حوالے سے عروج پر تھا جاپانی اپنے پیشرو سعودیوں کی طرح اپنی معاشی طاقت کے راگ الاپتے اور مغرب کے زوال پر انگشت نمائی کرتے اور اپنی کامیابی کو اپنی ثقافت کی برتری اور مغربی

ناکامیوں کو مغربی ثقافت کے زوال سے تعبیر کرتے تھے۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز میں ایشیائی فتح مندی کو نیا روپ ملا جس کو "سنگاپوری ثقافتی یلغار" کے طور پر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ لی سے لے کر نیچے تک سنگاپوری لیڈر مغرب کے مقابلے میں ایشیا کے عروج کے ترانے گانے لگے اور ایشیائی ثقافت' بنیادی طور پر کنفیوشسی ثقافت کو کامیابی کی کلید قرار دیتے ہوئے ایشیائی اوصاف کو مغربی اقدار سے موازنہ کر کے انہیں برتر ٹھہراتے رہے یعنی نظم (آرڈر)' ڈسپلن' خاندانی ذمہ داری' محنت' اجتماعیت اور پارسائی بمقابلہ خود پسندی' کاہلی' انفرادیت پسندی' جرائم' پست تعلیم' بڑوں کا عدم احترام نیز مغرب کے زوال کا ذمہ دار "ذہنی جمود" کو ٹھہراتے رہے۔ کہا گیا کہ امریکہ کو مشرق سے مسابقت کیلئے اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کے بنیادی تصورات پر غور و فکر کرنا چاہئے اور اس عمل کے دوران میں مشرقی ایشیائی معاشروں سے چند سیکھنی چاہئیں۔"

مشرقی ایشیائیوں کیلئے مشرقی ایشیائی کامیابی نتیجہ ہے انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر خصوصیت کے ساتھ اصرار کا۔ لی کوان یو کا کہنا ہے "مشرقی ایشیائیوں یعنی جاپانیوں' کوریائیوں' تائیوانیوں' ہانگ کانگروں اور سنگاپوریوں کی اجتماعیت پسندانہ اقدار اور اعمال ترقی کو حاصل کرنے میں واضح اثاثہ ثابت ہوئے ہیں۔ وہ اقدار جو ایشیائی ثقافت کا طرۂ امتیاز ہیں جیسے کہ فرد کے مفادات پر گروہ کے مفادات کو فوقیت دینا' تیزی سے ترقی کیلئے گروہی مساعی کی تائید کرنا۔" ملائیشیا کے وزیراعظم اتفاق رائے کرتے ہوئے کہتے ہیں "جاپانیوں اور کوریائیوں کی ڈسپلن' وفاداری اور جاں فشانی پر مبنی کام کی اخلاقیات (ورک ایتھکس) ان کے ملکوں کی معاشی اور معاشرتی ترقی کی قوت محرکہ ہے۔ کام کی یہ اخلاقیات اس فلسفے سے پیدا ہوئی کہ گروہ اور ملک فرد سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔"

سوم:

ایشیائی معاشروں اور تہذیبوں میں موجود فرق کو تسلیم کرتے ہوئے مشرقی ایشیائی دلیل دیتے ہیں کہ ان میں اہم اشتراکات بھی موجود ہیں۔ ایک چینی کہتا ہے کہ ان کے درمیان مرکزی حیثیت رکھتا ہے "کنفیوشس ازم کا نظام اقدار جو تاریخ کا اعزاز ہے اور جو

علاقے کے بیشتر ملکوں میں مشترکہ طور پر موجود ہے خاص طور پر کنفیوشس ازم کا کفایت شعاری، خاندان، کام اور نظم وضبط پر اصرار" اسی طرح ان میں مشترک ہیں انفرادیت پسندی کا استرداد اور "نرم" مطلق العنانیت یا جمہوریت کی محدود صورتیں۔ ایشیائی معاشروں میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ مغرب کی مسابقت میں اپنی ممتاز اقدار کا دفاع کریں اور اپنے معاشی مفادات کو فروغ دیں۔ ایشیائی کہتے ہیں کہ اس کیلئے بین الایشیائی تعاون کی صورتوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے، جیسے کہ ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایسٹ ایشین نیشنز میں توسیع۔ جہاں مشرقی ایشیائی معاشروں کا فوری مفاد اس میں ہے کہ وہ مغربی مارکیٹوں تک رسائی کو برقرار رکھیں وہاں طویل مدتی معاشی علاقائیت (ریجنل ازم) کو حاوی ہونا ہے اور مشرقی ایشیا کو بین الایشیائی تجارت اور سرمایہ کاری کو لازماً فروغ دینا ہوگا۔ خصوصاً جاپان کیلئے ایشیائی ترقی کے لیڈر کی حیثیت میں ایسا کرنا ضروری ہے کہ وہ "ایشیائیت پذیری کی مخالفت اور مغربیت پذیری کی حمایت پر مبنی" تاریخی پالیسیوں کو چھوڑ دے اور "ایشیائیت پذیری کے راستے" پر گامزن ہو جائے۔ یا زیادہ بہتر ہے کہ سنگاپوری اہلکاروں کے وضع کردہ راستے "ایشیا کی ایشیائیت پذیری" کو فروغ دے۔

چہارم

مشرقی ایشیائی کہتے ہیں کہ ایشیائی ترقی اور ایشیائی اقدار کی دوسرے غیر مغربی معاشروں کو مغرب سے مسابقت کی کوششوں میں نقالی کرنی ہوگی نیز مغرب کو اپنی تازگی کیلئے انہیں اپنانا ہوگا۔ مشرقی ایشیائی الزام دیتے ہیں کہ "اینگلو سیکسن ترقیاتی ماڈل جو گزشتہ چار دہائیوں سے ترقی پذیر قوموں کی معیشتوں کی جدیدیت اور ایک موثر سیاسی نظام کی تعمیر وتشکیل کیلئے بہترین ذرائع میں سے ایک تصور ہوتا رہا ہے اب کارآمد نہیں رہا۔" مشرقی ایشیائی ماڈل سے میکسیکو اور چلی سے لے کر ایران اور ترکی اور سابق سوویت جمہوریائیں تک سبق سیکھ رہی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح گزشتہ نسلوں نے مغربی کامیابی سے سبق حاصل کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ ایشیا کو "آفاقی قدر کی حامل ایشیائی اقدار کو باقی دنیا میں ضرور ترسیل کرنا چاہیے...... اس آدرش کی ترسیل کا مطلب ہے ایشیا کے سماجی نظام کی برآمد" جاپان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کیلئے

ضروری ہے کہ وہ ''ایشیائی عالم گیری'' کے بجائے ''بحرالکاہلی عالم گیری'' کو فروغ دے اور نتیجتاً ''نئے عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کو فیصلہ کن انداز میں تشکیل دے۔''

طاقتور معاشرے آفاقی ہوتے ہیں اور کمزور معاشرے تکثیری ہوتے ہیں۔ مشرقی ایشیا کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی نے ایک ابھرتی ہوئی ایشیائی آفاقیت پسندی کو عروج بخشا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کا موازنہ مغرب سے کیا جا سکتا ہے۔ 1996ء میں وزیراعظم مہاتیر محمد نے یورپی حکومتوں کے سربراہوں کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا ''ایشیائی اقدار آفاقی اقدار ہیں۔ یورپی اقدار صرف یورپی اقدار ہیں۔'' اس کے ساتھ ایک ایشیائی ''غربیت'' بھی سامنے آئی ہے جو اسی یکساں اور منفی انداز میں مغرب کی تصویر کشی کرتی ہے جس طرح کہ مغربی مشرقیت کبھی مشرق کی تصویر کشی کرتی تھی۔ مشرقی ایشیائیوں کیلئے معاشی خوشحالی اخلاقی برتری کا ثبوت ہے۔ اگر ہندوستان مشرقی ایشیا کی جگہ سنبھال لے تو دنیا کو ہندو ثقافت کی برتری تسلیم کرنے کیلئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ثقافتی اثبات مادی کامیابی کی پیروی کرتا ہے۔ ہارڈ پاور سافٹ پاور کو پیدا کرتی ہے۔

اسلامی احیا

جہاں ایشیائی معاشی ترقی کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ دعوے کرنے لگے ہیں وہاں مسلم کثرت سے تشخص، معنویت، استحکام، جواز، ترقی اور قوت کے سرچشمے کے طور پر اسلام سے رجوع کر رہے ہیں، نیز امید کے سرچشمے کے طور پر، وہ امید جو اس نعرے میں مجسم ہوئی ہے ''اسلام ہر مسئلے کا حل ہے۔'' یہ اسلامی احیا مغرب سے معاملہ بندی کا تازہ ترین مرحلہ ہے، ایک کوشش ہے ''حل'' تلاش کرنے کی، مغربی نظریات کے بجائے اسلام میں۔ یہ احیا جدیدیت کو قبول کرتا ہے اور مغربی ثقافت کو رد کرتا ہے اور جدید دنیا میں زندگی کے رہنما کے طور پر اسلام سے دوبارہ وابستگی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ایک چوٹی کے سعودی اہلکار نے 1994ء میں واضح کیا کہ ''غیر ملکی درآمدات مثلاً چمک دار یا ہائی ٹیک ''اشیا'' عمدہ ہیں لیکن کہیں سے بھی درآمد کئے گئے معاشرتی اور سیاسی ادارے مضر ہو سکتے ہیں ...... شاہ ایران سے پوچھو...... اسلام ہمارے لئے صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ایک طرز حیات ہے۔ ہم سعودی

جدید ہونا چاہتے ہیں لیکن مغربی ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔''

اسلامی احیا اسی منزل کو پانے کیلئے مسلموں کی کوشش کا نام ہے۔ یہ ایک وسیع دانشورانہ' ثقافتی' معاشرتی اور سیاسی تحریک ہے جو ساری اسلامی دنیا میں چھائی ہوئی ہے۔ اسلامی ''بنیاد پرستی'' جس کو عموماً سیاسی اسلام تصور کیا جاتا ہے' اسلامی نظریات اور اعمال کے بہت وسیع احیا کا محض ایک جزو ہے نیز مسلم آبادی کے اسلام سے تجدید عہد وفا کا ایک حصہ ہے۔ یہ احیا انتہا پسندانہ نہیں مرکزی ہے؛ علیحدگی پسندانہ نہیں بلکہ چھا جانے والا ہے۔

اس احیا نے ہر ملک کے مسلموں اور معاشرے کے بیشتر پہلوؤں کو متاثر کیا ہے اور بیشتر ملکوں کی سیاست پر اثر ڈالا ہے۔

اپنے سیاسی اظہار میں اسلامی احیا مارکسزم سے کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ تاہم ایک زیادہ سودمند مشابہت پروٹسٹنٹ اصلاح سے ہے۔ دونوں موجودہ اداروں کے جمود اور کرپشن کے خلاف ردعمل ہیں' اپنے مذہب کے زیادہ خالص روپ کی طرف رجوع کرنے کی وکالت کرتے ہیں؛ محنت' نظم (آرڈر) اور ڈسپلن کی تبلیغ کرتے ہیں اور ابھرتے ہوئے جاندار درمیانے طبقے کے لوگوں کیلئے پرکشش ہیں۔ دونوں میں مختلف موقف رکھنے والی بہت پیچیدہ تحریکیں موجود ہیں لیکن دو اہم ہیں: لوتھرن ازم اور کیلون ازم: شیعہ بنیاد پرستی اور سنی بنیاد پرستی حتیٰ کہ جان کیلون اور آیت اللہ خمینی میں مشابہت ہے جو اپنے اپنے واحد حکمران والے نظام کو اپنے اپنے معاشروں میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اصلاح اور احیا ہر دو کی روح ہے بنیادی تطہیر۔ ایک پیورٹن منسٹر اعلان کرتا ہے کہ ''اصلاح آفاقی ہے'' حسن الترابی اسی طرح کہتے ہیں کہ ''یہ بیداری جامع ہے— یہ محض انفرادی پارسائی کے متعلق نہیں ہے؛ نہ یہ محض دانشورانہ اور ثقافتی ہے نہ ہی یہ محض سیاسی ہے۔ اس میں یہ سب ہی شامل ہیں' معاشرے کی چوٹی سے نچلی سطح تک جامع تعمیر نو۔''

احیا اور اصلاح میں ایک کلیدی پہلو سے فرق ہے۔ مؤخرالذکر صرف شمالی یورپ تک ہی محدود تھی۔ اس کے برعکس احیا نے لگ بھگ تمام مسلم معاشروں کو متاثر کیا ہے۔ 1970ء کی دہائی سے شروع ہونے والی اسلامی علامات' عقائد' اعمال' اداروں' پالیسیوں اور تنظیموں

نے مراکش سے انڈونیشیا اور الجیریا سے قزاقستان تک پھیلے ہوئے ایک بلین مسلموں کی تائید اور وابستگی جیت لی۔ اسلامیت کا رجحان اس طرح سے رہا کہ یہ پہلے ثقافتی شعبے میں وقوع پذیر ہوئی ہے اور بعدازاں معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں سرایت کر گئی ہے۔ دانشور اور سیاسی لیڈر خواہ وہ اس کے حامی ہوں یا مخالف نہ تو اس کو نظرانداز کر سکتے تھے نہ اس کو ایک یا دوسرے انداز سے اختیار کرنے سے گریز کر سکتے تھے۔ تعمیم اکثر غلط ہوا کرتی ہے۔ 1995ء میں غالب مسلم آبادی والا ہر ملک سوائے ایران کے 15 برس پہلے کے مقابلے میں ثقافتی' سماجی اور سیاسی حوالے سے زیادہ اسلامی اور اسلام پسند ہو گیا تھا۔

بہت سے ملکوں میں اسلامیت کا ایک مرکزی عنصر اسلامی معاشرتی تنظیموں کا ارتقا تھا نیز پہلے سے موجود ایسی تنظیموں پر اسلامی گروپوں کا قبضہ۔ اسلام پسند اسلامی سکولوں کے قیام اور ریاستی سکولوں میں اسلامی اثر ورسوخ کو بڑھانے پر توجہ دیتے ہیں۔ اسلامی گروپ سیکولر سول معاشرے کے ناکام اداروں کی جگہ مساوی اسلامی ''سول معاشرہ'' وجود میں لائے ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے شروع سے مصر میں اسلامی تنظیموں نے تنظیموں کا ایک جال سا بن دیا جو کہ صحت' بہبود' تعلیم اور دوسری خدمات کے حوالے سے حکومت کے چھوڑے ہوئے خلا کو پر کرتے ہوئے کثیر تعداد میں مصری غریبوں کی امداد کرتی ہیں۔ 1992ء میں قاہرہ میں زلزلے کے بعد اسلامی تنظیمیں ''گھنٹوں کے اندر اندر ہاتھوں میں غذا اور کمبل اٹھائے گلیوں میں نکل آئیں جبکہ حکومتی امدادی کوششیں بہت بعد میں شروع ہوئیں۔'' اردن میں ''مسلم اخوت'' معاشرتی اور سماجی اداروں پر مبنی ''ایک اسلامی جمہوریت کا انفراسٹرکچر'' تشکیل دینے کیلئے شعوری طور پر کام کر رہی ہے اور 1990ء کی دہائی کے آغاز میں چار کروڑ آبادی والے اس چھوٹے سے ملک میں ایک بڑا ہسپتال' بیس شفاخانے' چالیس اسلامی سکول اور 120 قرآنی مطالعاتی مراکز چلا رہی تھی۔ 1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی میں سارے انڈونیشیا میں اسلامی تنظیمیں پھیل گئیں۔ 1980ء کی دہائی کے آغاز سے 60 لاکھ افراد پر مشتمل سب سے بڑی تنظیم ''محمدی جاہ'' نے ''سیکولر ریاست کے اندر مذہبی فلاحی ریاست'' قائم کی اور سکولوں' کلینکوں' ہسپتالوں اور فلاحی اداروں کے

ذریعے پورے ملک کو ''آغوش مادر سے قبر تک'' خدمات فراہم کیں۔ ان سمیت جن جن مسلم معاشروں میں اسلام پسند تنظیموں پر سیاسی حوالے سے پابندیاں عائد ہیں وہاں یہ تنظیمیں امریکہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں کام کرنے والی سیاسی مشینوں (POLITICAL MACHINES) کی طرح معاشرتی خدمات مہیا کر رہی ہیں۔

احیا کا سیاسی غلبہ معاشرتی اور ثقافتی غلبے سے کم ہے تاہم بیسویں صدی کے آخری ربع میں مسلم معاشروں میں یہ واحد سب سے اہم سیاسی پیش رفت ہے۔ اسلام پسند تنظیموں کی سیاسی حمایت مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ تاہم کچھ یقینی وسیع رجحانات موجود ہیں۔ یہ تحریکیں دیہاتی اشرافیہ کسانوں اور بزرگوں کی زیادہ حمایت نہیں حاصل کر پاتیں۔ دوسرے مذاہب کے بنیاد پرستوں کی طرح اسلام پسند کثیر تعداد میں جدیدیت کے حامی اور اس کی پیداوار ہیں۔ وہ متحرک و بیدار ہیں۔

بیشتر انقلابی تحریکوں کی طرح مرکزی عنصر طلباء اور دانشوروں پر مشتمل ہے۔ بیشتر ملکوں میں بنیاد پرستوں نے طلباء یونینوں پر قبضہ جما لیا ہے اور ایسی ہی تنظیمیں سیاسی اسلامیت کے عمل کے دوران میں پہلا مرحلہ تھیں' مصر' پاکستان اور افغانستان کی یونیورسٹیوں میں 1970ء کی دہائی کے شروع میں اسلام پسندوں کی ''کامیابی'' اور بعد ازاں دوسرے مسلم ملکوں کی طرف رخ کرنے کے ساتھ ساتھ۔ اسلام پسند ترغیب خصوصیت کے ساتھ ٹیکنیکل اداروں' انجینئرنگ کے شعبوں اور سائنس کے شعبوں میں طلباء کیلئے بہت طاقتور تھی۔ 1990ء کی دہائی میں سعودی عرب' الجیریا اور ہر کہیں ''دوسری نسل کی مقامیت'' طلباء کے اپنی ملکی زبان میں تعلیم پانے سے ظاہر تھی۔ اسلام پسندوں نے عورتوں میں ٹھوس رغبت پیدا کی ہے اور ترکی میں تو پرانی نسل کی سیکولر عورتوں اور ان کی اسلامیت نہاد بیٹیوں اور پوتیوں' نواسیوں میں واضح تقسیم نمایاں ہے۔ مصری اسلام پسند عسکری گروپوں کا ایک مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی پانچ بڑی خصوصیات ہوتی ہیں جو کہ دوسرے ملکوں کے اسلام پسندوں میں بھی موجود ہیں۔ وہ نوجوان ہوتے ہیں۔ کثرت سے بیس اور تیس برسوں کی درمیانی عمر کے۔ 80 فیصد یونیورسٹی کے طلباء یا یونیورسٹی کے گریجوایٹ ہوتے ہیں۔ ان میں سے آدھے نوجوان ایلیٹ کالجوں یا ٹیکنیکل

اداروں سے جیسے کہ میڈیکل اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں سے آتے ہیں۔ "درمیانے نہ کہ غریب طبقے سے۔" اور اپنے خاندان کی اعلیٰ تعلیم پانے والی پہلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا بچپن چھوٹے قصبوں یا دیہی علاقوں میں بسر کیا ہوتا ہے لیکن بعدازاں شہروں کے رہائشی بن گئے ہوتے ہیں۔ جہاں طلباء اور دانشور اسلام پسند تحریکوں کیلئے کیڈر مہیا کرتے ہیں وہاں شہری درمیانے طبقے کے لوگ بڑی تعداد میں فعال رکن بنتے ہیں۔ کسی حد تک وہ اس طبقے سے بھی آتے ہیں جس کو اکثر "روایتی" درمیانہ طبقہ کہا جاتا ہے یعنی تاجر' بیوپاری' چھوٹے کاروباروں کے مالک' بازاری (BAZAARIS)۔ انہوں نے ایرانی انقلاب میں بنیادی کردار ادا کیا اور الجیریا' ترکی اور انڈونیشیا میں بنیاد پرست تحریکوں کو بھرپور امداد فراہم کی۔ تاہم بنیاد پرست اتنی ہی تعداد میں درمیانے طبقے کے زیادہ "جدید" حصوں سے بھی آتے ہیں۔ اسلام پسندوں میں "اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی ذہین نوجوان بہت بڑی تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔" یعنی ڈاکٹر' وکیل' انجینئر' سائنسدان' اساتذہ' سول سرونٹس۔

اسلام پسندوں کا تیسرا کلیدی عنصر شہروں میں حال ہی میں نقل مکانی کر کے آنے والے لوگ ہیں۔ ساری اسلامی دنیا میں 1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی میں شہری آبادی ڈرامائی شرح سے بڑھی تھی۔ جانوروں جیسی جھونپڑ پٹیوں میں ہجوم کرنے والے یہ اربن مائیگرنٹس (شہری تارکین وطن) اسلامی تنظیموں کی فراہم کردہ معاشرتی خدمات کے خواہاں اور ان سے مستفید ہونے والے تھے۔ ارنسٹ گیلز بتایا ہے کہ اسلام ان "تازہ تازہ جڑ سے اکھڑے ہوئے عام لوگوں" کو "ایک باوقار تشخص" عطا کرتا ہے۔ استنبول اور انقرہ' قاہرہ اور اسیوط' الجزائر اور فیض اور غزہ کی پٹی میں اسلام پسند پارٹیاں کامیابی کے ساتھ "پس ماندہ اور املاک سے محروم لوگوں" کو راغب اور منظم کر چکی ہیں۔ اولیور رائے کہتا ہے "انقلابی اسلام کا قوام جدید معاشرے کی ایک پیداوار ہے۔ ...... نئے شہری بننے والے لاکھوں کسان جنہوں نے عظیم مسلم میٹرو پولسوں کی آبادیوں کو تین گنا بڑھا دیا ہے۔"

1990ء کی دہائی کے وسط سے صرف ایران اور سوڈان میں واضح طور پر اسلام پسند حکومتیں قوت پا سکی ہیں۔ مسلم ملکوں کی تھوڑی سی تعداد جیسے کہ ترکی اور پاکستان جمہوری جواز

کا کچھ دعویٰ رکھنے والی حکومتوں کے حامل ہیں۔ بیشتر مسلم ملکوں کی حکومتیں غیر جمہوری ہیں یعنی ان میں بادشاہت' یک جماعتی نظام' فوجی حکومتیں' شخصی آمریتیں قائم ہیں یا ان کے کچھ آمیزے جو عمومی طور پر ایک محدود خاندان یا قبیلے پر استوار ہیں اور چند مثالوں میں بیرونی حمایت کے انتہائی محتاج ہیں۔ مراکش اور سعودی عرب دو ایسی حکومتیں ہیں جنہوں نے اسلامی جواز کو اپنایا ہے۔ تاہم ان حکومتوں میں سے بیشتر اپنے اقتدار کو اسلامی' جمہوری یا قوم پرستانہ اقتدار کی بنیادوں پر جائز نہیں کروا سکیں۔ یہ حکومتیں ظالم' کرپٹ اور اپنے معاشروں کی حاجات اور امیدوں سے الگ تھلگ تھیں۔ کچھ حکومتیں خود کو طویل مدت تک برقرار رکھ سکتی ہیں تاہم جدید دنیا میں ان کے بدلنے یا ٹوٹ جانے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ نتیجتاً 1990ء کی دہائی کے وسط میں متبادل کا سوال مرکزی اہمیت اختیار کر گیا یعنی ان کا جانشین کون یا کیا ہوگا؟ 1990ء کی دہائی کے وسط میں سب سے زیادہ ممکنہ جانشین قریباً ہر ملک میں ایک اسلام پسند نظام تھا۔

1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی میں ساری دنیا میں جمہوریت پذیری کی لہر حاوی تھی جس نے کئی درجن ملکوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس لہر نے مسلم معاشروں پر ایک اثر چھوڑا لیکن یہ محدود سا تھا۔ جہاں جمہوری تحریکیں جنوبی یورپ' لاطینی امریکہ' مشرقی ایشیائی محیط اور وسطی یورپ میں مضبوط ہو رہی تھیں اور اقتدار میں آ رہی تھیں وہاں عین اسی وقت مسلم ملکوں میں اسلام پسند تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ اسلام پسندی عیسائی معاشروں میں مطلق العنانیت کی جمہوری مخالفت کا ایک بنیادی متبادل تھی نیز اس کے وجود میں آنے کے اسباب بھی ایک سے ہی تھے۔ پولینڈ میں پوپ کمیونسٹ حکومت کو ختم کرنے میں مرکزی کردار رکھتا ہے اور آیت اللہ ایران میں شاہ کی حکومت کو گرانے میں۔

1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی میں مسلم ملکوں میں اسلام پسند تحریکیں حکومتوں کی مخالفت میں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کی طاقت ایک اعتبار سے مخالفت کے کسی متبادل ذریعے کی کمزوری کا نتیجہ تھی۔ بائیں بازو کی اور کمیونسٹ تحریکیں سوویت یونین کے انہدام کے بعد وجود کھو بیٹھی ہیں۔ بیشتر مسلم ملکوں میں لبرل جمہوری مخالف گروپ موجود ہیں لیکن

ان میں مغربی جڑوں یا رابطوں کے حامل دانشور اور دوسرے لوگ ہی شامل ہیں۔ محض اتفاقی استثنا کے، مسلم معاشروں میں لبرل ڈیموکریٹ عوامی حمایت حاصل کرنے کے اہل نہیں تھے حتیٰ کہ اسلامی لبرل ازم بھی جڑیں پکڑنے میں ناکام ہو گیا۔ مسلم معاشروں میں لبرل جمہوریت کی عمومی ناکامی۔ 1800ء سے شروع ہو کر پوری ایک صدی پر محیط ہے۔ اس ناکامی کی وجہ اسلامی ثقافت کی مغربی لبرل تصورات کے حوالے سے معاندانہ ساخت ہے۔

احیا کی قوت اور اسلام پسند تحریکوں نے حکومتوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ اسلامی اداروں اور اعمال کو فروغ دیں۔ اپنی اسلامی وابستگی کو نمایاں کرنے کیلئے حکومتی لیڈر اوزال، سوہارتو، کریموف تیزی سے حج کا سفر اختیار کرتے رہے ہیں۔

مسلم ملکوں کی حکومتیں قانون کو اسلامی بنانے کا بھی عمل کرتی رہی ہیں۔ انڈونیشیا میں اسلامی قانونی تصورات کو سیکولر نظام قانون میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ملائیشیا نے اپنی کثیر غیر مسلم آبادی کی ترجمانی کیلئے دو نظام قانون وضع کئے ہیں: ایک اسلامی اور ایک سیکولر۔ جنرل ضیاء الحق کے عرصہ اقتدار میں پاکستان میں قانون اور معیشت کو اسلامی بنانے کی وسیع کوششیں کی گئیں۔ اسلامی سزائیں متعارف کروائی گئیں، شرعی عدالتوں کا ایک نظام وضع کیا گیا اور شریعت کو ملک کا اعلیٰ قانون قرار دے دیا گیا۔

عالمی مذہبی احیا کی دوسری صورتوں کی طرح اسلامی احیا بھی جدیدیت نیز اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششوں کی پیداوار ہے۔ اس کی نمایاں وجوہات بھی وہی ہیں جو کہ مقامیت کے رجحان کی باعث ہیں یعنی شہریت پذیری، سماجی بیداری، خواندگی اور تعلیم کی اونچی شرحیں، ذرائع مواصلات کا زیادہ استعمال اور مغربی اور دیگر ثقافتوں سے وسیع تعامل۔ ان پیشرفتوں نے بستی اور برادری کے روایتی رشتوں کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور بیگانگی کو جنم دیا اور تشخص کے بحران کو پیدا کیا۔ اسلامی علامات، وابستگیاں اور عقائد ان نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اسلام پسند فلاحی تنظیمیں جدیدیت کے عمل میں گرفتار مسلموں کی سماجی، ثقافتی اور معاشی ضرورتوں کو۔ مسلم جدیدیت کے قطب نما اور موثر کے طور پر اسلامی نظریات، اعمال اور اداروں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اسلامی احیا ''مغرب کی زوال آمادہ طاقت واقتدار اور وقار کا بھی پیدا کردہ ہے...... جیسے ہی مغربی برتری ختم ہوگی' اس کے تصورات اور ادارے کشش کھو بیٹھیں گے۔'' زیادہ خصوصی بات یہ ہے کہ احیا کو 1970ء کی دہائی کے تیل کے عروج نے بڑھایا ہے جس نے کئی مسلم قوموں کی دولت اور قوت میں اضافہ کیا۔ انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ مغرب کے حوالے سے ماضی میں موجود حاکمیت اور اطاعت کے تعلقات بحال کرے۔ جیسا کہ جان بی کیلی نے تبصرہ کیا ہے کہ ''مغربیوں کو تحقیر آمیز سزائیں دے کر سعودی بلاشبہ دہری تسکین حاصل کرتے ہیں؛ نہ صرف یہ سعودی عرب کی طاقت اور آزادی کا اظہار ہوتی ہیں بلکہ یہ عیسائیت کی تذلیل اور اسلام کی برتری کا اظہار بھی ہوتی ہیں۔'' تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ریاستوں کے اقدامات کو ''اگر ان کے تاریخی' مذہبی' نسلی اور ثقافتی تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیسائی مغرب پر مسلم مشرق کو بالادست دیکھنا چاہتے ہیں۔'' سعودی' لیبیائی اور دوسری حکومتیں اسلامی احیا کو فروغ دینے کیلئے تیل کی دولت استعمال کرتی آئی ہیں اور مسلم دولت نے مسلموں کو مغربی ثقافت کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی ثقافت کو اپنانے اور غیر اسلامی معاشروں میں اسلام کے مقام اور اہمیت کے اثبات کیلئے تیار کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مغربی دولت مغربی ثقافت کی برتری کا ثبوت سمجھی گئی' تیل کی دولت کو اسلام کی برتری کی شہادت سمجھا گیا۔

تیل کی قیمتوں سے وابستہ ابھار تو 1980ء کی دہائی میں اپنا زور کھو بیٹھا تاہم آبادی میں اضافہ اب بھی احیا کی روح و رواں ہے۔ جہاں مشرقی ایشیا کا ابھار معاشی ترقی کی قیاسی شرحوں سے بڑھا ہے وہاں اسلام کا احیا اسی طرح کی آبادی میں اضافے کی قیاسی شرحوں سے بڑھا ہے۔ اسلامی ملکوں خصوصاً بلقان' شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا میں اپنے ہمسایہ ملکوں اور عمومی طور پر ساری دنیا کے مقابلے میں آبادی میں اضافہ بہت ہی زیادہ ہے۔ 1965ء سے 1990ء کے دوران میں دنیا کی کل آبادی میں 3.3 ارب سے 5.3 ارب کا اضافہ ہوا جو کہ 1.85 فیصد سالانہ بنتا ہے۔ مسلم معاشروں میں ہمیشہ شرح اضافہ 2.0 رہی اور اکثر 2.5 فیصد تک پہنچ گئی اور ایسے وقت بھی آئے جب یہ 3.0 فیصد سے بھی بڑھ گئی۔ تمام مسلم ملکوں میں شرح آبادی

زیادہ ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں آبادی میں اضافہ کی شرح 2.5 فیصد سالانہ ہے۔ مجموعی طور پر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے مسلم 1980ء میں دنیا کی کل آبادی کا 18 فیصد تھے اور 2000ء میں ان کے 20 فیصد سے زیادہ ہونے کی امید ہے نیز 2025ء میں 30 فیصد۔

آنے والے برسوں میں مسلم آبادی میں نوجوانوں کا تناسب بہت غیر متوازن ہوگا جس میں ٹین ایجرز اور بیس سال کی عمر کے نوجوان بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے۔ مزید یہ کہ اس عمر کے نوجوان بڑی تعداد میں شہری اور کم از کم سیکنڈری تعلیم یافتہ ہوں گے۔ حجم اور معاشرتی بیداری کا یہ امتزاج تین اہم سیاسی اثرات کا حامل ہے:۔

اول

نوجوان لوگ احتجاج' عدم استحکام' اصلاح اور انقلاب کے موید ہوتے ہیں۔ تاریخی طور پر نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی اور اس نوع کی تحریکوں کی موجودگی متصل ہوا کرتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ "پروٹسٹنٹ اصلاح تاریخ میں نوجوانوں کی غیر معمولی تحریکوں کی ایک مثال ہے۔" جیک گولڈ سٹون کہتے ہیں کہ آبادی میں اضافہ سترہویں صدی کے وسط میں یوریشیا میں اور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں دو انقلابی لہروں کا مرکزی عامل تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری عشروں میں "جمہوری انقلاب کے دور" میں مغربی ملکوں میں نوجوانوں کا تناسب بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ یورپی معاشروں میں صنعت پذیری اور نقل مکانی سے نوجوانوں کا سیاسی اثر گھٹ کے رہ گیا۔ تاہم نوجوانوں کا تناسب دوبارہ 1920ء کی دہائی میں بڑھا جس نے فاشسٹ اور دوسری انتہا پسندانہ تحریکوں کیلئے رنگروٹ مہیا کئے۔ چار عشروں بعد دوسری عالمی جنگ کے بعد کی زیادہ آبادی نے 1960ء کی دہائی میں سیاسی احتجاجوں اور مظاہروں کو جنم دیا۔

اسلام کے نوجوان اسلامی احیاء میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ جونہی 1970ء کی دہائی میں احیا شروع ہوا اور 1980ء کی دہائی میں اس نے زور پکڑا۔ بڑے مسلم ملکوں میں نوجوانوں (یعنی 15 سے 24 سال کی عمر کے لوگوں) کا آبادی میں تناسب بہت بڑھا اور 20 فیصد سے بھی تجاوز کر گیا۔ بہت سے مسلم ملکوں میں 1970ء کی دہائی اور 1980ء کی

دہائی میں نوجوان بہت زیادہ تعداد میں ہو گئے ہیں یعنی بیس فیصد سے زیادہ سعودی عرب کی آبادی میں نوجوانوں کا اضافہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ایک اندازے کے مطابق اس سے قدرے کم ہو گا۔ یہ نوجوان اسلام پسند تنظیموں اور سیاسی تحریکوں کیلئے رنگروٹ مہیا کرتے ہیں۔ شاید یہ مکمل طور پر اتفاقی امر نہیں ہے کہ ایرانی آبادی میں نوجوانوں کا تناسب 1970ء کی دہائی میں ڈرامائی انداز میں بڑھا۔ اس عشرے کے آخری نصف میں 20 فیصد کو پہنچا اور یہ کہ 1979ء میں ایرانی انقلاب وقوع پذیر ہو گیا یا یہ کہ الجیریا میں نوجوان آبادی 1990ء کی دہائی میں اس نشان تک پہنچ گئی اور اسلام پسند ایف آئی ایس نے عوامی مقبولیت حاصل کر کے انتخابی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ **1988ء میں سعودی ولی عہد عبداللہ نے کہا کہ ان کے ملک کیلئے سب سے بڑا خطرہ نوجوانوں میں اسلامی بنیاد پرستی میں اضافہ ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں یہ خطرہ اکیسویں صدی میں برقرار رہے گا۔**

بڑی آبادیوں کو زیادہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے نتیجتاً زیادہ آبادی والے معاشروں کے لوگ کم آبادی والے لوگوں سے لڑتے ہیں اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اسلامی اضافۂ آبادی مسلموں اور ان کی سرحدوں کے ساتھ واقع غیر مسلموں کے مابین جھگڑے کا ایک اہم سبب ہے۔ آبادی کے دباؤ اور معاشی جمود نے مغرب اور دیگر غیر مسلم معاشروں میں مسلم نقل مکانی کو فروغ دیا ہے۔

بدلتے ہوئے چیلنج

کوئی بھی معاشرہ دہرے اعداد میں معاشی ترقی کو لامحدود مدت تک برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ ایشیائی معاشی ابھار اکیسویں صدی کی ابتداء میں کسی وقت کم ہو سکتا ہے۔ ایک ایک کر کے ''معاشی معجزہ'' ریاستیں دیکھیں گی کہ ان کی شرح ہائے پیداوار گر گئی ہیں اور پیچیدہ معیشتوں میں ''نارمل'' سطحوں پر ٹھہر جائیں گی۔ اسی طرح کوئی مذہبی احیا یا ثقافتی تحریک لامحدود مدت تک برقرار نہیں رہتی اور کسی وقت اسلامی احیا بھی تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو جائے گا۔ ایسا اس وقت ہو گا جب اکیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں آبادی کا اضافہ اسے کمزور

کردے گا۔ اس وقت عسکریت پسندوں، جنگجوؤں اور تارکین وطن کے درجے گھٹ جائیں گے نیز اسلام کے اندر اور مسلموں اور دیگر لوگوں کے درمیان جھگڑے کم ہو جائیں گے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات قریبی تو نہیں ہوں گے تاہم کم معاندانہ ہو جائیں گے۔

ایشیا میں معاشی ترقی ورثے میں امیر ترین، زیادہ پیچیدہ معیشتیں چھوڑے گی جن کے ساتھ ٹھوس بین الاقوامی شمولیت، خوشحال بورژوازی اور آسودہ حال درمیانہ طبقہ ہو گا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ تکثیری اور جمہوری ریاست کا امکان ہے تاہم ضروری نہیں ہے کہ وہ مغرب دوست ہو۔

اسلامی احیا، اصلاح کی تحریکوں کے مانند، بہت اہم ورثے چھوڑے گا۔ مسلموں میں باہمی یکسانیت اور غیر مسلموں سے امتیاز کا شعور زیادہ بیدار ہو گا۔ احیا اسلامی معاشروں کے اندر اور ان سے بالاتر اسلام پسند سماجی، ثقافتی اور معاشی تنظیموں کا ایک جال (نیٹ ورک) چھوڑے گا۔ احیا یہ بھی ظاہر کرے گا کہ اسلام اخلاقی، شناختی، معنویتی اور عقائدی مسئلوں کا "حل" ہے تاہم معاشرتی انصاف، سیاسی جبر، معاشی پسماندگی اور عسکری کمزوری کا نہیں۔ یہ ناکامیاں سیاسی اسلام کے واہمے کو ختم کر دیں گی، اس کے خلاف ردعمل پیدا کریں گی اور ان مسئلوں کے متبادل "حلوں" کی تلاش کو جنم دیں گی۔ قیاساً مغرب دشمن قوم پرستی پیدا ہو سکتی ہے۔

اگر چین کی ترقی یونہی جاری رہی تو ایشیائی معاشی ترقی مغرب کے غلبے والے بین الاقوامی نظام میں عدم توازن پیدا کر دے گی اور تہذیبوں کے درمیان قوت کے توازن میں بہت بڑی تبدیلیاں پیدا کرے گی۔ مزید برآں ہندوستان تیز ترین معاشی ترقی کر سکتا ہے اور عالمی معاملات میں ایک اہم مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اسی اثنا میں مسلم اضافۂ آبادی مسلم معاشروں اور ان کے ہمسایوں کیلئے عدم استحکام پیدا کرنے والا عامل ثابت ہو گا۔ سیکنڈری تعلیم کے حامل نوجوانوں کی کثیر تعداد اسلامی احیا کو قوت مہیا کرتی رہے گی اور مسلم عسکریت اور نقل مکانی کو فروغ دے گی۔ اس کے نتیجے میں اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں غیر مغربی قوت اور ثقافت میں ایک احیا دیکھا جائے گا اور غیر مغربی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مغرب سے اور آپس میں متصادم ہو جائیں گے۔

☆☆☆

حصہ سوم

تہذیبوں کا اُبھرتا ہوا نظام

باب 6

عالمی سیاست کی تشکیل نو

نئی گروپ بندیوں کی جستجو: تشخص کی سیاست

عالمی سیاست کی ثقافتی خطوط پر نئی تشکیل کے عمل کو جدیدیت (ماڈرنائزیشن) نے تیز تر کر دیا ہے۔ ایک ہی جیسی ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اور ملک یکجا ہو رہے ہیں۔ مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اور ملک الگ ہو رہے ہیں۔ نظریات اور سپر پاور تعلقات کی بنیاد پر قائم اتحادوں اور صف بندیوں کی جگہ ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر اتحاد اور صف بندیاں قائم ہو رہی ہیں۔ نئی سیاسی سرحدیں ثقافتی سرحدوں یعنی نسلی، مذہبی اور تہذیبی سرحدوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے وجود میں آ رہی ہیں۔ ثقافتی برادریاں سرد جنگ کے بلاکوں کی جگہ لے رہی ہیں اور تہذیبوں کے مابین سرحدیں عالمی سیاست (گلوبل پالیٹکس) میں مرکزی خطوط کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔

سرد جنگ کے دوران میں کوئی ملک غیر جانبدار، غیر اتحادی ہو سکتا تھا جیسا کہ بہت سے ملک تھے یا اپنی جانبداری کو ایک فریق سے دوسرے فریق کی طرف تبدیل کر سکتا تھا جیسا کہ کچھ ملکوں نے کیا تھا۔ کسی ملک کے لیڈر اس قسم کا چناؤ اپنی سلامتی (سیکورٹی) کے مفادات، توازن طاقت کے اپنے تجزیے اور اپنی نظریاتی ترجیحات کی بنیادوں پر کر سکتے

تھے تاہم نئی دنیا میں کسی ملک کی دوستی اور دشمنی کے تعین میں ثقافتی تشخص مرکزی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی ملک سرد جنگ کے اتحاد سے گریز کر سکتا تھا کیونکہ اس کو تشخص کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس سوال کہ ''تم کس فریق کے ساتھ ہو؟'' کی جگہ ایک انتہائی بنیادی سوال نے لے لی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''تم کون ہو؟'' ہر ریاست کو اس سوال کا ایک جواب دینا ہے۔ وہ جواب' اس کا ثقافتی تشخص' عالمی سیاست میں اس ریاست کے مقام اور اس کے دوستوں اور دشمنوں کا تعین کرتا ہے۔ 1990ء کی دہائی نے تشخص کے عالمی بحران کے آغاز کا نظارہ کیا ہے۔ کوئی فرد ہر کہیں دیکھ سکتا تھا کہ لوگ سوال دریافت کر رہے تھے ''ہم کون ہیں؟ ہمارا کس سے تعلق ہے؟'' اور ''کون ہمارا نہیں ہے؟'' یہ سب سوالات نہ صرف سابق یوگوسلاویہ کی طرح نئی قومی ریاستوں کو قائم کرنے کی کوشش کرنے والے لوگوں کیلئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ بہت زیادہ عمومی طور پر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے وسط میں جن ملکوں کے اندر قومی تشخص کے سوالات پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ ہوا ان میں الجیریا' کینیڈا' چین' جرمنی' برطانیہ عظمیٰ' ہندوستان' ایران' جاپان' میکسیکو' مراکش' روس' جنوبی افریقہ' شام' تیونس' ترکی' یوکرائن اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ شامل ہیں۔ تشخص کے مسائل (ایشوز) ان ملکوں میں خصوصاً شدت کے ساتھ پیدا ہوئے جہاں پر کہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بڑے گروپ موجود تھے۔

تشخص کے بحران سے نبرد آزما ہونے کیلئے لوگوں کے نزدیک خون اور عقیدے' مذہب اور خاندان بہت ہی اہم ہوا کرتے ہیں۔ لوگ ان لوگوں پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں جو ان کی نسل' مذہب' زبان' اقدار و روایات اور اداروں سے تعلق رکھتے ہوں اور مختلف نسل' مذہب' زبان' اقدار و روایات اور اداروں سے تعلق رکھنے والوں سے خود کو الگ کر لیتے ہیں۔ براعظم یورپ میں آسٹریا' فن لینڈ اور سویڈن ثقافتی حوالے سے مغرب کا حصہ ہیں لیکن سرد جنگ کے دوران میں انہیں مغرب سے الگ اور غیر جانب دار ہونا پڑا تھا۔ اب وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ یورپی یونین میں اپنے ثقافتی رشتہ داروں

میں شامل ہو سکیں۔ سابقہ معاہدۂ وارسا میں شامل کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ملک پولینڈ' ہنگری' چیک ری پبلک اور سلوویکیا اب ناٹو اور یورپی یونین کی رکنیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بالٹک کی ریاستیں ان کے پیچھے قطار میں کھڑی ہوئی ہیں۔ یورپی طاقتوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ایک مسلمان ریاست ترکی کو یورپی یونین میں شامل دیکھنا نہیں چاہتی ہیں اور نہ ہی براعظم یورپ میں ایک دوسری مسلمان ریاست بوسنیا کے قیام پر خوش ہیں۔ شمال میں سوویت یونین کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بالٹک جمہوریاؤں کے آپس میں اور سویڈن اور فن لینڈ کے ان کے ساتھ اتحاد کے نئے (اور پرانے) نقشے ابھرے ہیں۔ سویڈن کے وزیراعظم نے روس کو شدت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ بالٹک جمہوریائیں سویڈن کی قریبی ہمسایہ ہیں اور یہ کہ سویڈن ان کے خلاف کسی روسی جارحیت پر غیر جانبدار نہیں رہے گا۔

اسی طرح کے نئے اتحاد بلقان میں وجود میں آ رہے ہیں۔ سرد جنگ کے دوران میں یونان اور ترکی ناٹو میں شامل تھے جبکہ بلغاریہ اور رومانیہ معاہدۂ وارسا میں شامل تھے۔ یوگوسلاویہ غیر جانبدار تھا اور البانیہ الگ تھلگ تھا تاہم کبھی کبھار کمیونسٹ چین کا اتحادی سمجھا جاتا تھا۔ اب سرد جنگ کے ان اتحادوں کی جگہ تہذیبی اتحادوں نے لے لی ہے جن کی جڑیں اسلام اور قدامت پسندی میں ہیں۔ بلقان کے لیڈر یونانی' سربی' بلغاروی اتحاد کو نمایاں کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یونانی وزیراعظم نے الزام لگایا ہے کہ "بلقان کی جنگیں قدامت پرستانہ معاہدوں کے زلزلے کو سطح پر لے آئی ہیں...... یہ ایک اتحاد ہے۔ یہ خوابیدہ تھا لیکن بلقان میں ہونے والی پیش رفتوں سے یہ ٹھوس حقیقت کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایک انتہائی غیر ٹھوس' سیال دنیا میں لوگ تشخص اور تحفظ (سیکورٹی) کو تلاش کر رہے ہیں۔ لوگ کسی اجنبی سے خود کو بچانے کیلئے جڑیں اور رشتے ڈھونڈ رہے ہیں۔" انہی خیالات کی بازگشت سربیا کی حزب اختلاف کی جماعت کے بڑے لیڈر کے اس بیان میں موجود ہے "جنوب مشرقی یورپ کی صورت حالات کا تقاضا ہے کہ قدامت پرست ملکوں کا نیا بلقانی اتحاد جلد وجود میں آ جائے گا جس میں سربیا'

بلغاریہ اور یونان شامل ہوں گے اور اس کا مقصد اسلام کی تجاوزات (پھیلاؤ) سے بچاؤ ہو گا۔'' شمال کی طرف دیکھتے ہوئے قدامت پرست سربیا اور رومانیہ ہنگری کے ساتھ اپنے مشترکہ مسائل کا سامنا کرنے کیلئے آپس میں قریبی تعاون کر رہے ہیں۔ سوویت خطرے کے ختم ہو جانے کے بعد یونان اور ترکی کا ''غیر فطری'' اتحاد جوہری طور پر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے جیسا کہ ان کے درمیان بحرا ئیجیئن' قبرص' ان کے عسکری توازن' ناٹو اور یورپی یونین میں ان کے کردار اور امریکہ کے ساتھ ان کے تعلقات کے معاملوں میں اختلافات میں شدت پیدا ہوئی ہے۔ ترکی نے بلقانی مسلمانوں کے محافظ ونگہبان کے طور پر اپنے کردار کو دوبارہ منوانا شروع کیا ہے اور بوسنیا کو امداد فراہم کر رہا ہے۔ روس سابق یوگوسلاویہ میں قدامت پرست سربیا کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ جرمنی کیتھولک کروشیا کو تعاون دے رہا ہے۔ مسلم ملک بوسنیائی حکومت کو مدد دے رہے ہیں اور سرب کروشیائیوں' بوسنیائی اور البانوی مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ مجموعی طور پر بلقان دوبارہ مذہبی بنیادوں پر بلقانی ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میشا گلینی نے تبصرہ کیا ہے کہ ''دو محور ابھر رہے ہیں۔ ایک نے مشرقی قدامت پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور ایک نے اسلامی جامہ پہنا ہوا ہے۔'' اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ ''ایک بلغراد/ ایتھنز محور اور البانوی/ ترکی اتحاد کے مابین اثر ورسوخ کی کشمکش ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر شروع ہو جائے۔''

اسی دوران میں سابق سوویت یونین کے اندر قدامت پرست بیلا روس' مالدووا اور یوکرائن روس کی طرف جھک رہے ہیں نیز آرمینیائی اور آذری آپس میں لڑ رہے ہیں اور ان کے روسی اور ترک ہم نسل ان کی مدد کر رہے ہیں نیز جھگڑے کو محدود رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ روسی فوج تاجکستان میں اسلامی بنیاد پرستوں اور چیچنیا میں اسلامی قوم پرستوں سے لڑ رہی ہے۔ سابق سوویت یونین کی اسلامی جمہوریائیں آپس میں معاشی اور سیاسی اتحاد کی بہت سی صورتوں کو متشکل کرنے کیلئے کام کر رہی ہیں نیز اپنے دوسرے اسلامی ہمسایوں سے معاہدے کرنے کیلئے کوشاں ہیں جبکہ ترکی' ایران اور سعودی عرب ان نئی ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ برصغیر میں

کشمیر کے حوالے سے ہندوستان اور پاکستان میں تنازع موجود ہے۔ ٭ کشمیر میں لڑائی شدید ہوتے ہوئے ان کا عسکری توازن بگڑ رہا ہے۔ ہندوستان کے اندر مسلمانوں اور ہندو بنیاد پرستوں میں جھگڑے شروع ہو چکے ہیں۔

مشرقی ایشیا میں جو چھ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا گھر ہے ایک بار پھر مسلح ہونے کا عمل بڑھ رہا ہے اور علاقائی جھگڑے شروع ہو رہے ہیں۔ تین چھوٹے چین یعنی تائیوان' ہانگ کانگ اور سنگاپور اور جنوب مشرقی ایشیا میں سمندر پار چینی برادریاں (کمیونیٹیز) چین پر انحصار کر رہی ہیں اور اس میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ دونوں کوریا کسی حد تک جھجکتے ہوئے لیکن بامعنی طور پر اتحاد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے اندر مسلمانوں کے تعلقات چینیوں اور عیسائیوں کے ساتھ تناؤ کا شکار ہو رہے ہیں اور اکثر اوقات پرتشدد کارروائیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔

لاطینی امریکہ میں' معاشی اتحاد' مرکوسر' معاہدۂ ایڈینٹن' سہ فریقی معاہدہ (میکسیکو' کولمبیا' وینزویلا) وسط امریکی مشترکہ منڈی' ایک نئی زندگی پا رہے ہیں۔ اس اشتراک نو کی اساس اس نکتے ہے پر جو یورپی یونین کی صورت میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے کہ معاشی اتحاد اس وقت زیادہ تیزی سے فروغ پاتا ہے جب اس کی بنیاد ثقافتی اشتراک پر رکھی گئی ہو۔ اسی دوران میں امریکہ اور کینیڈا کوشش کر رہے ہیں کہ میکسیکو کو نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایریا میں شامل کیا جائے۔ اس کوشش کا انحصار بہت حد تک میکسیکو پر ہے کہ وہ خود کو ثقافتی طور پر لاطینی امریکی سے شمالی امریکی کی حیثیت دلاتا ہے کہ نہیں۔

سرد جنگ کے نظام (آرڈر) کے ختم ہو جانے سے ملکوں نے نئی دوستیاں' دشمنیاں قائم اور مضبوط کرنا شروع کر دی ہیں۔ یہ ملک نئی گروپ بندیاں قائم کرنے کیلئے کوشاں ہیں اور یہ ملک ایسے ملکوں کے ساتھ گروپ بندی کے متلاشی ہیں جن کی ثقافت اور تہذیب ان سے مشترک ہو۔ سیاستدان استعانت طلب کر رہے ہیں اور عوام ان "عظیم" ثقافتی برادریوں سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں جو قومی ریاست کی حد بندیوں سے بالا ہیں۔ بشمول "عظیم ہنگری' عظیم کروشیا' عظیم آذربائیجان' عظیم روس' عظیم البانیہ' عظیم ایران"

اور ''عظیم ازبکستان''۔

کیا سیاسی اور معاشی اتحاد ہمیشہ ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر استوار رہیں گے؟ بالکل نہیں۔ توازن طاقت کے مسائل کی وجہ سے تہذیبوں سے بالا اتحاد قائم ہوں گے جیسا کہ ہیپسبرگز کے خلاف فرانسس اول نے عثمانیوں کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ مزید یہ کہ ریاستوں کے مفادات کو ایک دور میں پورا کرنے والے اتحادوں کے خاکے نئے دور میں بھی برقرار رہیں گے۔ اگرچہ وہ کمزور تر اور قدرے کم بامعنی ہوں گے اور انہیں نئے دور کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنانا ہوگا۔ یونان اور ترکی بلاشبہ ناٹو کے رکن رہیں گے تاہم ان کے تعلقات ناٹو کے دوسرے رکن ملکوں کے ساتھ کمزور ہو جائیں گے۔ امریکہ کے تعلقات جاپان اور کوریا کے ساتھ اسی طرح کے رہیں گے۔ امریکہ کے اسرائیل کے ساتھ حقیقی اتحاد اور پاکستان کے ساتھ سلامتی کے معاہدے برقرار رہیں گے لیکن کمزور ہوں گے۔ کثیر التہذیبی بین الاقوامی تنظیموں مثلاً آسیان کو اپنا اتحاد برقرار رکھنے میں بڑھتی ہوئی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان جیسے ملکوں کو جو سرد جنگ کے دوران میں مختلف سپر پاوروں کے اتحادی رہے ہیں اب اپنے مفادات کو نئے سرے سے متعین کرنا ہوگا اور ثقافتی سیاست (کلچرل پالیٹکس) کی حقیقتوں کی نمائندگی کرنے والے اتحادوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ افریقی ملک جو اس مغربی امداد پر انحصار کرتے آئے ہیں جو کہ سوویت اثرات کو روکنے کیلئے دی جاتی تھی اب لیڈر شپ اور امداد کیلئے جنوبی افریقہ کی طرف زیادہ دیکھ رہے ہیں۔ ثقافتی اشتراک لوگوں کے درمیان تعاون اور اتفاق و اتحاد کو اور ثقافتی اختلافات دوریوں اور جھگڑوں کو کیوں بڑھاتے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر کوئی بہت سی شناختوں کا حامل ہوتا ہے جو ایک دوسری سے متقابل ہو سکتی ہیں یا ایک دوسری کو مضبوط کر سکتی ہیں مثلاً خاندانی' پیشہ ورانہ' ثقافتی' ادارہ جاتی' علاقائی' تعلیمی' گروہی' نظریاتی اور دوسری شناختیں۔ ایک جہت میں قائم شناختیں / ہم آہنگیاں دوسری جہت میں قائم شناختوں / ہم آہنگیوں سے ٹکرا سکتی ہیں۔ اس کی ایک

کلاسیکی مثال یہ ہے کہ 1914ء میں جرمن محنت کشوں نے بین الاقوامی پرولتاریہ کے ساتھ ''طبقاتی ہم آہنگی'' کو منتخب کیا جبکہ ''قومی ہم آہنگی'' جرمن عوام اور سلطنت سے قائم کی۔ ہم عصر دنیا میں ثقافتی ہم آہنگی ڈرامائی طور پر دوسری ہم آہنگیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل کر رہی ہے۔

ایک ہی جہت میں قائم شناخت فوری آمنے سامنے کی سطح پر عمومی طور پر بہت زیادہ بامعنی ہوتی ہے۔ اگرچہ چھوٹی شناختیں بڑی شناختوں سے ضروری نہیں ہے کہ متصادم ہوں۔ کوئی فوجی افسر ادارہ جاتی سطح پر اپنی کمپنی، رجمنٹ، ڈویژن اور فوج کے ساتھ شناخت کا حامل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص ثقافتی سطح پر اپنی قوم، قبیلے، نسلی گروہ، قومیت، مذہب اور تہذیب کے حوالے سے پہچان کا حامل ہوسکتا ہے۔ ثقافتی شناخت کی نچلی سطح پر بڑھتی ہوئی اہمیت اعلیٰ سطحوں پر زیادہ مضبوط ہوسکتی ہے جیسا کہ برک نے تجویز کیا ہے ''کُل کے ساتھ محبت اس ضمنی جانب داری کی وجہ سے ختم نہیں ہوگئی ...... عام لوگوں کیلئے سب ڈویژن سے جڑت، اس چھوٹی پلاٹون سے محبت، جس سے ہم معاشرے کے اندر تعلق رکھتے ہیں پہلا اصول ہوتا ہے۔'' ایسی دنیا میں جہاں ثقافت اہمیت رکھتی ہو قبیلے اور نسلی گروہ پلاٹون ہوتے ہیں، قومیں رجمنٹیں ہوتی ہیں اور تہذیبیں فوجیں ہوتی ہیں۔ پوری دنیا میں لوگوں میں بڑھتا ہوا یہ رجحان کہ وہ ثقافتی خطوط پر اپنے آپ کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں نشاندہی کرتا ہے کہ ثقافتی گروہوں میں جھگڑے زیادہ اہمیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ تہذیبیں وسیع ترین ثقافتی اکائیاں ہوتی ہیں لہٰذا مختلف تہذیبوں کے گروپوں کے مابین اختلافات عالمی سیاست میں مرکزی اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ثقافتی شناخت کی بڑھتی ہوئی اہمیت، جیسا کہ تیسرے اور چوتھے باب میں وضاحت کی گئی ہے نتیجہ ہے انفرادی سطح پر سماجی، معاشی (سوشو اکنامک) جدیدیت کا جہاں بے وطنی اور تنہائی نے زیادہ بامعنی شناختوں کی ضرورت کو پیدا کیا ہے نیز معاشروں کی سطح پر جہاں غیر مغربی معاشروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اہلیتوں نے مقامی شناختوں اور ثقافت کے احیا کو بڑھاوا دیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی بھی سطح پر شناخت...... شخصی، قبائلی، نسلی، تہذیبی.. ''دوسرے'' کے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعین ہو سکتی ہے۔ ''دوسرا'' یعنی ایک مختلف شخص، قبیلہ، نسل یا تہذیب۔ تاریخی طور پر ایک ہی تہذیب کی ریاستوں یا دوسری اکائیوں کے مابین رشتے مختلف تہذیب کی ریاستوں یا دوسری اکائیوں کے مابین رشتوں سے مختلف رہے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ مختلف برتاؤ کے پس پشت مختلف نظام (کوڈز) کارفرما رہے ہیں کہ ایک تو ہم جیسے ہیں اور دوسرے جو نہیں ہیں، وہ ''وحشی'' ہیں۔ عیسائیت کو ماننے والی قوموں کے باہمی تعلقات استوار کرنے والے اصول ترکوں اور ''کافروں'' کے ساتھ تعلقات قائم کرنے والے اصولوں سے مختلف ہیں۔ مسلمان دارالاسلام اور دارالحرب کے لوگوں کے ساتھ مختلف انداز سے برتاؤ کرتے ہیں۔ چینی غیر ملکی چینیوں اور غیر ملکی غیر چینیوں کے ساتھ الگ الگ انداز سے سلوک روا رکھتے ہیں۔ تہذیبی ''ہم'' اور بالائے تہذیبی ''وہ'' انسانی تاریخ میں مستقل رہا ہے۔ یہ بین التہذیبی اور بالائے تہذیبی رویہ یوں ابھرا ہے:

1- جن لوگوں کو مختلف تصور کر لیا گیا ہو ان سے برتری (اور کبھی کبھار کمتری) کے احساسات کی وجہ سے۔

2- ان لوگوں کا خوف اور ان پر اعتماد کی کمی کی وجہ سے۔

3- زبان اور سول رویے میں اختلافات سے پیدا ہونے والی ابلاغ (کمیونی کیشن) کی دشواریوں کی وجہ سے۔

4- دوسرے لوگوں کی خواہشات، تمناؤں، سماجی رشتوں اور سماجی سرگرمیوں سے عدم آشنائی کی وجہ سے۔

آج کی دنیا میں آمدورفت (ٹرانسپورٹیشن) اور ابلاغ (کمیونی کیشن) کی ترقیوں نے مختلف تہذیبوں کے لوگوں کے مابین تعامل (انٹرایکشن) کو زیادہ رواں، زیادہ شدید، زیادہ متناسب اور زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی تہذیبی شناختیں زیادہ اہم ہو گئی ہیں۔ فرانسیسی، جرمن، بلجیئن اور ڈچ اپنے آپ کو یورپی زیادہ تصور کرنے لگے

ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے مسلمان بوسنیائی اور چیچن مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی ظاہر کر رہے ہیں اور ان کی امداد کر رہے ہیں۔ پورے مشرقی ایشیا کے چینی چین کے ساتھ اپنے مفادات کو ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ روسی سربوں اور دوسرے قدامت پرست لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی ظاہر کر رہے ہیں اور ان کی امداد کر رہے ہیں۔ تہذیبی شناخت کی یہ وسیع سطحیں تہذیبی اختلافات کے گہرے شعور کو ظاہر کرتی ہیں نیز اس کو محفوظ کرنے کی ضرورت کو کہ جو "ہمیں" "ان" سے متمیز کرتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں اور گروپوں میں جھگڑوں کے سرچشمے، وسیع معنوں میں، وہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ لوگوں میں جھگڑے پیدا کئے ہیں یعنی لوگوں، علاقے، دولت اور ذرائع پر قبضہ نیز متعلقہ طاقت جو ایک گروپ کی اقدار، ثقافت اور اداروں کو دوسرے گروپ پر نافذ کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور اس کا موازنہ دوسرے گروپ کی تمہارے ساتھ وہی کچھ کرنے کی اہلیت سے کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ثقافتی گروپوں کے مابین جھگڑے ثقافتی مسئلوں میں بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ سیکولر نظریات میں مارکسی لینن ازم اور لبرل جمہوریت کے درمیان اختلافات اگر حل نہیں کئے جا سکتے تو کم از کم ان پر گفتگو تو ہو سکتی ہے۔ مادی مفادات پر اختلافات پر تو مذاکرات ہو سکتے ہیں اور اکثر مصالحت کے ذریعے مٹائے بھی جا سکتے ہیں تاہم ثقافتی مسائل حل نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے کہ ایودھیا میں مسجد اور مندر دونوں ہی کو تعمیر کیا جائے یا نہیں یا ایسی عمارت تعمیر کی جائے جو مسجد بھی ہو اور مندر بھی۔ نہ ہی کوسوو کے حوالے سے البانوی مسلمانوں اور قدامت پرست سربوں کے درمیان بظاہر سیدھا سادا علاقائی مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہودیوں اور عربوں کے مابین یروشلم کا مسئلہ آسانی سے سلجھ سکتا ہے کیونکہ ہر ایک مقام دونوں فریقوں کیلئے گہری تاریخی، ثقافتی اور جذباتی معنویت کا حامل ہے۔ اسی طرح فرانسیسی حکومت اور مسلمان والدین کے مابین سکول کے دنوں میں سکول کی طالبات کے اسلامی لباس پہننے کا مسئلہ سمجھ آ سکتا ہے۔ اس طرح کے ثقافتی سوالات جن کا جواب ہاں اور نہیں ہو صفر انتخاب

کے حامل ہوتے ہیں۔

پانچویں اور آخری بات جھگڑے کا ہر جگہ موجود ہونا ہے۔ نفرت کرنا انسانی فطرت ہے کیونکہ خود تعریفی اور خود ترغیبی لوگوں کو دشمنوں کی حاجت ہوتی ہے۔ کاروبار میں مدمقابل کارناموں میں رقیب سیاست میں مخالفین۔ فطری طور پر وہ ان لوگوں کو جو مختلف ہوتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں خطرہ اور دھمکی سمجھتے ہیں اور ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ ایک جھگڑے کے نمٹنے اور ایک دشمن کے ختم ہو جانے سے شخصی معاشرتی اور سیاسی طاقتیں جنم لیتی ہیں جو نئے دشمنوں اور جھگڑوں کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ جیسا کہ علی مزروئی نے کہا ہے "سیاسی میدان میں "ہم" بمقابلہ "وہ" رجحان تقریباً آفاقی ہے۔" ہم عصر دنیا میں "وہ" زیادہ سے زیادہ ایسے لوگ ہو رہے ہیں جو کسی دوسری تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرد جنگ کے اختتام نے جھگڑے کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ ثقافت میں جڑیں رکھنے والی نئی شناختوں کو فروغ دیا ہے اور مختلف ثقافتی گروپوں جو وسیع سطح پر تہذیبیں ہیں کے مابین جھگڑے کی نئی صورتوں کو ابھارا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشترک ثقافت ان ریاستوں اور گروپوں میں تعاون کو بڑھاتی بھی ہے جو اس ثقافت کا جزو ہوتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ملکوں کے مابین رونما ہونے والے علاقائی اتحادوں کی صورتوں میں کیا جا سکتا ہے خصوصاً معاشی شعبے میں۔

ثقافت اور معاشی تعاون

1990ء کی دہائی میں علاقائیت (ریجنل ازم) اور عالمی سیاست کی علاقائیت زدگی (ریجنلائزیشن) کا بہت چرچا سنا گیا۔ دنیا کے سلامتی کے ایجنڈے میں علاقائی جھگڑوں نے عالمی جھگڑوں کی جگہ لے لی۔ بڑی طاقتوں مثلاً روس چین اور امریکہ اور ساتھ ہی دوسرے درجے کی طاقتوں مثلاً سویڈن اور ترکی نے علاقائی شرائط پر اپنے سلامتی کے مفادات کا نئے سرے سے تعین کیا ہے۔ علاقوں میں داخلی تجارت باہمی تجارت سے زیادہ فروغ پا رہی ہے اور کئی لوگ تو علاقائی معاشی بلاکوں یعنی یورپی شمالی امریکی مشرقی

ایشیائی اور امکانی طور پر دیگر کے ظہور کی پیش گوئی کر رہے ہیں۔

جو کچھ واقع ہو رہا ہے اصطلاح ''علاقائیت (ریجنل ازم)'' اس کو بیان کرنے کیلئے ناکافی ہے۔ علاقے (ریجنز) تو جغرافیائی اکائیاں ہوتے ہیں نہ کہ سیاسی اور ثقافتی' جیسا کہ بلقان یا مشرق وسطیٰ کا معاملہ ہے۔

ریاستوں کے درمیان تعاون کیلئے علاقے محض اس حد تک تعاون کی بنیاد ہیں کہ جغرافیہ اور ثقافت جڑواں حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاست ثقافت سے الگ ہو تو اشتراک و ہم آہنگی پیدا نہیں کرتی ہے بلکہ محض تنزل و انحطاط کا سبب بن سکتی ہے۔ فوجی اور معاشی اتحادوں کو ارکان کے درمیان تعاون مطلوب ہوتا ہے۔ تعاون کا انحصار اعتماد اور بھروسے پر ہوتا ہے اور اعتماد مشترک اقدار اور ثقافت سے پھوٹتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جبکہ زمانہ اور مقصد بھی کردار ادا کرتے ہیں عمومی طور پر علاقائی تنظیموں کی مجموعی اثر پذیری اپنے ارکان کے تہذیبی تنوع کی وجہ سے الٹ بھی سکتی ہے۔

ایک تہذیب سے تعلق رکھنے والی تنظیم کثیر التہذیبی تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر اور کامیاب ہوتی ہے۔ یہی بات ایک طرف تو سیاسی اور سلامتی (سکیورٹی) کی تنظیموں پر صادق آتی ہے اور دوسری طرف معاشی تنظیموں پر۔

ناٹو کی کامیابی کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ مشترک اقدار اور فلسفیانہ تصورات رکھنے والے مغربی ملکوں کی سلامتی کی مرکزی تنظیم رہی ہے۔ مغربی یورپی یونین مشترک یورپی ثقافت کی پیداوار ہے۔ دوسری طرف ''آرگنائزیشن فار سکیورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ'' ہے جو ایسے ملکوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق کم از کم تین بالکل مختلف اقدار اور مفادات کی حامل تہذیبوں سے ہے جن کی وجہ سے اس تنظیم کو خاص اداراتی شناخت حاصل کرنے اور اہم سرگرمیوں کے ایک وسیع سلسلے کو ادا کرنے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں۔ انگریزی بولنے والے تیرہ سابقہ برطانوی نو آبادیات پر مشتمل واحد تہذیب سے تعلق رکھنے والی تنظیم کیریبیئن کمیونٹی (CARICOM) نے تعاون باہمی کا متنوع اور وسیع سلسلہ تخلیق کیا ہے اور اس کے ضمنی گروپوں میں تو تعاون بہت مضبوط ہے۔ کیریبیئن میں

اینگلو ہسپانوی خلیج پر پل باندھنے والی وسیع کیریبئین تنظیم کے قیام کی کوشش مستقل طور پر ناکامی پر منتج ہوئی ہے۔ اسی طرح جنوبی ایشیائی تعاون کی تنظیم 1985ء میں قائم ہوئی تھی اور سات ہندو' مسلمان اور بدھ ریاستوں پر مشتمل یہ تنظیم تقریباً مکمل طور پر غیر موثر ثابت ہوئی حتیٰ کہ اجلاس منعقد کروانے تک میں ناکام رہی۔

معاشی تعاون کی حد تک تو ثقافت اور علاقائیت (ریجنل ازم) کا تعلق تو بالکل واضح ہے۔ کم از کم سے لے کر انتہائی متحد تنظیموں تک ملکوں کے معاشی اتحاد کی چار مسلمہ سطحیں ہوتی ہیں۔

1- آزاد تجارتی علاقے

2- روایات پر مبنی اتحاد

3- مشترکہ منڈی

4- معاشی اتحاد

یورپی یونین ایک مشترکہ منڈی اور ایک معاشی اتحاد کے کئی عناصر کے ہمراہ شاہراہ اتحاد پر بہت آگے سفر کر چکی ہے۔

ایشیا میں کثیر التہذیبی آسیان صرف 1992ء میں ایک آزاد تجارتی علاقے کے قیام کی طرف بڑھنا شروع ہوئی ہے۔ دوسری کثیر التہذیبی معاشی تنظیمیں آگے بڑھنے میں ناکام رہی ہیں۔ 1995ء میں نافٹا (NAFTA) کی محدود توسیع کے ہمراہ' کوئی ایسی تنظیم نہیں جو کوئی آزاد تجارتی علاقہ قائم کر سکی ہو۔

مغربی یورپ اور لاطینی امریکہ میں تہذیبی اشتراک کی وجہ سے تعاون اور علاقائی تنظیم وجود میں آئی ہے۔ مغربی یورپی اور لاطینی امریکی جانتے ہیں کہ ان میں کس قدر باہمی اشتراک ہے۔ مشرقی ایشیا میں پانچ (اگر روس کو شامل کریں تو چھ) تہذیبیں وجود رکھتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مشرقی ایشیا ایسی بامعنی تنظیموں کے قیام کیلئے ایک مثال کا درجہ رکھتا ہے جن کی جڑیں مشترک تہذیب میں نہیں ہیں جیسا کہ 1990ء کی دہائی کے آغاز میں مشرقی ایشیا میں ناٹو کی طرح کی کوئی سلامتی کی تنظیم یا کوئی کثیر فریقی فوجی اتحاد

موجود نہیں۔ صرف ایک کثیر التہذیبی علاقائی تنظیم آسیان 1967ء میں تشکیل پذیر ہوئی تھی جس میں ایک چینی' ایک بدھ' ایک عیسائی اور دو مسلمان ریاستیں شامل تھیں۔ جنہیں داخلی طور پر کمیونسٹ انقلاب کا اور خارجی طور پر شمالی ویتنام اور چین کی طرف سے خطرے کا سامنا تھا۔

آسیان کا ذکر اکثر اوقات ایک موثر کثیر التہذیبی تنظیم کی مثال کے طور پر کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایسی تنظیموں کی محدودیت کی مثال ہے۔ نہ تو یہ ایک فوجی اتحاد ہے اگرچہ اس کے ارکان بعض اوقات دوطرفہ بنیادوں پر فوجی تعاون کرتے رہے ہیں تاہم وہ سب کے سب اپنے فوجی بجٹوں میں اضافہ کرتے رہے ہیں اور فوجی تشکیلات میں مصروف رہے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس مغربی یورپی اور لاطینی امریکی ملک فوجی مصارف میں کمی کرتے رہے ہیں۔ معاشی محاذ پر تو آسیان کا قیام ہی "معاشی اتحاد کے بجائے معاشی تعاون" کے حصول کیلئے وقوع پذیر ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں علاقائیت (ریجنل ازم) بہت آہستہ آہستہ ارتقا پذیر ہوئی' یہاں تک کہ اکیسویں صدی تک ایک آزاد تجارتی علاقے کے بارے میں غور بھی نہیں کیا گیا۔ 1978ء میں آسیان میں پوسٹ منسٹیریل کانفرنس تشکیل دی گئی جس میں اس کے وزرائے خارجہ اپنے "ڈائیلاگ پارٹنرز" یعنی امریکہ' جاپان' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' جنوبی کوریا اور یورپین کمیونٹی سے ملاقات کر سکے۔ پی ایم سی (PMC) بنیادی طور پر دوطرفہ گفتگو کا ایک فورم تھا اور "کسی اہم سلامتی کے معاملے" کو زیر بحث نہیں لا سکا۔ 1993ء میں آسیان نے اب تک کا سب سے بڑا شعبہ "آسیان ریجنل فورم" تشکیل دیا جس میں اس کے ارکان اور ڈائیلاگ پارٹنرز کے علاوہ روس' چین' ویتنام' لاؤس' اور پاپوا نیوگنی شامل تھے۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا تھا یہ تنظیم اجتماعی عمل کے بجائے اجتماعی گفتگو کی تنظیم تھی۔۔ جولائی 1994ء میں ارکان نے پہلی مرتبہ "علاقائی سلامتی کے معاملات پر تبادلہ خیال" کیا تاہم متنازعہ معاملات سے گریز کیا گیا کیونکہ جیسا کہ ایک افسر نے تبصرہ کیا کہ اگر انہیں اٹھایا جاتا تو "متعلقہ شرکاء ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیتے۔"

آسیان اور اس کی ناکامی اس محدودیت کی شہادت دیتی ہے جو کثیر التہذیبی علاقائی تنظیموں کا ورثہ ہوتی ہیں۔ بامعنی مشرقی ایشیائی علاقائی تنظیم اس وقت وجود پذیر ہوگی جب اس کے اندر مشرقی ایشیائی ثقافت کے اشتراکات اطمینان بخش حد تک ہوں گے۔ بلاشبہ مشرقی ایشیائی معاشروں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں جو انہیں مغرب سے ممتاز کرتی ہیں۔ ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے کہا ہے کہ یہ اشتراکات اتحاد کیلئے بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور مشرقی ایشیائی معاشی تعاون انہی پر استوار ہو چکا ہے۔ اس میں آسیان ممالک' میانمار' تائیوان' ہانگ کانگ' جنوبی کوریا اور سب سے زیادہ اہم چین اور جاپان شامل ہوں گے۔ مہاتیر محمد کہتے ہیں کہ ای اے ای سی (EAEC) کی جڑیں ایک مشترک ثقافت میں ہیں۔ اس کو "مشرقی ایشیا میں ہونے کی وجہ سے صرف ایک جغرافیائی گروپ ہی نہیں بلکہ ایک ثقافتی گروپ سمجھا جانا چاہئے۔ اگرچہ مشرقی ایشیائی جاپانی' کوریائی یا انڈونیشیائی ہو سکتے ہیں تاہم ثقافتی حوالے سے ان میں چند خاص مماثلتیں موجود ہیں۔...... یورپی اکٹھے ہیں اور امریکی بھی اکٹھے ہیں۔ ہم ایشیائیوں کو بھی اسی طرح اکٹھے ہونا چاہئے۔" جیسا کہ اس کے ایک ساتھی نے کہا ہے کہ اس کا مقصد "ایشیا میں مماثلتیں رکھنے والے ملکوں کے درمیان علاقائی تجارت" کو بڑھانا ہے۔

لہٰذا ای اے ای سی (EAEC) کا بنیادی اصول یہ ہوا کہ معیشت ثقافت کے پیچھے چلتی ہے۔ آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور امریکہ اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ثقافتی حوالے سے وہ ایشیائی نہیں ہیں۔

ای اے ای سی (EAEC) کی کامیابی کا بہت حد تک انحصار چین اور جاپان کی شمولیت پر ہے۔ مہاتیر جاپان کو شامل ہونے کیلئے قائل کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے ایک جاپانی ملاقاتی سے کہا "جاپان ایشیائی ہے' جاپان مشرقی ایشیائی ہے۔ آپ اس جغرافیائی ثقافتی (جیو کلچرل) حقیقت کو بدل نہیں سکتے۔ آپ یہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔"

جاپانی حکو ت ای اے ای سی (EAEC) میں شامل ہونے سے ہچکچا رہی ہے کسی حد تک امریکہ ۔ے خوف سے اور کسی حد تک اس وجہ سے کہ وہ خود اس سوال پر بٹی ہوئی

ہے آیا اسے خود کو ایشیائی شناخت کروانا چاہئے؟ اگر جاپان ای اے ای سی (EAEC) میں شامل ہو گا تو وہ اس پر غالب و برتر ہو گا جو اس کے ارکان میں خوف اور غیر یقینیت اور چین میں معاندت پیدا کرے گا۔ جاپان کئی برسوں سے یورپی یونین اور نافٹا (NAFTA) سے توازن کیلئے ''ین بلاک (YEN BLOC)'' قائم کرنا چاہتا ہے۔ جاپان اپنے ہمسایوں کے ساتھ چند ثقافتی رابطوں کے ہمراہ ایک تنہا ملک ہے اور 1995ء تک کوئی ین بلاک وجود پذیر نہیں ہوا ہے۔ جبکہ آسیان آہستہ آہستہ ترقی کر رہی ہے' ین بلاک ایک خواب ہی رہا ہے۔

اس توسیع کی جڑیں مشرقی ایشیائی چینی برادریوں کے مابین ثقافتی معاہدوں میں ہیں۔ ان معاہدوں نے چین اساس (چائنیز بیسڈ) بین الاقوامی معیشت کے ''مسلسل غیر رسمی اتحاد'' کو بڑھاوا دیا ہے جس کا کئی حوالوں سے ہینسیٹک لیگ سے موازنہ کیا جا سکتا ہے اور ''شاید ایک چینی مشترکہ منڈی کے قیام کی طرف بڑھ رہی ہو۔'' مشرقی ایشیا میں ہر جگہ کی طرح' معاشی اتحاد کیلئے ثقافتی اشتراک ایک لازمی امر ہے۔

سرد جنگ کے اختتام نے نئی علاقائی معاشی تنظیموں کے قیام اور پرانی پر نظر ثانی کی کوشش کو تیز کیا ہے۔ کامیابی کا بہت حد تک انحصار شامل ریاستوں کی ثقافت کی مماثلت پر ہے۔ شمعون پیریز کا 1994ء کا منصوبہ برائے ''مشرق وسطی مشترکہ منڈی'' ایک ''صحرائی سراب'' ہی رہا ہے۔ ایک عرب افسر نے تبصرہ کیا کہ ''عرب دنیا کو کسی ایسے ادارے یا ترقیاتی بینک کی ضرورت نہیں جس میں اسرائیل شامل ہو۔'' 1994ء میں کیری کوم (CARICOM) کو ہیٹی اور علاقے کے چینی بولنے والے ملکوں سے منسلک کرنے کیلئے دی ایسوسی ایشن آف کیریبین سٹیٹس قائم ہوئی۔ اس تنظیم سے بہت کم اشارے ملے ہیں کہ اس کے مختلف اراکین اپنے لسانی اور ثقافتی اختلافات کو اور سابق برطانوی نو آبادیات کی اور امریکہ کی طرف اپنی بہت زیادہ نہاد پر غلبہ پا لیں گے۔ دوسری طرف ثقافتی طور پر یکسانیت رکھنے والی تنظیموں کے قیام کی کوششیں ارتقا پا رہی ہیں۔ پاکستان' ایران اور ترکی نے ضمنی تہذیبی خطوط سے قطع ہونے کے باوجود 1985ء

میں ریجنل کوآپریشن فار ڈویلپمنٹ (آرسی ڈی) پر نظرثانی کی ہے جو انہوں نے 1977ء میں قائم کی تھی اور اس کو اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن کا نیا نام دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں محصولات میں کمی اور دوسرے اقدامات کیلئے معاہدے ہوئے ہیں اور 1992ء میں ای سی او (E.C.O) میں افغانستان اور چھ سابقہ سوویت جمہوریائیں شامل ہونے سے توسیع ہوئی ہے۔ اسی دوران میں 1991ء میں پانچ سابق سوویت جمہوریائیں ایک مشترکہ منڈی کے قیام پر اصولی طور پر متفق ہوئیں اور 1994ء میں دو سب سے بڑی ریاستوں ازبکستان اور قزاقستان نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جو "اشیاء خدمات اور سرمائے کی آزادانہ نقل و حرکت" کو ممکن بناتا ہے اور ان کی مالیاتی' زری اور محصولاتی پالیسیوں کو باہم جوڑتا ہے۔ 1991ء میں برازیل' ارجنٹائن' یوراگوئے اور پیراگوئے نے معاشی اتحاد کی معمول کی سطحوں کو تیزی سے عبور کرنے کیلئے مرکوسر میں شمولیت حاصل کی اور 1995ء میں ایک روایاتی اتحاد وجود پذیر ہوا۔ 1990ء میں پہلے سے جامد سنٹرل امریکن کامن مارکیٹ نے ایک آزاد تجارتی علاقہ قائم کیا اور 1994ء میں پہلے سے مساوی طور پر غیر فعال ایڈینئن گروپ نے ایک روایاتی اتحاد قائم کیا۔ 1992ء میں وزگریڈ ممالک (پولینڈ' ہنگری' چیک جمہوریائیں اور سلووکیا) ایک وسطی یورپی آزاد تجارتی علاقے کے قیام پر متفق ہو گئے اور 1994ء میں اس کو حقیقت کا روپ دینے کے نظام الاوقات کو تیزی دی گئی۔

تجارت میں توسیع معاشی اتحاد کے پیچھے چلتی ہے اور 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے شروع میں علاقوں کی باہمی تجارت کی نسبت علاقوں کے اندر تجارت تیزی سے اہمیت اختیار کر گئی۔ 1980ء میں یورپین کمیونٹی کے اندر تجارت کمیونٹی کی کل تجارت کا 50.6 فیصد ہو گئی اور 1989ء تک 58.9 فیصد تک فروغ پا گئی۔ اسی طرح کی تبدیلیاں شمالی امریکہ اور مشرقی ایشیا میں واقع ہوئیں۔ لاطینی امریکہ میں مرکوسر کے قیام اور ایڈینئن پیکٹ پر نظرثانی سے لاطینی امریکہ کی داخلی تجارت 1990ء کی دہائی کے شروع میں تیزی سے بڑھی۔ برازیل اور ارجنٹائن میں تجارت میں تین گنا اور کولمبیا'

وینزویلا تجارت میں چار گنا اضافہ 1990ء سے 1993ء کے دوران میں ہوا۔ 1994ء میں برازیل نے ارجنٹائن کے بڑے تجارتی پارٹنر کے طور پر امریکہ کی جگہ حاصل کر لی۔ اسی طرح نافٹا (NAFTA) کا قیام میکسیکو' امریکہ تجارت میں اہم اضافے کے ساتھ واقع ہوا۔ مشرقی ایشیا میں علاقے سے باہر تجارت کے بجائے علاقے کے اندر تجارت بہت تیزی سے توسیع پا گئی لیکن اس کی توسیع میں جاپان کی اپنی مارکیٹیں بند کرنے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ دوسری طرف چینی ثقافتی زون کے ملکوں (آسیان' تائیوان' ہانگ کانگ' جنوبی کوریا اور چین) میں تجارت 1970ء میں ان کی کل تجارت کا کم سے کم 20 فیصد سے 1992ء میں ان کی کل تجارت کے 30 فیصد تک بڑھی جبکہ جاپان کا ان کی تجارت میں حصہ 23 فیصد سے کم ہو کر 13 فیصد ہو گیا۔ 1992ء میں چینی زون کی دوسرے زونوں کے ملکوں کیلئے برآمدات ان کی امریکہ کیلئے برآمدات اور جاپان اور یورپین کمیونٹی کی مجموعی برآمدات دونوں سے بڑھ گئی۔

بذات خود ایک منفرد معاشرے اور تہذیب کے طور سے جاپان کو مشرقی ایشیا کے ساتھ اپنے معاشی معاہدوں کو فروغ دینے اور امریکہ اور یورپ کے ساتھ معاشی اختلافات سلجھانے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دوران میں مغرب سے اس کے ثقافتی اختلافات نے اس کے امریکہ اور یورپ کے ساتھ معاشی رشتوں میں بدگمانی اور عداوت کو پیدا کیا اگر جیسا کہ معاملہ بظاہر دکھائی دیتا ہے' معاشی اتحاد کا انحصار ثقافتی اشتراک پر ہوتا ہے تو جاپان ثقافتی حوالے سے ایک تنہا ملک کے طور پر معاشی اعتبار سے ایک تنہا مستقبل کا حامل ہو سکتا ہے۔

ماضی میں قوموں کے درمیان تجارت کے خاکے قوموں کے درمیان اتحادوں کے خاکوں کے مساوی اور پیچھے ہوتے تھے۔ ابھرتی ہوئی دنیا میں تجارت کے خاکے ثقافت کے خاکوں سے فیصلہ کن انداز میں متاثر ہوں گے۔ کاروباری افراد ان لوگوں سے معاملہ کریں گے جنہیں سمجھا جا سکے اور جن پر بھروسا کیا جا سکے۔ ریاستیں ان ایک سے ذہنوں والی ریاستوں پر مشتمل بین الاقوامی ایسوسی ایشنوں کے سامنے اپنی خود مختاری سے

دستبردار ہو جائیں گی جو سمجھی اور بھروسا کی جا سکتی ہیں۔ معاشی تعاون کی جڑیں ثقافتی اشتراک میں ہوتی ہیں۔

تہذیبوں کی ساخت

سرد جنگ میں ملک، دو سپر پاوروں کے ساتھ اتحادی طفیلیئے' گاہک' غیر جانبدار اور غیر اتحادی کے طور پر منسلک تھے۔ مابعد سرد جنگ دنیا میں' ملک تہذیبوں کے ساتھ رکن ریاستوں' مرکزی ریاستوں' تنہا ملکوں' شگافی ملکوں اور کٹے ہوئے ملکوں کے طور پر منسلک ہیں۔ قبیلوں اور قوموں کی طرح تہذیبیں سیاسی ساخت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک رکن ریاست ایسا ملک ہوتا ہے جو کسی ایک تہذیب کے ساتھ ثقافتی حوالے سے ہم آہنگ ہوتا ہے جیسا کہ مصر عرب اسلامی تہذیب کے ساتھ اور اٹلی یورپی مغربی تہذیب کے ساتھ۔ ایک تہذیب میں ایسے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں جو ایسی ریاستوں میں رہتے ہوں جو دوسری تہذیب کے ارکان کے زیرتسلط ہو۔ عمومی طور پر تہذیبوں کے رکن تہذیبوں کی ثقافت کے سرچشموں یا سرچشمے کے طور پر ایک یا ایک سے زیادہ جگہوں کو تصور کرتے ہیں۔ یہ سرچشمے اکثر تو تہذیب کی مرکزی ریاست یا ریاستوں کے اندر واقع ہوتے ہیں جو اس کی سب سے زیادہ طاقتور اور ثقافتی حوالے سے مرکزی ریاست یا ریاستیں ہوتی ہیں۔

مرکزی ریاستوں کی تعداد ایک سے دوسری تہذیب میں مختلف ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہے۔ جاپانی تہذیب حقیقت میں ایک جاپانی مرکزی ریاست سے پہچانی جاتی ہے۔ قدامت پرست اور ہندو ہر ایک تہذیب ایک بے حد زیادہ غالب اور برتر مرکزی ریاست' دوسری رکن ریاستوں اور دوسری مختلف تہذیب (سمندر پار چینی' روسی' سری لنکن تامل) کے زیرتسلط ریاستوں میں اس تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ عموماً مغرب تاریخی حوالے سے بہت سی مرکزی ریاستوں کا حامل رہا ہے۔ اب اس کے دو مرکز ہیں اول امریکہ اور دوم یورپ میں فرانسیسی جرمن (Franco German) مرکز' جن کے درمیان برطانیہ ایک اضافی مرکز قوت کے طور پر موجود ہے۔ اسلام' لاطینی

امریکہ اور افریقہ میں مرکزی ریاستیں نہیں ہیں۔ کسی حد تک اس کا سبب مغربی طاقتوں کی استعماریت (Imperialism) ہے' جنہوں نے افریقہ' مشرق وسطیٰ اور ابتدائی صدیوں میں اور کم فیصلہ کن طور پر لاطینی امریکہ کو آپس میں بانٹ لیا ہے۔

اسلامی مرکزی ریاست کے نہ ہونے سے مسلمانوں اور غیر مسلموں ہر دو کیلئے بڑے مسائل پیدا ہوئے ہیں جن پر باب نمبر 7 میں بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک لاطینی امریکہ کا تعلق ہے تو سپین ممکنہ طور پر ہسپانوی بولنے والوں یا حتیٰ کہ آئبیرین تہذیب کی مرکزی ریاست بن سکتا تھا لیکن اس کے لیڈروں نے شعوری طور پر یورپی تہذیب کی ایک ریاست بننا منتخب کیا جبکہ اسی اثنا میں اپنی سابقہ نو آبادیوں سے رشتے بھی استوار کیے۔ رقبہ' وسائل' آبادی' فوج اور معاشی استعداد نے برازیل کو لاطینی امریکہ کا لیڈر بننے کا اہل قرار دلوا دیا ہے اور ممکنہ طور پر وہ لیڈر بن سکتا ہے۔ برازیل لاطینی امریکہ کیلئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو اسلام کیلئے ایران' بصورت دیگر مرکزی ریاست کیلئے نہایت موزوں' ضمنی تہذیبی اختلافات (ایران کی حد تک مذہبی' برازیل کی حد تک لسانی) نے اس کردار کو نبھانے میں دشواری پیدا کر دی ہے۔ لاطینی امریکہ میں کئی ریاستیں ایسی ہیں جو لیڈر شپ کیلئے موزوں ہیں یعنی برازیل' میکسیکو' وینزویلا اور ارجنٹائن۔ لاطینی امریکہ کی صورت حال اس لئے بھی پیچیدہ ہے کہ میکسیکو خود کو لاطینی امریکی سے شمالی امریکی اکائی کے طور پر منوانا چاہتا ہے اور چلی اور دوسری ریاستیں اس کی پیروی کر سکتی ہیں۔ آخر میں لاطینی امریکی تہذیب سہ رُخی مغربی تہذیب میں ضم ہو سکتی ہے۔

سب صحارائی (Sub Saharan) افریقہ کیلئے مرکزی ریاست کی خوابیدہ اہلیت اور موزونیت کو فرانسیسی بولنے والے اور انگریزی بولنے والے ملکوں میں تقسیم نے محدود کر دیا ہے۔ ایک عرصے تک کوٹ ڈی آئیوری فرانسیسی بولنے والوں کی مرکزی ریاست تھی۔ ایک قابل لحاظ حد تک فرانس فرانسیسی بولنے والے افریقہ کی مرکزی ریاست تھا جس نے آزادی کے بعد اپنی سابقہ نو آبادیوں کے ساتھ گہرے معاشی' فوجی اور سیاسی رشتے جوڑے۔ دو افریقی ملک جو مرکزی ریاست بننے کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہیں دونوں

ہی انگریزی بولنے والے ہیں۔ رقبۂ وسائل اور محل وقوع نے نائیجیریا کو ایک مرکزی ریاست بننے کا اہل ملک بنا دیا ہے لیکن اس کے بین التہذیبی عدم اتحاد بہت زیادہ کرپشن' سیاسی عدم استحکام' جابرانہ حکومتوں اور معاشی مسائل نے اس کو یہ کردار ادا کرنے کا اہل ہونے سے شدت سے روک رکھا ہے' اگرچہ وہ کئی مواقع پر یہ کردار ادا کر چکا ہے۔ نسل پرستی سے جنوبی افریقہ کی پرامن طور پر اور مذاکرات کے ذریعے نجات' دوسرے افریقی ملکوں کے مقابلے میں اس کی صنعتی قوت' اس کی معاشی ترقی کی اعلیٰ سطح اس کے قدرتی وسائل اور اس کی ہوش مند سیاہ اور سفید سیاسی لیڈر شپ نے جنوبی افریقہ کو واضح طور پر جنوبی افریقہ' ممکنہ طور پر انگریز افریقہ اور امکانی حد تک سارے ضمنی صحارائی افریقہ کا لیڈر بننے کا اہل قرار دلوا دیا ہے۔

ایک تنہا ملک دوسرے معاشروں کے ساتھ' ثقافتی اشتراک کی خصوصیت سے محروم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایتھوپیا اپنی ایتھوپیائی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان ایمہیرک' اپنے غالب مذہب کوپٹک قدامت پرستی' اپنی استعماری تاریخ اور اپنے مسلمان ہمسایوں سے مذہبی اختلافات کی وجہ سے ثقافتی حوالے سے الگ تھلگ (Isolated) جبکہ ہیٹی کی اشرافیہ روایتی طور پر فرانس کے ساتھ اپنے ثقافتی معاہدوں پر خوش ہے لیکن ہیٹی کی کریولی زبان' ووڈو مذہب' انقلابی غلامانہ سرچشموں اور سفاکانہ تاریخ نے مل کر اس کو ایک تنہا (Lone) ملک بنا دیا ہے۔ سڈنی منٹز کہتا ہے کہ "ہر قوم منفرد ہوتی ہے لیکن ہیٹی اپنی مثال آپ ہی ہے۔" اس کا نتیجہ ہے کہ 1994ء کے ہیٹی بحران میں لاطینی امریکی ملکوں نے ہیٹی کو لاطینی امریکہ کا مسئلہ نہیں سمجھا اور ہیٹی کے پناہ گزینوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ کیوبا کے پناہ گزینوں کو قبول کر لیا تھا جیسا کہ پانامہ کے منتخب صدر نے کہا کہ "لاطینی امریکہ میں ہیٹی کو لاطینی امریکی ملک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہیٹی کے لوگ مختلف زبان بولتے ہیں۔ ان کی نسلی جڑیں مختلف ہیں اور ثقافت مختلف ہے۔ وہ مجموعی طور پر مختلف ہیں۔" ہیٹی انگریزی بولنے والے سیاہ کریبین سے بھی یکساں طور پر الگ ہے۔ ایک تبصرہ کرنے والے نے کہا کہ ہیٹی کے لوگ گریناڈا یا جمیکا

کے کسی شخص کیلئے اتنے اجنبی ہیں گویا وہ لووایا مونتانا سے تعلق رکھنے والے ہوں۔" ہیٹی ایک حقیقتاً بے خاندان ملک ہے۔

سب سے زیادہ اہم تنہا ملک جاپان ہے۔ کوئی دوسرا ملک اس کی منفرد ثقافت میں حصہ دار نہیں ہے اور جاپانی غیر ملکوں میں یا تو تعداد کے اعتبار سے اہم نہیں ہیں یا ان ملکوں کی ثقافتوں میں رچ بس گئے ہیں (مثلاً امریکی جاپانی) جاپان کی تنہائی اس حقیقت کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس کی ثقافت بے حد مخصوص ہے اور کسی آفاقی مذہب (عیسائیت' اسلام) میں شامل ہونے کی خفتہ اہلیت نہیں رکھتی۔ نہ ہی یہ کسی نظریے (لبرل ازم' کمیونزم) کی حامل ہے کہ جس کو دوسرے معاشروں کو برآمد کیا جا سکے اور دوسرے معاشروں کے لوگوں سے ثقافتی رشتہ قائم ہو سکے۔ تقریباً سارے ملک اس اعتبار سے کثیر صنفی ہیں کہ وہ دو یا زیادہ نسلی اور مذہبی گروپوں پر مشتمل ہیں۔ بہت سے ملک اس لئے منقسم ہیں کہ ان ملکوں کی سیاست میں ان گروپوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تقسیم کی گہرائی عمومی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ کسی ملک کے اندر گہری تقسیمیں وسیع پیمانے پر تشدد کی طرف لے جا سکتی ہیں یا ملک کے وجود کیلئے خطرے کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ مؤخرالذکر خطرہ اور خودمختاری یا علیحدگی کیلئے تحریکیں اس وقت زیادہ ابھرتی ہیں جب جغرافیائی محل وقوع میں اختلافات کے ساتھ ساتھ ثقافتی اختلافات بھی واقع ہوں۔ اگر ثقافت اور جغرافیہ باہم مساوی نہیں ہوتے تو اس کے نتیجے میں یا نسل کشی ہوتی ہے یا جبری انخلا' ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھنے والے گروپوں میں اگر مختلف ثقافتیں ہوں تو ان کے اندر علیحدگی کا رجحان موجود ہوتا ہے جیسا کہ چیکوسلواکیہ کی مثال میں رونما ہو چکا ہے اور کینیڈا کی مثال میں رونما ہو سکتا ہے۔

گہری تقسیمیں ایک ہی تہذیب کی مختلف ثقافتی گروہ بندیوں والے ملک کے اندر زیادہ ابھرنے کا امکان ہوتا ہے ایسی تقسیمیں اور تناؤ اس وقت بڑھتے ہیں جب کسی تہذیب سے تعلق رکھنے والا کوئی ایک اکثریتی گروپ ریاست کو اپنے سیاسی آلے کے طور پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی زبان' مذہب اور علامات کو ریاست کی زبان' مذہب

اور علامات قرار دلوانا چاہتا ہے جیسا کہ ہندو' سنہالی اور مسلمان' ہندوستان' سری لنکا اور ملائیشیا میں کر رہے ہیں۔

ملک جو تہذیبوں کو جدا کرنے والے تقسیمی خطوط کی وجہ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں انہیں اپنے اتحاد کو برقرار رکھنے کیلئے خاص طور پر مسائل درپیش آتے ہیں۔ سوڈان میں مسلمان شمال اور عیسائی جنوب میں کئی دہائیوں سے خانہ جنگی جاری ہے۔ اسی طرح کی تہذیبی تقسیم نے نائیجیریا کی سیاست کو بھی کئی عشروں سے ابتری کا شکار بنا رکھا ہے اور ایک بڑی جنگ کے علاوہ بہت سی بغاوتوں' فسادات اور تشدد کا سبب بنی ہے۔ تنزانیہ میں عیسائی مرکزی سرزمین اور عرب مسلمان زنجبار منقسم ہو گئے ہیں اور بہت سے حوالوں سے دو الگ الگ ملک ہیں۔ 1992ء میں زنجبار خفیہ طور پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا رکن بن گیا اور اسی سال تنزانیہ اس سے پسپا اور دستبردار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اسی عیسائی مسلمان تقسیم نے کینیا میں تناؤ اور جھگڑوں کو پیدا کیا ہے۔ افریقہ کی خلیج پر عیسائی اکثریت والا ملک ایتھوپیا اور مسلم اکثریت والا ملک اریٹریا 1993ء میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

ایتھوپیا نے اپنے اورومو عوام کے درمیان ایک ٹھوس مسلمان اکثریت کو رہنے دیا ہے۔ دوسرے ملک جو تہذیبی تقسیمی سرحدوں کے ذریعے بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ہندوستان (مسلمان اور ہندو)' سری لنکا (سنہالی بدھ اور تامل ہندو)' ملائیشیا اور سنگاپور (چینی اور ملائی مسلمان)' چین (ہان چین' تبتی بدھ)' فلپائن (عیسائی اور مسلمان) اور انڈونیشیا (مسلمان اور تیموری عیسائی) شامل ہیں۔ تہذیبی خطوط منقسمہ کا فیصلہ کن اثر ان ملکوں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے جن پر سرد جنگ کے دوران میں کمیونسٹ بالادستی رہی ہے۔ کمیونزم کے انہدام کے ساتھ ثقافت نے نظریے کی جگہ کشش اور گریز کے مقناطیس کی حیثیت حاصل کر لی اور یوگوسلاویہ اور سوویت یونین الگ الگ ہوئے اور تہذیبی خطوط پر نئی اکائیوں میں تقسیم ہو گئے یعنی سابق سوویت یونین میں بالٹک (پروٹسٹنٹ اور کیتھولک)' آرتھوڈوکس اور مسلمان جمہوریائیں' سابق یوگوسلاویہ میں

کیتھولک سلوو ینیا اور کروشیا' جزوی مسلمان بوسنیا ہرزیگووینا' اور آرتھوڈوکس سربیا' مونٹی نیگرو اور میسیڈونیا' ان جانشین اکائیوں میں کثیر التہذیبی گروپ ہیں۔ ان میں دوسرے مرحلے کی تقسیمیں رونما ہوئیں۔ بوسنیا ہرزیگووینا مسلمانوں' سربوں اور کروشیائیوں فریقوں کے مابین جنگ کی وجہ سے تقسیم ہو گیا اور کروشیائیوں میں سربوں اور کروشیائی کے درمیان جنگ ہوئی۔ آرتھوڈوکس سربیا میں البانوی مسلمان کوسوو اور سلاوک آرتھوڈوکس سربیا کے مابین دیرپا امن کی حالت بہت زیادہ غیر یقینی ہے اور میسیڈونیا میں البانوی مسلمان اقلیت اور سلاوک آرتھوڈوکس اکثریت کے مابین تناؤ ابھرا ہے۔ کئی سابق سوویت جمہوریائیں بھی تہذیبی خطوط منقسمہ کی زد میں ہیں۔ کسی حد تک اس کا باعث یہ ہے کہ سوویت حکومت نے ایسی سرحدیں کھینچیں جو ان جمہوریاؤں کو منقسم رکھے ہوئے ہے' روسی کرائمیا یوکرائن' آرمینیائی نگورنو کاراباخ سے آذر بائیجان تک جا رہی ہے۔ روس میں نسبتاً چھوٹی سی مسلمان اقلیتیں موجود ہیں جن میں سے زیادہ اہم جنوبی کا کیشیا اور وولگا ریجن میں ہیں۔ ایسٹونیا' لیٹویا اور قزاقستان میں ٹھوس روسی اقلیتیں موجود ہیں۔ یہ بھی سوویت پالیسی کا سوچا سمجھا نتیجہ ہے۔ یوکرائن یوکرائنی بولنے والے یونیٹ قوم پرست مغرب اور روسی بولنے والے آرتھوڈوکس مشرق میں بٹا ہوا ہے۔

کسی شگافی ملک میں دو یا زیادہ تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے بڑے گروپ کہتے ہیں ''ہم مختلف لوگ ہیں اور مختلف جگہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔'' گریز کی قوتیں انہیں الگ کر رہی ہیں اور انہیں دوسرے معاشروں میں موجود تہذیبی مقناطیسوں کی طرف کھینچ رہی ہیں۔ اس کے برعکس ایک کٹے ہوئے (Torn) ملک میں ایک ہی غالب اور برتر ثقافت ہوتی ہے جو اس کو ایک تہذیب میں مقام دلاتی ہے لیکن اس کے لیڈر اس کو کسی دوسری تہذیب میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''ہم لوگ ایک ہیں اور ایک ہی مقام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم اس مقام کو تبدیل کرنا چاہتا ہیں۔''

شگافی ملکوں کے لوگوں کے برعکس کٹے ہوئے ملکوں کے لوگ اپنی شناخت میں تو متفق ہوتے ہیں تاہم اس امر پر غیر متفق ہوتے ہیں کہ کون سی تہذیب موزوں طور پر

ان کی تہذیب ہے۔ خاص طور پر لیڈروں کے ایک اہم حصے نے کمالی (Kemalist) حکمت عملی کو اپنا لیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ ان کے معاشرے کو غیر مغربی ثقافت اور اداروں کو مسترد کر کے مغرب میں شامل ہو جانا چاہئے اور جدید اور مغربیائی (ویسٹرنائز) ہونا چاہئے۔ روس پیٹر دی گریٹ کے عہد سے کٹا ہوا ملک چلا آ رہا ہے۔ اور اس مسئلہ (Issue) پر بٹا ہوا ہے کہ کیا وہ مغربی تہذیب کا حصہ ہے یا ممتاز پوزیشن آرتھوڈوکس تہذیب کا مرکز ہے۔ مصطفیٰ کمال کا ملک ایک کلاسیکی کٹا ہوا ملک ہے جو 1920ء کی دہائی سے جدید اور مغربی بننے کی کوشش کر رہا ہے اور مغرب کا حصہ بننے کیلئے کوشاں ہے۔ تقریباً دو صدیوں تک میکسیکو نے امریکہ کی مخالفت میں خود کو لاطینی امریکی ملک قرار دلوانے کی کوششیں کیں پھر 1980ء کی دہائی میں اس کے لیڈروں نے اپنے ملک کو اس کوشش کے باعث کٹا ہوا ملک بنا لیا کہ اس کو شمالی امریکی معاشرے کے طور پر نئے سرے سے پہچانا جائے۔ اس کے برعکس 1990ء کی دہائی میں آسٹریلیا کے لیڈروں نے کوشش کی کہ ان کا ملک مغرب سے کٹ کر ایشیا کا ایک حصہ بن جائے۔ اس کے نتیجے میں یہ ایک کٹا ہوا ملک بن گیا۔ کٹے ہوئے ملک دو مظاہر کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے لیڈر انہیں دو ثقافتوں کے درمیان ''پل'' قرار دلواتے ہیں۔

کٹے ہوئے ملک: تہذیبی تبدیلی کی ناکامی

کسی کٹے ہوئے ملک کیلئے اپنی تہذیبی شناخت کو کامیابی سے ازسرنو متعین کرنے کیلئے تین باتیں نہایت ضروری ہیں۔ اول' ملک کی سیاسی اور معاشی اشرافیہ کو عمومی طور پر اس تحریک کے حوالے سے معاون اور پرجوش ہونا چاہئے۔ دوم' شناخت کے ازسرنو تعین کیلئے عوام کو رضامند ہونا چاہئے۔ سوم' میزبان تہذیب کے غالب عناصر کو' مغرب کی مثالوں میں زیادہ' تبدیلی قبول کرنے کیلئے آمادہ ہونا چاہئے۔ شناخت کے ازسرنو تعین کا عمل سیاسی' سماجی' اداراتی اور ثقافتی حوالے سے طویل ہوگا۔ اس میں رکاوٹیں آئیں گی اور یہ مصائب سے معمور ہوگا۔

روس

1990ء کی دہائی میں میکسیکو کئی برسوں تک ایک کٹا ہوا ملک رہا ہے اور ترکی تو کئی دہائیوں سے ہے۔ اس کے برعکس روس کئی صدیوں سے کٹا ہوا ملک رہا ہے اور میکسیکو اور جمہوری (ریپبلکن) ترکی کے برعکس یہ ایک بڑی تہذیب کا مرکز بھی ہے۔ اگر ترکی یا میکسیکو کامیابی سے خود کو مغربی تہذیب کا رکن قرار دلوا لیتے ہیں تو اس سے اسلامی یا لاطینی امریکی تہذیب پر معمولی یا معتدل اثر ہو گا۔ اگر روس مغربی ہوا تو آرتھوڈوکس تہذیب فنا ہو جائے گی۔ سوویت یونین کے انہدام نے روسیوں کے درمیان روس اور مغرب کے مرکزی مسئلے (Issue) پر بحث کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

روس کے مغربی تہذیب کے ساتھ رشتے چار مرحلوں میں قائم ہوئے ہیں۔ پہلے مرحلے میں جو پیٹر دی گریٹ کے عہد حکمرانی (1725ء-1689ء) کائیون رس اور مسکووی مغرب سے الگ حیثیت میں موجود تھے اور مغربی یورپی معاشروں سے کم تعلقات رکھتے تھے۔ روسی تہذیب بازنطینی تہذیب کے عدم سے وجود میں آئی تھی اور پھر تیرھویں صدی کے وسط سے پندرھویں صدی کے وسط' دو برس تک روس منگولوں کے زیر تسلط رہا۔ روس کو مغربی تہذیب کے تاریخی مظہر یعنی رومن کیتھولک ازم' فیوڈل ازم' نشاۃ ثانیہ' اصلاح' سمندر پار توسیع اور نو آبادیت' خرد افروزی اور قومی ریاست کے ظہور سے متصل ہونے کا یا تو بالکل نہیں یا بہت کم موقع ملا۔ مغربی تہذیب کی قبل ازیں متعین کی گئی سات یا آٹھ ممتاز خصوصیات' مذہب' زبان' ریاست اور کلیسا کی علیٰحدگی' قانون کی حکمرانی' سماجی تکثیریت' نمائندہ ادارے' انفرادیت پسندی' روسی تجربے سے تقریباً مکمل طور پر خارج ہیں۔ صرف ایک امکانی استثنا کلاسیکی ورثے کا ہے جو روس میں بازنطین سے آیا اور لہٰذا اس سے بالکل مختلف ہے جو مغرب میں براہ راست روم سے آیا۔ روسی تہذیب تو کائیون رس اور مسکووی میں مقامی جڑوں' ٹھوس بازنطینی اثر اور طویل منگول حکمرانی کی پیداوار ہے۔ ان اثرات نے ایک ایسے معاشرے اور ثقافت کو پیدا کیا جو مغربی یورپ

میں بالکل مختلف قوتوں کے اثر سے پیدا ہونے والے معاشرے اور ثقافت سے بہت تھوڑی مشابہت رکھتے ہیں۔

سترہویں صدی کے اختتام پر روس نہ صرف یورپ سے مختلف تھا بلکہ یورپ کے مقابلے میں پسماندہ بھی تھا۔ جیسا کہ پیٹر دی گریٹ کو اپنے 1698ء-1697ء کے دورۂ یورپ کے دوران میں پتا چلا' تب اس نے اپنے ملک کو جدید اور مغربی بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ماسکو واپس آ کر پیٹر نے اپنے لوگوں کے مغربی لوگوں جیسا دکھائی دینے کیلئے اپنے اشراف کو داڑھیاں کٹوانے اور لمبے چوغے اور مخروطی ہیٹ نہ پہننے کا حکم دیا۔ اگرچہ پیٹر نے سریلک حروف تہجی کو تو نہ ختم کیا تاہم اس نے اس کی اصلاح کی اور اسے سادہ بنایا اور مغربی الفاظ اور تراکیب (Phrases) کو متعارف کرایا۔ اس نے روسی فوجوں کی ترقی اور تجدید کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔ اس نے بحریہ بنائی' فوج میں جبری بھرتی کو متعارف کرایا' دفاعی صنعت قائم کی' ٹیکنیکل سکول کھولے' لوگوں کو پڑھنے کیلئے مغرب بھیجا' مغرب سے ہتھیاروں' جہازوں اور جہاز سازی' جہاز رانی' اور بیوروکریٹک انتظام اور فوجی اثر پذیری کیلئے ناگزیر دوسرے علوم کے حوالے سے جدید ترین معلومات درآمد کیں۔ اس نے ان اختراعات کو مہیا کرنے کیلئے ٹیکس نظام کی اصلاح کی اور اس کو وسیع کیا اور اپنی شہنشاہی کے خاتمے کی طرف بڑھتے ہوئے حکومت کی ساخت کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اس نے روس کو نہ صرف ایک یورپی طاقت بلکہ یورپ کے اندر ایک طاقت قرار دلوانے کیلئے ماسکو کی جگہ ایک نیا دارالحکومت سینٹ پیٹرز برگ تخلیق کیا۔ نیز بالٹک میں روس کو غالب قوت منوانے کیلئے اور یورپ میں موجود رہنے کیلئے سویڈن کے ساتھ عظیم شمالی جنگ کا آغاز کیا۔

تاہم پیٹر نے ملک کو جدید اور مغربی بنانے کی کوششیں کرتے ہوئے بھی روس کے ایشیائی خواص کو برقرار رکھتے ہوئے اقربا پروری کو پوری طرح روا رکھا اور کسی بھی قسم کی سیاسی اور سماجی تکثیریت کو مٹا ڈالا۔ روسی اشرافیہ کبھی طاقتور نہیں رہی تھی۔ پیٹر نے اس کو مزید محدود کر دیا اور افسر شاہی کو وسعت دی نیز پیدائش پالیسی کے بجائے میرٹ کی بنیاد

پر استوار عہدوں کا سلسلہ تشکیل دیا۔

زرعی غلاموں کی خود مختاری کو مزید محدود کر دیا اور انہیں اپنی زمین اور آقا کا زیادہ سختی سے پابند بنا دیا گیا۔ آرتھوڈوکس چرچ کو جو کہ ہمیشہ وسیع ریاستی کنٹرول میں رہا تھا نئے سرے سے ترتیب دیا گیا۔ زار کی براہ راست متعین کردہ کلیسائی مجلس کے ماتحت کر دیا گیا۔ زار کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ توراث کی روایت کے برعکس کسی شخص کو بھی جانشین مقرر کر دے۔ ان تبدیلیوں کے ذریعے پیٹر نے ایک طرف تو روس میں جدیدیت اور مغربیت کے قریبی رشتے استوار کر دیئے اور دوسری طرف اقربا پروری کو مضبوط کر دیا۔ اس پیٹری (Petrine) نمونے پر عمل کرتے ہوئے لینن، سٹالن اور ایک قدرے کم درجے پر کیتھرین II اور الیگزینڈر II نے بھی روس کو مختلف طریقوں سے جدید اور مغربی بنانے کی کوششیں کیں اور شخصی حکومت کو مضبوط کیا۔ کم از کم 1980ء کی دہائی تک روس میں جمہوریت پسند عمومی طور پر مغربیت پسند ہوتے تھے لیکن مغربیت پسند جمہوریت پسند نہیں ہوتے تھے۔ روسی تاریخ کا سبق یہ ہے کہ اقتدار کی مرکزیت معاشی اور سماجی اصلاح کیلئے شرط اولین ہے۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں گورباچوف کے ساتھیوں نے اپنی ناکامیوں کی نوحہ خوانی کی، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ گلاس نوسٹ نے معاشی لبرل ازم کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ پیٹر یورپ کو روس کا حصہ بنانے کی نسبت روس کو یورپ کا حصہ بنانے میں زیادہ کامیاب ہوا۔ روس کو عثمانی سلطنت کے ایک بڑے اور قانونی حصہ دار کی حیثیت مل گئی۔ داخلی طور پر پیٹر کی اصلاحات کچھ تبدیلیاں لائیں لیکن اس کا معاشرہ دوغلا ہی رہا۔ ایک مختصر سی اشرافیہ کے سوا ایشیائی اور بازنطینی اطوار، ادارے اور عقائد روسی معاشرے پر چھائے رہے اور یورپی اور روسی ہر دو ان پر عمل کرتے تھے۔ ڈی میٹر نے تبصرہ کیا کہ "کسی روسی کو کھرچو اور تم ایک تاتاری کو زخم لگاؤ گے۔" پیٹر نے ایک کٹا پھٹا ملک تخلیق کیا تھا اور انیسویں صدی کے دوران میں سلاووفائل اور مغرب پسند مل کر اس ناخوشگوار حالت پر نوحہ کناں ہوئے نیز وہ اس حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ زبردست اختلاف رکھتے تھے کہ روسی معاشرے کی

اس حالت کو ختم کرنے کیلئے مکمل طور پر یورپی بن جایا جائے یا یورپی اثرات کو مٹا کر حقیقی روسی روح کی طرف واپسی اختیار کر لی جائے۔ کوئی چادائیو جیسا مغرب پسند بحث کرتا ہے کہ ''سورج مغرب کا سورج ہے۔'' اور روس کو لازماً اس کی روشنی سے تابندگی پانا اور اپنے روایتی اداروں کو تبدیل کرنا ہو گا۔ ڈینیلیوسکی جیسا سلاوو فائل دلیل دیتا ہے جو کہ 1990ء کی دہائی میں بھی سنی گئی کہ یورپی بننے کے عمل کو رد کر دینا چاہئے کیونکہ ''یہ لوگوں کی زندگیوں کو برباد کر رہا ہے اور اس کی اپنی صورتوں کو نئی' اجنبی اور غیر ملکی صورتوں سے تبدیل کر رہا ہے۔ غیر ملکی ادارے مستعار لئے جا رہے ہیں اور انہیں روسی سرزمین پر استوار کیا جا رہا ہے۔'' روسی تاریخ میں پیٹر کو مغرب پسند ایک ہیرو اور ان کے مخالف ایک شیطان تصور کرتے ہیں اور 1920ء کی دہائی کے یوریشیائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے اسے ایک ہیرو کے طور پر مسترد کر دیا تھا اور بالشویکوں کو جدیدیت کو رد کرنے' یورپ کو چیلنج کرنے اور دارالحکومت ماسکو میں واپس لے جانے پر اکسایا تھا۔

بالشویک انقلاب روس اور مغرب کے تعلقات میں ایک تیسرے مرحلے کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس نے مغرب میں پیش کئے گئے نظریے کے تحت ایک ایسا سیاسی' معاشی نظام تخلیق کیا جو کہ مغرب میں موجود نہیں تھا۔ سلاوو فائلوں اور مغرب پسندوں میں بحث تھی کہ کیا روس مغرب کے مقابلے میں پسماندہ ہوئے بغیر مغرب سے مختلف ہو سکتا ہے؟ کمیونزم نے بڑی خوبی کے ساتھ اس مسئلے کو حل کیا۔ روس مغرب سے مختلف اور بنیادی طور پر اس کا مخالف تھا کیونکہ وہ مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس نے پرولتاری انقلاب کی رہنمائی کی جس نے آخر کار ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ روس ایک پسماندہ ایشیائی ماضی میں نہیں ڈھلا ہوا تھا بلکہ ایک ترقی پسند سوویت مستقبل کا حامل تھا۔ انقلاب نے روس کو مغرب پر سبقت لے جانے کا اہل بنا دیا۔ اس کو مختلف بنایا مگر سلاوو فائلوں کے اس نقطہ نظر کے تحت نہیں کہ ''تم مختلف ہو اور ہم تم جیسے نہیں بن سکتے'' بلکہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اس پیغام کے مطابق کہ ''ہم مختلف ہیں اور آخر کار تمہیں ہمارے جیسا بننا ہو گا۔''

تاہم بالکل اسی زمانے میں جبکہ کمیونزم نے سوویت لیڈروں کو مغرب سے اپنے آپ کو مختلف بنانے کا اہل کیا تھا۔ اس نے مغرب کے ساتھ طاقتور تعلقات بھی تخلیق کیے۔ مارکس اور اینگلز جرمن تھے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ان کے نظریات کے بنیادی اجزاء مغربی یورپی تھے۔ 1910ء سے مغربی معاشروں کی بہت سی لیبر یونینیں اور سوشل ڈیموکریٹک اور لیبر پارٹیاں ان کے نظریے سے وابستہ ہوگئیں اور رفتہ رفتہ یورپی سیاست میں کافی زیادہ اثر کی حامل ہوگئیں۔ بالشویک انقلاب کے بعد بائیں بازو کی پارٹیاں کمیونسٹ اور سوشلسٹ میں منقسم ہوگئیں نیز ہر دو یورپی ملکوں میں اکثر طاقتور رہیں۔ بیشتر مغرب میں مارکسی نقطۂ نظر چھا گیا۔ کمیونزم اور سوشلزم کو مستقبل کی لہر کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور ایک یا دوسرے طریقے سے سیاسی اور دانشور اشرافیہ نے اس کو اپنا لیا۔ روس میں سلاوو فائلوں اور مغرب پسندوں میں روس کے مستقبل کے حوالے سے ہونے والی بحث اب یورپ میں بائیں اور دائیں بازو کے لوگوں میں مغرب کے مستقبل کے حوالے سے شروع ہوگئی اور اس حوالے سے کہ کیا سوویت یونین اس مستقبل کی علامت ہے یا نہیں! دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت یونین کی طاقت نے مغرب کے اندر اور مغرب کے خلاف ردعمل کرنے والی غیر مغربی تہذیبوں میں کمیونزم کی کشش کو بڑھا دیا۔ مغرب کے غلبے والے غیر مغربی معاشروں کی اشرافیہ جو کہ مغرب کو ورغلانے کی خواہش رکھتی تھی جمہوریت اور خوداختیاری کی اصطلاحوں میں گفتگو کرنے لگی اور وہ لوگ جو مغرب سے تصادم چاہتے تھے انقلاب اور قومی آزادی کی اصطلاحوں میں کلام کرنے لگے تھے۔

مغربی نظریے کو اپناتے ہوئے مغرب کو چیلنج کرنے کیلئے اسے استعمال کرتے ہوئے روسی اپنی تاریخ کے کسی سابقہ زمانے کی نسبت مغرب کے زیادہ قریب آ گئے۔ اگرچہ لبرل ڈیموکریسی اور کمیونزم دونوں بہت مختلف تھے تاہم دونوں فریق ایک ہی زبان بولتی تھیں۔ کمیونزم اور سوویت یونین کے انہدام نے مغرب اور روس کے مابین یہ سیاسی نظریاتی تعامل ختم کر دیا۔ مغرب کو امید اور یقین تھا کہ نتیجہ ساری سابقہ روسی سلطنت میں

لبرل ڈیموکریسی کی فتح ہو گی تاہم یہ پہلے سے مقدر نہیں تھا جیسا کہ 1995ء میں روس اور دوسری آرتھوڈوکس جمہوریاؤں میں لبرل ڈیموکریسی کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ مزید یہ کہ جونہی روسیوں نے مارکسیوں کی طرح کا رویہ برتنا ترک کیا ہے اور روسیوں کی طرح برتاؤ اپنایا ہے تو مغرب اور روس کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ لبرل ڈیموکریسی اور مارکسی لینن ازم کے درمیان جھگڑا نظریاتی تھا اور اپنے بڑے اختلافات کے باوجود دونوں جدید اور سیکولر تھے نیز واضح طور پر دونوں کا مشترکہ مقصد آزادی' مساوات اور مادی خوشحالی تھا۔ کوئی مغربی ڈیموکریٹ سوویت مارکسی کے ساتھ دانش ورانہ بحث و مباحثہ جاری رکھ سکتا تھا لیکن اس کیلئے کسی روسی آرتھوڈوکس قوم پرست کے ساتھ ایسا کرنا ناممکن ہے۔

سوویت برسوں کے دوران میں سلاوو فائلوں اور مغرب پسندوں کے درمیان کھنچاؤ معطل ہو گیا کیونکہ دونوں سولزنٹسوں اور سخاروفوں نے کمیونسٹ نظریے کو چیلنج کیا تھا۔ اس نظریے کے انہدام کے ساتھ ہی روس کی حقیقی شناخت کی بحث پورے زور سے دوبارہ ابھر آئی ہے۔ کیا روس کو مغربی اقدار' ادارے اور اعمال اپنانے اور مغرب کا حصہ بننے کی کوشش کرنی چاہئے؟ یا کیا روس کو ایک ممتاز آرتھوڈوکس اور یوریشیائی تہذیب کو تشکیل دینا چاہئے جو کہ مغرب کی تہذیب سے مختلف ہو جس کا مقصد یورپ اور ایشیا کو باہم جوڑنا ہو؟ دانشور اور سیاسی اشرافیہ اور عام لوگ ان سوالوں کے حوالے سے سنجیدہ طور پر بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو مغرب پسند ''کاسموپولیٹنز'' یا ''اٹلانٹکس'' ہیں اور دوسری طرف سلاوو فائلوں کے جانشین ''قوم پرست' یوریشیا پسند'' یا ''ڈرژاونکی'' (مضبوط ریاست کے حامی) ہیں۔

ان گروپوں میں بڑے اختلافات خارجہ پالیسی اور قدرے کم درجے میں معاشی اصلاح اور ریاست کے ڈھانچے کے حوالے سے موجود ہیں۔ دونوں کی آراء انتہا پسندانہ ہیں۔ ایک گروہ ''نئی سوچ'' رکھنے والوں کا ہے جو گورباچوف کے متعین کردہ ہدف ''مشترکہ یورپی گھر'' کیلئے کوشاں ہیں نیز یلسن کے بہت سے چوٹی کے افسر اس کی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ روس ''ایک نارمل ملک'' بن جائے گا اور بڑی صنعتی ترقی

یافتہ جمہوریتوں کے جی سیون کلب کا آٹھواں رکن بن جائے گا۔ زیادہ معتدل قوم پرست مثلاً سرگی سٹانکیوچ دلیل دیتے ہیں کہ روس کو ''اٹلانٹکس'' کا راستہ چھوڑ دینا چاہئے اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے روسیوں کی حفاظت کو ترجیح دینی چاہئے۔ اس کے روسی اور مسلم روابط پر زور دیتے ہوئے ''ہمیں اپنے وسائل کی قابل قبول تقسیم نو کرنی چاہئے۔ اپنے مقاصد' اپنے معاہدوں اور اپنے مفادات کو ایشیا کے مفاد میں ڈھالنا چاہئے یا مشرق سمت میں۔''

اس سوچ کے حامل لوگ یلسن کو مغرب کی غلامی کا طعنہ دیتے ہیں۔ وہ تنقید کرتے ہیں کہ اس نے روس کی فوجی قوت کو گھٹا دیا ہے۔ روایتی دوستوں مثلاً سربیا کی مدد میں ناکام رہا ہے نیز روسیوں کیلئے نقصان دہ معاشی اور سیاسی اصلاحات کی ہیں۔ اس رجحان کی نشاندہی پیٹر ساوٹسکی کے نظریات کی نئی مقبولیت سے ہوتی ہے جس نے 1920ء کی دہائی میں کہا تھا کہ روس ایک منفرد یوریشیائی تہذیب ہے۔

زیادہ انتہا پسند قوم پرست روسی قوم پرست اور شاہی قوم پرست ہیں۔ اول الذکر کی نمائندگی سولژینٹسن کرتا ہے جو ایسے روس کی وکالت ہے جس میں سارے روسیوں کے ساتھ قریبی تعلق والے سلاوک آرتھوڈوکس' بائیلو روسی اور یوکرائنی شامل ہیں مگر کوئی اور دوسرا نہیں۔ موخرالذکر کی نمائندگی ولادیمیر زرینووسکی کرتا ہے جو سوویت شہنشاہیت کو بحال کرنا چاہتے ہیں نیز روس کی فوجی طاقت کو دوبارہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مغرب دشمن بھی ہیں نیز وہ چاہتے ہیں کہ روسی خارجہ پالیسی کا رخ مشرق اور مغرب کی طرف دوبارہ ہو یا تو مسلم جنوب پر (جیسا کہ زرینووسکی کا اصرار ہے) قبضہ کر لیا جائے یا مسلم ریاستوں اور چین کے ساتھ مغرب کی مخالفت میں تعاون کیا جائے۔ کاسموپولیٹنوں اور قوم پرستوں کے مابین اختلافات ادارہ جاتی سطح پر وزارت خارجہ اور فوج میں نمایاں طور پر ظاہر ہیں۔ یہ اختلافات یلسن کی ایک سمت سے دوسری سمت میں تبدیل ہونے والی خارجہ پالیسی سے بھی عیاں ہے۔

روسی عوام بھی روسی اشرافیہ کی طرح تقسیم ہو گئے ہیں۔ 1992ء میں دو ہزار انہتر

یورپی روسیوں کی نمونے کی رائے لی گئی تو چالیس فیصد رائے دہندہ ''مغرب کی طرف کشادہ'' چھتیس فیصد 'مغرب کیلئے بند'' اور چوبیس فیصد ''غیر فیصل'' تھے۔ دسمبر 1993ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں اصلاح پسند پارٹیوں نے کل ووٹوں کا 34.2 فیصد اور اصلاح پسندوں کی مخالف اور قوم پرست پارٹیوں نے 43.3 فیصد اور مرکز پسند پارٹیوں نے 13.7 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ اسی طرح جون 1996ء میں منعقد ہونے والے صدارتی انتخابات میں روسی عوام دوبارہ تقسیم ہو گئے۔ 43 فیصد نے مغرب کے امیدوار یلسن اور دوسرے اصلاح پسند امیدواروں کی حمایت کی اور 52 فیصد ووٹ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں نے حاصل کئے۔ اپنی شناخت کے مرکزی مسئلے کے حوالے سے روس 1990ء کی دہائی میں واضح طور پر ایک کٹا پھٹا ملک رہا۔ مغربی سلاو فائل دہرے پن کے ساتھ ''ایک غیر منفک قومی کردار کے خدوخال'' والا۔

ترکی

1920ء کی دہائی اور 1930ء کی دہائی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے انتہائی احتیاط کے ساتھ سوچی ہوئی اصلاحات کے سلسلے کے ذریعے کوشش کی کہ اس کے لوگ اپنے عثمانی اور مسلم ماضی سے علیحدہ ہو جائیں۔ کمال ازم کے بنیادی اصول یا ''چھ تیر'' تھے: عوامیت' جمہوریت پسندی' قوم پرستی' سیکولر ازم' ریاستیت اور اصلاح پسندی۔ کمال نے ایک کثیر القومی سلطنت کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے ایک قومی ریاست کو بنانے کا فیصلہ کیا اور اس عمل کے دوران امریکیوں اور یونانیوں کو باہر نکال دیا گیا یا قتل کر دیا گیا۔ تب اس نے سلطان کو فارغ کر دیا اور ایک مغربی طرز کا سیاسی اقتدار کاری ببلکن نظام قائم کیا۔ اس نے مذہبی اقتدار کے مرکزی سرچشمے خلافت کو مٹا ڈالا۔ روایتی تعلیم اور مذہبی وزارتوں کو ختم کر دیا۔ علیحدہ مذہبی سکولوں اور کالجوں کو مٹا ڈالا' سیکولر پبلک تعلیم کا ایک مشترکہ نظام قائم کیا اور مذہبی عدالتوں کو ختم کر دیا جو اسلامی قانون کا نفاذ کرتی تھیں اور ان کی جگہ سوئس سول کوڈ کی بنیاد پر دوسرا قانونی نظام رائج کیا۔ اس نے روایتی کیلنڈر کی جگہ گریگورین

کیلنڈر رائج کیا اور اسلام کو ریاست کے مذہب کی حیثیت سے محروم کر دیا۔ پیٹر دی گریٹ کی پیروی کرتے ہوئے اس نے فیض کے پہننے پر پابندی لگا دی کیونکہ وہ مذہبی روایت پسندی کی ایک علامت تھا' لوگوں کی ہیٹ پہننے کیلئے حوصلہ افزائی کی اور حکم دیا کہ ترکی زبان کو عربی رسم الخط کے بجائے رومی رسم الخط میں لکھا جائے۔ یہ آخری اصلاح بڑی بنیادی اہمیت کی حامل تھی۔ ''اس اقدام نے نئی نسلوں کیلئے' جنہوں نے رومی رسم الخط میں تعلیم حاصل کی ہو' روایتی ادب کے ذخیرے سے استفادے کو حقیقتاً ناممکن بنا دیا' اس سے یورپی زبانوں کے سیکھنے اور مطالعے کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس سے تعلیم کی شرح بڑھانے میں بہت زیادہ آسانی ہوئی۔'' کمال نے ترکوں کی قومی' سیاسی' مذہبی اور ثقافتی شناخت کو نئے سرے سے متعین کرتے ہوئے 1930ء کی دہائی میں ترکی کی معیشت کو ترقی دینے کیلئے بھرپور کوششیں کیں۔ مغربیت جدیدیت کے فروغ پانے کا ذریعہ بنی۔

ترکی مغرب کی 1939ء سے 1943ء کے دوران میں ہونے والی خانہ جنگی میں غیر جانبدار رہا۔ تاہم اس جنگ کے بعد وہ زیادہ تیزی سے مغرب سے اپنے آپ کو پہچان کروانے لگا۔ اس نے مغربی نمونوں کی پیروی کرتے ہوئے ایک پارٹی کی حکمرانی سے کثیر جماعتی مقابلہ جاتی نظام کو اپنا لیا۔ اس نے ناٹو کی رکنیت کے لیے لابنگ کی اور آخر کار 1952ء میں رکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح خود کو آزاد دنیا کا ایک رکن منظور کروا لیا۔ وہ مغرب کی معاشی اور سلامتی کے حوالوں سے اربوں ڈالر کی امداد حاصل کرنے والا ملک بن گیا' اس کی فوجوں کو مغرب سے تربیت اور ساز و سامان ملنے لگا اور ناٹو کمانڈ سٹرکچر میں شامل ہو کر اس نے امریکی فوجی بیس قائم کرنے کی اجازت دی۔ مغرب سوویت یونین کو بحیرۂ روم' مشرق وسطیٰ اور خلیج فارس کی طرف بڑھنے سے روکنے کیلئے ترکی کو اپنا مشرقی قلعہ تصور کرنے لگا۔ مغرب سے جوڑنے اور خود کو مغربی شناخت دینے کی وجہ سے غیر مغربیوں نے ترکوں کی مذمت کی اور 1955ء میں ہونے والی غیر جانبدار ملکوں کی بینڈونگ کانفرنس میں اسے نہیں بلایا گیا نیز اسلامی ملکوں نے اسے اسلام کی بے حرمتی کرنے والا قرار دے کر تنقید کا نشانہ بنایا۔

سرد جنگ کے بعد ترک اشرافیہ ترکی کی مغربی اور یورپی شناخت کی بھرپور حامی رہی۔ ناٹو کی رکنیت برقرار رہنا ان کے خیال میں بہت ضروری تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مغرب کے ساتھ ایک بہت قریبی تعلق قائم ہوتا ہے اور یونان کے مقابلے کیلئے بھی ایسا لازمی ہے تاہم مغرب کے ساتھ ترکی کا یہ عشق جو ناٹو میں اس کی رکنیت کا باعث بنا در حقیقت سرد جنگ کے خاتمے کا نتیجہ تھا۔ سرد جنگ کے خاتمے سے اس عشق کا سب سے بڑا جواز ختم ہو گیا اور کمزوری کی طرف لے گیا اور اس تعلق کو نئے سرے سے متعین کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ ترکی اب شمال سے کسی بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے مغرب کے واسطے قلعہ کی حیثیت سے محروم ہو گیا ہے تاہم خلیج کی جنگ میں حصہ دار بننے کے بعد وہ جنوب سے اٹھنے والے قدرے کم خطروں سے مقابلے کیلئے مغرب کی ضرورت ہے۔ اس جنگ میں ترکی نے صدام حسین مخالف اتحاد کی بے انتہا مدد کی تھی۔ اس نے عراقی تیل کی ترکی سے گزر کر بحیرہ روم تک پہنچنے والی پائپ لائن کو بند کر دیا اور عراق کے خلاف بمباری کرنے کیلئے امریکی جہازوں کو اپنے بیس استعمال کرنے کی اجازت دی۔ تاہم صدر اوزال کے ان فیصلوں سے ترکی کے اندر ٹھوس تنقید نے جنم لیا۔ اوزال کے خلاف امریکی حمایت کے الزام میں بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے اور فوجی چیف' وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کے استعفوں کے مطالبے کئے گئے۔ بعد میں صدر ڈیمرل اور وزیراعظم چلر نے عراق کے خلاف اقوام متحدہ کی پابندیاں ہٹانے کیلئے زور دیا جن کی وجہ سے ترکی پر بہت زیادہ معاشی بوجھ پڑ رہا تھا۔ جنوب سے ابھرنے والے مغرب کو درپیش اسلام کے خطرے سے نبرد آزما ہونے کیلئے ترکی کا مغرب کے ساتھ مل کر کام کرنا اس قدر یقینی نہیں ہے جتنا کہ سوویت خطرے کے خلاف مغرب کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا یقینی تھا۔ خلیج کی جنگ کے دوران میں جب ترکی پر ایک عراقی میزائل حملے کو ترکی کے روایتی دوست جرمنی نے ناٹو پر حملہ تصور نہیں کیا تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ترکی جنوبی خطروں کے مقابلے میں مغرب کا ساتھ نہیں دے گا۔ سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے زمانے میں ہونے والے تصادم کے دوران میں ترکی کے تہذیبی تشخص کا مسئلہ پیدا نہیں

ہوا تھا۔ مابعد سرد جنگ زمانے کے عرب ملکوں کے ساتھ تعلقات نے ایسا کر دیا۔

1980ء کی دہائی کے شروع میں ترکی کی مغرب نہاد اشرافیہ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی ہدف یورپی یونین میں رکنیت کے حصول کو یقینی بنانا تھا۔ ترکی نے رکنیت کیلئے باقاعدہ طور پر درخواست 1987ء میں دی۔ دسمبر 1980ء میں ترکی کو بتایا گیا کہ اس کی درخواست پر 1993ء سے پہلے غور نہیں کیا جا سکتا۔ 1994ء میں یونین نے آسٹریا' فن لینڈ' سویڈن اور ناروے کی درخواستیں منظور کرلیں اور آنے والے برسوں میں کافی زیادہ توقع ہے کہ پولینڈ' ہنگری اور چیک ری پبلک نیز ان کے بعد سلووینیا' سلوواکیا اور بالٹک جمہوریاؤں کے حق میں اقدامات کئے جائیں گے۔ ترکی کیلئے خصوصاً جس ملک کا رویہ مایوسی کا باعث بنا ہے وہ جرمنی ہے جو کہ یورپی کمیونٹی کا سب سے موثر رکن ہے۔ جرمنی نے ترکی کی رکنیت کیلئے فعال کردار ادا نہیں کیا جبکہ وہ وسطی ایشیائی ریاستوں کیلئے بہت سرگرم ہے۔ امریکہ کے دباؤ پر یونین نے ترکی کے ساتھ ایک رسمی اتحاد کیلئے مذاکرات کئے ہیں تاہم پوری رکنیت ایک دوراز کار امکان ہی ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ ترکی کو نظر انداز کیا گیا اور بظاہر وہ قطار کے آخر میں کیوں نظر آتا ہے؟ عوام میں یورپی افسران ترکی کی پست معاشی ترقی کا حوالہ دیتے ہیں اور سکینڈے نیویئن ملکوں سے انسانی حقوق کے کم احترام کا ذکر کرتے ہیں۔ نجی طور پر یورپی اور ترک ہر دو اس امر پر متفق ہیں کہ اصل وجہ یونان کی شدید مخالفت ہے نیز زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ ترکی ایک مسلم ملک ہے۔ یورپی ملک کسی ایسے ملک کیلئے اپنی سرحدیں کھولنے کے امکان کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتے جس کی چھ کروڑ آبادی مسلم ہو اور زیادہ تر بیروزگار ہو۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ترکی ثقافتی حوالے سے یورپ سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ جیسا کہ صدر اوزال نے 1992ء میں کہا تھا" ترکی کا انسانی حقوق کا ریکارڈ ایک ظاہری جواز ہے کہ کیوں ترکی یورپی کمیونٹی کا رکن نہیں بن سکا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم مسلم ہیں اور وہ عیسائی ہیں۔" تاہم اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا" وہ ایسا کہتے نہیں ہیں" اس کے جواب میں یورپی افسران اس بات پر متفق ہیں کہ یونین "ایک عیسائی کلب" ہے اور

یہ کہ ''ترکی بہت غریب ہے' اس کی آبادی بہت زیادہ ہے' یہ بہت زیادہ مسلم ہے' یہ بہت کرخت ہے' ثقافتی حوالے سے بہت مختلف ہے' ہر حوالے سے بہت مختلف ہے۔'' ایک مبصر نے تبصرہ کیا کہ یورپیوں کا ''نجی ڈراؤنا خواب''.....ترک حملہ آوروں کی مغربی یورپ پر یلغار اور ترکوں کی ویانا کے دروازوں سے آمد'' ان کی تاریخی یادداشت میں محفوظ ہے۔ ان رویوں کے جواب میں ''ترکوں کے اندر مشترک نقطۂ نظر'' پیدا ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ ''مغرب یورپ کے اندر ایک مسلم ترکی کیلئے کوئی مقام نہیں دیکھتا ہے۔''

مکہ کو مسترد کرتے ہوئے اور برسلز سے مسترد ہوتے ہوئے ترکی نے سوویت یونین کی تحلیل کے بعد تاشقند کی طرف رخ کرنے کا موقع گنوا دیا ہے۔ صدر اوزال اور دوسرے ترک لیڈروں نے ترک لوگوں کی کمیونٹی کا ایک وژن تخلیق کیا ہے جو ترکی کے ''قریبی ہمسائیگی'' سے لے کر چین کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ خصوصی توجہ کا مرکز آذر بائیجان اور چار ترکی بولنے والی وسطی ایشیائی جمہوریائیں ازبکستان' ترکمانستان' قزاقستان اور کرغزستان ہیں۔ 1991ء اور 1992ء میں ترکی نے ان جمہوریاؤں کے ساتھ اپنے معاہدے مضبوط بنیادوں پر قائم کیے اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کیلئے وسیع اقدامات کئے۔ ان اقدامات میں شامل ہیں 1.5 بلین ڈالر کا کم شرح سود کا طویل المدت قرضہ' 79 ملین ڈالر کی براہ راست امداد' سیٹلائٹ ٹیلی وژن (جو کہ روسی زبان والے چینل کا متبادل ہے)' ٹیلیفون' مواصلات' ایئر لائن کی سروس' ترکی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے طلباء کو ہزاروں سکالرشپس نیز وسطی ایشیائی اور آذری بینکاروں' کاروباری افراد' سفارتکاروں اور سینکڑوں فوجی افسروں کو ترکی میں تربیت کے مواقع فراہم کرنا' نئی جمہوریاؤں میں ترکی سکھانے کیلئے استاد بھیجے گئے ہیں نیز دو ہزار کے لگ بھگ مشترکہ منصوبوں (جوائنٹ وینچرز) پر کام شروع ہو گیا ہے۔ ثقافتی اشتراکات نے ان معاشی رشتوں کو ہموار بنا دیا ہے جیسا کہ ایک ترک کاروباری نے تبصرہ کیا ''آذر بائیجان یا ترکمانستان میں کامیاب ہونے کیلئے سب سے اہم چیز ایک موزوں پارٹنر کا ملنا ہے۔ ترک لوگوں کیلئے یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ ہماری ثقافت ایک ہے' زبان ایک ہے نیز

ہمارا دستر خوان ایک ہے۔"

ترکی کا وسطی ایشیا کی طرف نئے سرے سے میلان نہ صرف اس خواب سے مہمیز ہوا ہے کہ وہ ترک اقوام کی کمیونٹی کا لیڈر بنے بلکہ اس امر سے بھی کہ ایران اور سعودی عرب کو اپنا اثر و رسوخ وسیع کرنے اور علاقے میں بنیاد پرستی پھیلانے سے روکا جائے۔ ترک اپنے آپ کو "ترکی ماڈل" یا "ترکی کے نظریے"...... ایک سیکولر، جمہوری مسلم ریاست جو منڈی کی معیشت کی حامل ہے...... کی صورت میں ایک متبادل کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ ترکی روسی اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی امید رکھتا ہے۔ روس اور اسلام کے متبادل کے طور پر پیش کرتے ہوئے ترکی یورپی یونین سے بھرپور امداد اور بالآخر اس کی رکنیت کا خواہش مند ہے۔

ترکی کی ترک جمہوریاؤں میں ابتدائی پیش رفت صدر اوزال کی موت اور روس کے ان جمہوریاؤں میں ازسرنو عمل دخل سے محدود ہو کر رہ گئی جب سابق سوویت ترک جمہوریائیں آزاد ہوئی تھیں تو انہوں نے انقرہ کا رخ کیا تھا اور ترکی سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کر دی تھیں لیکن جب روس نے دباؤ ڈالا تو وہ واپس ہو گئیں اور ثقافتی کزن اور سابق استعماری آقا کے درمیان "متوازن" تعلقات کی بات کرنے لگیں تاہم ترکوں نے ان کے ساتھ اپنے معاشی اور سیاسی رشتے استوار کرنے کیلئے ثقافتی اشتراکات کو استعمال کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور سب سے اہم جنگ میں یوں فتح پائی کہ وسطی ایشیائی اور آذر بائیجانی تیل کو ترکی کے راستے بحیرۂ روم تک پہنچانے کیلئے متعلقہ حکومتوں اور تیل کمپنیوں سے معاہدے کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس وقت ترکی سابق سوویت ترک جمہوریاؤں سے اپنے تعلقات بڑھانے میں مصروف تھا اس کی کمالسٹ سیکولر شناخت کو داخلی طور پر خطرات لاحق ہو رہے تھے۔ بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح ترکی کیلئے بھی اول تو سرد جنگ کے اختتام اور معاشی اور سماجی ترقی سے پیدا ہونے والی بے ترتیبی نے "قومی تشخص اور نسلی شناخت" کے بڑے مسائل کھڑے کر دیئے اور مذہب ان کا حل پیش کرنے کیلئے حاضر تھا۔ ایک صدی کے دو تہائی عرصے پر محیط اتاترک اور

ترکی کی اشرافیہ کا ورثہ اب شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ترکی کی خارجی دلچسپیوں نے داخلی طور پر اسلام پسندوں کو ابھارا' مین سٹریم رائے اور عمل اسلام پسند ہو گیا۔ 1993ء میں رپورٹ آئی کہ ''ترکی میں عورتوں میں پردے اور مردوں میں داڑھیوں کا اسلامی رواج عام ہونے لگا ہے۔ مسجدوں میں ہجوم زیادہ ہونے لگا ہے اور کتابوں کی دکانیں اسلامی تاریخ' تصورات اور طرز حیات پر مبنی کتابوں' کیسٹوں' سی ڈیز سے بھری پڑی ہیں نیز عثمانی سلطنت کی پیغمبر محمدؐ کی اقدار کو محفوظ کرنے پر ستائش کی جا رہی ہے۔'' مبینہ طور پر ''290 پبلشنگ ہاؤسز پرنٹنگ پریس' 300 پبلکیشنز بشمول چار روزنامے' سو غیر لائسنس یافتہ ریڈیو سٹیشن اور 30 ایسے ہی غیر لائسنس یافتہ ٹی وی چینل اسلامی آئیڈیالوجی کا پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔''

اس اسلام پسند جذبے سے نبرد آزما ہونے کیلئے ترک حکمران بنیاد پرستانہ اقدامات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ بنیاد پرستوں کی حمایت حاصل کر سکیں۔ 1980ء اور 1990ء کی دہائی کے دوران سیکولر ترک حکومت نے ایک وزارت مذہبی امور قائم کی جس کا بجٹ کئی دوسری وزارتوں سے زیادہ ہے جو مسجدوں کی تعمیر کیلئے پیسہ دیتی ہے' تمام پبلک سکولوں کو مطلوبہ مذہبی تعلیم کا بندوبست کرتی ہے اور اسلامی سکولوں (مدرسوں ......مترجم) کو فنڈز فراہم کرتی ہے۔ یہ مدرسے بہت زیادہ مقبول ہو رہے ہیں اور اب تو ان کے گریجوایٹ حکومتی ملازمتوں میں بھی آ چکے ہیں۔ فرانس کے برعکس علامتی لیکن ڈرامائی طور پر حکومت نے سکول کی طالبات کو مسلم سکارف اوڑھنے کی اجازت دے دی ہے۔ ایسا اقدام اتاترک کے فیض پر پابندی لگانے کے ستر برس بعد عمل میں لایا گیا ہے۔

دوم: اسلام کے ابھار نے ترک سیاست کی خصوصیت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سیاسی لیڈرز' سب سے زیادہ اہم' ترگت اوزال اپنے آپ کو مسلم علامتوں اور پالیسیوں سے شناخت کروا رہے ہیں۔ ہر جگہ کی طرح ترکی میں بھی جمہوریت نے مقامیت اور مذہب کی طرف لوٹنے کا راستہ ہموار کیا ہے۔ سیاست دانوں کے علاوہ سیکولر ازم کی پشت پناہ فوج بھی عوام کی حمایت حاصل کرنے کیلئے اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہے اور ملاؤں کو

بہت سی رعائتیں دے رہی ہے۔ ترک عوامی تحریکیں مذہب کی طرف جھکاؤ رکھتی ہیں جبکہ اشرافیہ اور بیوروکریٹک گروپ خصوصاً فوج جو سیکولر اساس ہیں ان کے اندر بھی اسلامی جذبات نمودار ہو رہے ہیں۔ 1987ء میں سینکڑوں کیڈٹوں کو اسلام پسندانہ جذبات کے حامل ہونے کے شک میں فوجی اکیڈمیوں سے نکال دیا گیا۔ بڑی سیاسی پارٹیوں میں یہ احساس روز افزوں ہے کہ ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے اتاترک کے ممنوع قرار دیئے گئے مسلم ''شعائر'' سے مدد حاصل کی جائے۔ ویلفیئر پارٹی کی انتخابی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے ووٹوں کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔

سوم: اسلام کے ابھارنے ترکی کی خارجہ پالیسی پر بھی اثر ڈالا ہے۔ ترکی صدر اوزال کی لیڈرشپ میں خلیج کی جنگ کے دوران میں مغرب کے شانہ بشانہ کھڑا ہوا تھا اور اس توقع کے ساتھ کہ اس کے اس عمل سے اسے یورپی برادری (یورپین کمیونٹی) میں رکنیت ملنا ممکن ہو جائے گا تاہم ایسا ہوا نہیں نیز ترکی پر عراق کے ممکنہ حملے کے حوالے سے ناٹو کی ہچکچاہٹ نے کہ غیر روسی خطرے کے خلاف مدد کی جائے یا نہیں' ترکی کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ ترک لیڈر اسرائیل کے ساتھ اپنے فوجی تعلقات کو وسعت دینے کی کوششیں کر رہے ہیں جس پر ترک اسلام پسندوں نے شدید تنقید کی ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ 1980ء کی دہائی کے دوران میں ترکی نے عرب اور دوسرے مسلم ملکوں کے ساتھ اپنے مراسم کو توسیع دی ہے نیز ترکی نے بوسنیائی مسلموں اور آذربائیجان کی بھرپور مدد کر کے اپنے اسلامی مفادات کو فروغ دیا ہے۔ بلقان' وسطی ایشیا یا مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ترک خارجہ پالیسی زیادہ اسلامی ہو گئی ہے۔

میکسیکو

ترکی 1920ء کی دہائی میں ایک منقسم ملک بنا تھا۔ میکسیکو 1980ء کی دہائی تک نہیں بنا تھا تاہم مغرب کے ساتھ ان کے تاریخی رشتوں میں کئی مماثلتیں ہیں۔ ترکی کی طرح میکسیکو کی ثقافت واضح طور پر غیر مغربی ہے۔ جیسا کہ اوکٹو یو پاز نے کہا ہے کہ

بیسویں صدی میں بھی ''میکسیکو کا قلب انڈین ہے۔ یہ غیر یورپی ہے۔'' انیسویں صدی میں میکسیکو عثمانی سلطنت کی طرح مغرب کے ہاتھوں تقسیم ہو گیا۔ بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں میکسیکو ترکی کی طرح ایک انقلاب سے گزرا جس نے ایک نئی قومی شناخت قائم کی اور ایک نیا یک جماعتی سیاسی نظام وضع کیا تاہم ترکی میں انقلاب کے دو پہلو تھے ایک تو روایتی اسلامی اور عثمانی ثقافت کو رد کرنا اور مغربی ثقافت کو درآمد کرنا اور دوسرے مغرب سے منسلک ہونا' میکسیکو میں روس کی طرح انقلاب مغربی ثقافت کے عناصر کی بیخ کنی پر منتج ہوا جس نے ایک نئی قسم کی قوم پرستی کو جنم دیا جو مغرب کی سرمایہ داری اور جمہوریت کی مخالف تھی لہٰذا ساٹھ برس سے ترکی خود کو یورپی قرار دلوانے کی کوششیں کر رہا ہے جبکہ میکسیکو خود کو امریکہ کے الٹ تصور کروانے کیلئے کوشاں ہے۔ 1930ء کی دہائی سے 1980ء کی دہائی تک میکسیکو کے لیڈروں نے ایسی معاشی اور خارجہ پالیسیاں اپنائی ہیں جو امریکی مفادات کو چیلنج کرتی رہی ہیں۔

1980ء کی دہائی میں یہ رویہ تبدیل ہو گیا۔ صدر میگل ڈی لا میڈرڈ نے آغاز کیا اور صدر کارلوس سیلیناس ڈی گورٹری نے میکسیکی مقاصد' اعمال اور تشخص کی مکمل طور پر تعیین نو کے عمل کو آگے بڑھایا جو کہ 1910ء کے انقلاب کے بعد تبدیلی کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ نتیجتاً سیلیناس میکسیکو کا کمال اتاترک بن گیا۔ اتاترک نے اپنے وقتوں کے غالب مغربی تصورات سیکولر ازم اور قوم پرستی (نیشنل ازم) کو فروغ دیا تھا' سیلیناس نے معاشی آزادی (لبرلائزیشن) کو فروغ دیا ہے جو کہ اس کے زمانے کے مغرب کے دو غالب تصورات میں سے ایک ہے۔ (دوسرا ہے سیاسی جمہوریت' جس کو اس نے نہیں اپنایا ہے) اتاترک کی طرح ان تصورات کو میکسیکی سیاسی اور معاشی اشرافیہ نے سراہا اور ان کی حمایت کی ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ سیلیناس اور ڈی لا میڈرڈ کی طرح امریکہ میں پڑھے ہیں۔ سیلیناس نے ڈرامائی طور پر افراط زر کو کم کیا ہے' سرکاری اداروں کو بڑی تعداد میں پرائیویٹائز کیا ہے' غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دیا ہے' ٹیرف اور مراعات (سبسڈیز) کو کم کیا ہے' غیر ملکی قرضوں کو ری سٹرکچر کیا ہے' لیبر یونینوں کی طاقت کو چیلنج کیا ہے'

پیداواریت کو بڑھایا ہے اور میکسیکو کو امریکہ اور کینیڈا کے ساتھ نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ میں شامل کیا ہے۔ بالکل اتاترک کی اصلاحات کی طرح کہ ترکی کو مشرق وسطیٰ کے مسلم ملک سے منقلب کر کے سیکولر یورپی ملک بنا دیا جائے' سیلیناس کی اصلاحات میکسیکو کو لاطینی امریکی ملک سے منقلب کر کے شمالی امریکی ملک بنانے پر مرکوز ہیں۔

میکسیکو کیلئے یہ کوئی ناگزیر انتخاب نہیں ہے۔ کچھ میکسیکی اشراف تیسری دنیا کی امریکہ مخالف قوم پرستی اور تحفظ پرستی کے موید ہیں جس پر ان کے آباؤ اجداد صدی بھر عمل پیرا رہے ہیں۔ متبادل کے طور پر وہ سپین' پرتگال اور جنوبی امریکی ملکوں سے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں۔

کیا میکسیکو اپنی شمالی امریکی جستجو میں کامیاب ہو جائے گا؟ سیاسی' معاشی اور دانش ور اشرافیہ کی اکثریت اس راستے کو پسند کرتی ہے۔ ترکی کے برعکس موصولی تہذیب کی سیاسی' معاشی اور دانش ور اشرافیہ میکسیکو کے ثقافتی اتحاد نو کو پسند کرتی ہے۔ سب سے اہم بین التہذیبی مسئلہ یعنی امیگریشن اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ ترکوں کی وسیع نقل مکانی' تارک الوطنی (امیگریشن) کا خوف ہی ہے کہ یورپی اشرافیہ اور عوام دونوں ہی ترکی کو یورپ میں لانے سے گریزاں ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ میں میکسیکیوں کی قانونی اور غیر قانونی امیگریشن کا معاملہ سیلیناس کے نافٹا (NAFTA) کیلئے معاہدے کا ایک جزو تھا "یا تو تم ہماری مصنوعات کو قبول کرو یا ہمارے لوگوں کو۔" مزید یہ کہ میکسیکو اور امریکہ کے مابین ثقافتی فرق یورپ اور ترکی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ میکسیکو کا مذہب کیتھولک ازم ہے۔ اس کی زبان ہسپانوی ہے' اس کی اشرافیہ تاریخی حوالہ سے یورپ اساس ہے (جہاں وہ اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجتے ہیں) اور اب حال ہی میں امریکہ اساس (جہاں وہ اب اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجتے ہیں)۔ اینگلو امریکی شمالی امریکہ اور ہسپانوی انڈین میکسیکو کے مابین ہم آہنگی عیسائی یورپ اور مسلم ترکی کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ ان مماثلتوں کے باوجود نافٹا (NAFTA) کی توثیق کے بعد امریکہ میں میکسیکو کے

ساتھ زیادہ قریبی تعلقات بڑھانے کے خلاف رائے پیدا ہو گئی ہے جس کی اساس امیگریشن کو محدود کرنے کے مطالبات' جنوب کی طرف فیکٹریوں کی منتقلی کی شکایات اور میکسیکو کی آزادی اور قانون کی حکمرانی کے شمالی امریکی تصورات سے وابستگی کی اہلیت کے حوالے سے سوالات پر ہے۔

کٹے ہوئے ملک کی شناخت میں کامیاب تبدیلی کیلئے تیسری شرط ہے عوام کی عمومی قبولیت۔ اس عامل کی اہمیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذکورہ ملک میں عوامی رائے کو فیصلہ سازی میں کتنی فوقیت دی جاتی ہے۔ نئے سال کے موقع پر غیر ملکی حمایت کے ساتھ کچھ گواہوں کا چیاپاز میں مظاہرہ شمالی امریکی رنگ میں رنگنے کے خلاف کوئی اہم علامت نہیں تھا تاہم میکسیکی دانشوروں' صحافیوں اور دوسرے رائے عامہ کو تشکیل کرنے والے لوگوں کا ہمدردانہ طرز عمل نشاندہی کرتا ہے کہ شمالی امریکی رنگ میں رنگنے کے عمل سے عمومی طور پر اور نافٹا کے حوالے سے میکسیکی اشرافیہ اور عوام میں مزاحمت جلد دم توڑ دے گی۔ صدر سیلیناس نے معاشی اصلاح اور مغربیت کو سیاسی اصلاح اور جمہوریت پر شعوری ترجیح دی ہے۔ تاہم معاشی ترقی اور امریکہ کے ساتھ دوستی ہر دو کی وجہ سے ان قوتوں کو تقویت ملے گی جو میکسیکی سیاسی نظام کو حقیقی جمہوری بنانا چاہتے ہیں۔ میکسیکو کے مستقبل کے حوالے سے کلیدی سوال یہ ہے کہ کیا 1980ء کی دہائی میں مغرب اساس اشرافیہ کی طرف سے میکسیکو پر عائد کی گئی پالیسیوں میں مساوی تبدیلی آئے گی اور جدیدیت اور جمہوریت کا عمل غیر مغربیت کو بڑھائے گا؟ کیا میکسیکو کی شمالی امریکیت اس کے جمہوریانے کے عمل سے قابل موازنہ ہے؟

مغربی وائرس اور ثقافتی شیزوفرینیا

جہاں آسٹریلیا کے لیڈر ایشیا کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں وہاں دوسرے کٹے ہوئے ملک ترکی' میکسیکو اور روس اپنے معاشروں کو مغرب کے اثر ونفوذ کیلئے اور مغرب کے اندر اپنے معاشروں کے انجذاب کیلئے کوششیں کر رہے ہیں۔ جہاں مسترد کرنے والوں کا

مغرب کو جواب ناممکن ہے۔ کمال پسندوں کا جواب بھی ناکام رہا ہے۔ اگر غیر مغربی معاشروں کو جدید ہونا ہے تو انہیں لازماً اسے اپنے طریقے سے کرنا ہو گا نہ کہ مغربی طریقے سے اور اپنی روایات' اداروں اور اقدار کو فوقیت دینا ہو گی۔

جو سیاسی لیڈر اپنے معاشروں کی ثقافتوں کو نئی صورت دینے کے خیال سے مصروف عمل ہیں وہ ناکام ہوں گے۔ جہاں وہ مغربی ثقافت کے عناصر کو متعارف کروا سکتے ہیں وہاں وہ اپنی مقامی ثقافت کے عناصر کو مٹانے یا مستقلاً دبانے کے اہل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس یہ بھی ہے کہ جب مغربی وائرس کسی معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کو نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وائرس مستقل رہتا ہے تاہم مہلک نہیں ہوتا۔ مریض بچ تو جاتا ہے تاہم مکمل طور پر نہیں۔ سیاسی لیڈر تاریخ بنا سکتے ہیں لیکن وہ تاریخ سے فرار نہیں ہو سکتے۔ وہ کٹے ہوئے ملک تخلیق کرتے ہیں' وہ مغربی معاشرے تخلیق نہیں کرتے۔ وہ اپنے ملک کو ثقافتی شیزوفرینیا میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

باب 7

مرکزی ریاستیں اور تہذیبی نظام

تہذیبیں اور نظام

ابھرتی ہوئی عالمی (گلوبل) سیاست میں بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں سرد جنگ کی دو سپر پاوروں کو دوسرے ملکوں کیلئے کشش اور گریز کے اہم قطبین کے طور پر جگہ لے رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں مغربی، آرتھوڈوکس اور چینی تہذیبوں کے حوالے سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں۔ ان تہذیبی بلاکوں میں شامل ریاستیں اپنے شناخت کے درجے اور اس بلاک سے ارتباط کو ظاہر کرتے ہوئے اکثر مرکزی ریاست یا ریاستوں کے گرد ہم مرکز دائروں میں تقسیم ہونے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اسلام کسی مسلمہ مرکزی ریاست کی عدم موجودگی میں، اپنے مشترک شعور کو مضبوط کر رہا ہے لیکن اب تک صرف ایک مشترک سیاسی ڈھانچہ ہی بنا سکا ہے۔

ملک یکساں ثقافت سے تعلق رکھنے والے ملکوں کے ساتھ ایک رتھ میں سوار ہونے اور ثقافتی اشتراک نہ رکھنے والے ملکوں کے خلاف متوازن ہونے کیلئے مائل ہوتے ہیں۔ یہ خصوصی طور پر مرکزی ریاستوں کے حوالے سے حقیقت ہے۔ ان کی قوت انہیں کھینچتی ہے جو ثقافتی طور پر یکساں ہوتے ہیں اور انہیں دھکیلتی ہے جو ثقافتی اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ سلامتی کے حوالوں سے مرکزی ریاستیں دوسری تہذیبوں کے لوگوں پر غلبہ پانے یا انہیں شامل کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں جو بدلے میں مزاحمت کرنے یا اس غلبے (کنٹرول) سے نکلنے کی

کوشش کرتی ہیں۔ (چین بمقابلہ تبتی اور اویغور، روس بمقابلہ تاتاری، چیچینائی، وسطی ایشیائی مسلمان) تاریخی رشتے اور توازن طاقت کے مسائل بھی کچھ ملکوں کو اپنی مرکزی ریاست کے اثر کی مزاحمت کی طرف مائل کرتے ہیں۔ روس اور جارجیا دونوں آرتھوڈوکس ملک ہیں لیکن جارجیائیوں نے تاریخی حوالوں سے روسی غلبے اور روس کے ساتھ قریبی اتحاد کی مزاحمت کی ہے۔ ویتنام اور چین دونوں کنفیوشسی ملک ہیں تاہم ان کے درمیان تاریخی دشمنی کے قابل موازنہ پیٹرن موجود ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ثقافتی اشتراک اور ایک وسیع اور مضبوط تر تہذیبی شعور کا ارتقاان ملکوں کو متحد کر سکتا ہے جیسا کہ یورپی ملک اکٹھے ہو گئے ہیں۔

سرد جنگ کے دوران میں جو بھی نظام تھا وہ سپر پاوروں کے اپنے اپنے دو بلاکوں پر غلبے اور تیسری دنیا میں سپر پاوروں کے اثر کی پیداوار تھا۔ ابھرتی ہوئی دنیا میں عالمی (گلوبل) طاقت، عالمی (گلوبل) برادری ایک خواب بعید ہے۔ امریکہ کے بشمول کوئی ملک بھی اہم گلوبل سلامتی مفادات نہیں رکھتا ہے۔ آج کی زیادہ پیچیدہ دنیا کے اندر نظام کے اجزاء تہذیبوں کے اندر اور مابین پائے جاتے ہیں۔ دنیا تہذیبوں کی بنیاد پر منظم ہو گی یا پھر بالکل نہیں۔ اس دنیا میں تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں تہذیبوں کے اندر نظم (آرڈر) کا سرچشمہ ہیں اور دوسری مرکزی ریاستوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے تہذیبوں کے درمیان۔

ایسی دنیا جہاں مرکزی ریاستیں ایک رہنما یا غالب کردار ادا کرتی ہیں اثرات کی سطحوں والی دنیا ہے لیکن یہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں مرکزی ریاست کی اثر اندازی کا عمل اس تہذیب کی رکن ریاستوں کی مشترک ثقافت کے ذریعے تبدیل یا معتدل ہوتا ہے۔ مرکزی ریاست کے رکن ریاستوں اور خارجی طاقتوں اور اداروں کیلئے لیڈر شپ اور نظم (آرڈر) کے نفاذ کرنے والے کردار کو ثقافتی اشتراک جواز فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا ایسا کرنا بے معنی ہے جیسا کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس بطروس غالی نے 1994ء میں کیا نیز اقوام متحدہ علاقائی طاقت کا متبادل نہیں ہے اور علاقائی طاقت اس وقت ذمہ دار اور قانونی ہو جاتی ہے جب مرکزی ریاست کے اپنی تہذیب سے تعلق رکھنے والے دوسرے ملکوں کے ساتھ رشتے کے ذریعے روبہ عمل آتی ہے۔ ایک مرکزی ریاست اپنا تنظیمی کردار ادا کر سکتی ہے

کیونکہ رکن ریاستیں اسے ثقافتی رشتہ دار تصور کرتی ہیں۔ ایک تہذیب ایک توسیع شدہ خاندان ہوتی ہے اور خاندان کے بزرگوں کی طرح مرکزی ریاستیں بھی اپنے رشتہ داروں کو مدد اور نظم وضبط مہیا کرتی ہیں۔ اس کی عدم موجودگی میں ایک انتہائی طاقتور ریاست کی اپنے علاقے میں جھگڑے سلجھانے اور نظم (آرڈر) کو نافذ کرنے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور یہاں تک کہ سری لنکا بھی ہندوستان کو جنوبی ایشیا میں نظم (آرڈر) فراہم کرنے والے کی حیثیت میں قبول نہیں کریں گے اور کوئی مشرقی ایشیائی ریاست جاپان کو مشرقی ایشیا میں ایسے ہی کردار کی ادائیگی کے لیے قبول نہیں کرے گی۔

جب تہذیبوں میں مرکزی ریاستیں موجود نہیں ہوتی ہیں تو تہذیبوں کے اندر نظم (آرڈر) کو قائم کرنا یا تہذیبوں کے درمیان نظم (آرڈر) کیلئے گفت وشنید بہت زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔ کسی ایسی مرکزی اسلامی ریاست کے نہ ہونے ہی نے جو بوسنیائیوں سے قانونی اور مقتدرانہ طور سے مربوط ہوتی، جیسا کہ روس سربوں کیلئے اور جرمنی کروٹوں کیلئے ہے امریکہ کو یہ کردار ادا کرنے پر اکسایا۔ ایسا کرنے میں اس کی بے اثری کی وجہ یہ تھی کہ سابق یوگوسلاویہ میں اس کا کوئی سٹریٹیجک مفاد نہیں تھا۔ بوسنیا اور امریکہ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ نہیں تھا اور یورپی ملکوں نے یورپ میں ایک اسلامی ریاست کی تخلیق کی مخالفت کی تھی۔ افریقہ اور عرب دنیا ہر دو میں مرکزی ریاستوں کی عدم موجودگی نے سوڈان میں جاری خانہ جنگی کو رکوانے کی کوششوں کو الجھا دیا ہے۔ اس کے برعکس جہاں مرکزی ریاستیں وجود رکھتی ہیں وہ تہذیبوں پر استوار نئے بین الاقوامی نظام میں مرکزی عناصر کا درجہ رکھتی ہیں۔

مغرب کی حد بندی

سرد جنگ کے دوران میں امریکہ ملکوں کی ایک بڑی، متنوع اور کثیر التہذیبی گروہ بندی کا مرکز تھا جس کا مشترکہ مقصد سوویت یونین کو مزید توسیع سے روکنا تھا۔ اس گروہ بندی کو مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا مثلاً ''آزاد دنیا'' ''مغرب'' یا ''اتحادی'' جن میں سارے تو نہیں لیکن بہت سے مغربی معاشرے، ترکی، یونان، جاپان، کوریا، فلپائن، اسرائیل

ور زیادہ وسعت دیں تو دوسرے ملک جیسے تائیوان' تھائی لینڈ اور پاکستان شامل تھے۔ اس کی مخالف گروہ بندی بہت تھوڑی غیر متجانس تھی۔ اس میں یونان کے علاوہ سارے ہی آرتھوڈوکس ملک شامل تھے۔ ایسے ملک بھی شامل تھے جو تاریخی حوالے سے مغربی تھے۔ اس میں ویتنام' کیوبا اور کسی حد تک ہندوستان اور وقت پڑنے پر ایک یا زیادہ افریقی ملک شامل تھے۔ سرد جنگ ختم ہونے سے یہ کثیر التہذیبی' ہمہ ثقافتی گروہ بندیاں بکھر کے رہ گئیں۔ سوویت سسٹم خصوصاً وارسا پیکٹ کی تحلیل ڈرامائی تھی۔ زیادہ آہستہ لیکن مساوی طور پر' کثیر التہذیبی سرد جنگ کی ''آزاد دنیا'' ایسی گروہ بندی کے طور پر نئے سرے سے تشکیل ہو رہی ہے جو مغربی تہذیب سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ مغربی بین الاقوامی تنظیموں کی رکنیت کے نئے سرے سے تعین کے حوالے سے ایک تجدیدی عمل جاری ہے۔

یورپی یونین کی مرکزی ریاستیں فرانس اور جرمنی کے اردگرد پہلا دائرہ بیلجیئم' نیدرلینڈز (ہالینڈ) اور لکسمبرگ پر مشتمل داخلی گروہ بندی بناتی ہے۔ یہ سب کے سب ملک اشیاء اور افراد کی آمدورفت کی راہ میں کھڑی رکاوٹوں کو ختم کر دینے پر متفق ہیں۔ پھر دوسرے رکن ملک مثلاً اٹلی' سپین' پرتگال' ڈنمارک' برطانیہ' آئرلینڈ اور یونان ہیں۔ 1995ء میں رکن بننے والی ریاستیں (آسٹریا' فن لینڈ' سویڈن) ہیں اور وہ ملک ہیں جو ایسوسی ایٹ رکن ہیں (پولینڈ' ہنگری' چیک ری پبلک' سلوویکیا' بلغاریہ اور رومانیہ) اس حقیقت کو منعکس کرتے ہوئے 1994ء کے موسم خزاں میں جرمنی کی حکمران پارٹی اور فرانس کے چوٹی کے افسروں نے ایک ممتاز و منفرد اتحاد کی تجاویز پیش کیں۔ جرمن منصوبے میں تجویز کیا گیا کہ ''مرکز اصلی'' (Hard Core) اٹلی کو منہا کر کے باقی ماندہ اصل ارکان پر مشتمل ہے اور یہ کہ ''جرمنی اور فرانس مرکز اصلی (Hard Core) کے مرکزے ہیں۔'' ہارڈ کور ممالک تیزی سے اس اقدام کیلئے کوشاں ہیں کہ ایک زری (Monetary) اتحاد قائم کر لیا جائے اور اپنی خارجہ اور دفاعی پالیسیوں کو مربوط بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تقریباً اس کے ساتھ ساتھ ہی فرانسیسی وزیراعظم نے مرکز کو تشکیل دینے والی پانچ اتحاد پسندی کی حامی ریاستوں کے سہ عقدی (THREE TIER) اتحاد کی تجویز دی۔ دوسری موجودہ ارکان

ریاستیں ایک دوسرا دائرہ تشکیل دیں گی اور نئی ریاستیں جو رکن بننے کی راہ پر گامزن ہیں ایک خارجی دائرہ تشکیل دیں گی۔ اس کے نتیجے میں فرانسیسی وزیر خارجہ الان یوپے نے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے تجویز دی ہے کہ "پارٹنر ریاستوں کا ایک خارجی دائرہ جس میں وسطی اور مشرقی یورپ شامل ہے، رکن ریاستوں کا ایک وسطی دائرہ جو مخصوص شعبوں (واحد مارکیٹ، روایتی اتحاد وغیرہ) میں مشترک نظم (ڈسپلنز) کو قبول کرنے کا حاجت مند ہوگا اور بہت سے داخلی دائرے جو کہ ان شعبوں میں دوسرے کی نسبت زیادہ تیزی سے حرکت کرنے کے اہل اور رضامند ہوں جیسے دفاع، زری اتحاد، خارجہ پالیسی وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے سیاسی لیڈروں نے تنظیم و ترتیب کی دوسری تجاویز پیش کی ہیں۔ یہ سب کی سب زیادہ قربت رکھنے والی ریاستوں کی داخلی گروہ بندی پر شامل ہیں اور اس کے بعد مرکزی ریاست سے نسبتاً کم کامل ربط و اتحاد رکھنے والی ریاستوں کی خارجی گروہ بندیاں ہیں۔ پھر وہ خط کھنچتا ہے جو ارکان کو غیر ارکان سے الگ کرتا ہے۔

یورپ میں اس خط کو کھینچنے کا عمل ایک بڑا چیلنج ہے۔ جو مابعد سرد جنگ دنیا میں مغرب کو درپیش ہے۔ سرد جنگ کے دوران میں یورپ کلی طور پر وجود نہیں رکھتا تھا۔ کمیونزم کے انہدام کے ساتھ اس سوال سے دوچار ہونا اور اس کا جواب دینا لازمی ہوگیا کہ یورپ کیا ہے؟ یورپ کی سرحدیں شمال، مغرب اور جنوب میں پانی کے ٹھوس ذخیروں نے محدود کر رکھی ہیں۔ جنوب میں واضح طور پر ثقافتی اختلافات موجود ہیں لیکن یورپ کی مشرقی سرحد کہاں ہے؟ کون ہے جو یورپی کے طور پر سوچے اور لہٰذا یورپی یونین، ناٹو اور دوسری قابل موازنہ تنظیموں کے خوابیدہ ارکان کے طور پر؟

ان سوالوں کا جواب وہ عظیم تاریخی خط دیتا ہے جو صدیوں سے مغربی عیسائی لوگوں کو مسلمانوں اور آرتھوڈوکس لوگوں سے علیحدہ کرتے ہوئے موجود ہے۔ اس خط کا سرا جا ملتا ہے چوتھی صدی میں رومی سلطنت کی تقسیم اور دسویں صدی میں مقدس رومی سلطنت کی تخلیق سے۔ اس کو خام اندازے کے مطابق اس حالت میں کم از کم پانچ سو برس ہوگئے ہیں۔ شمال سے شروع ہوتے ہوئے یہ آج کے فن لینڈ اور روس نیز بالٹک ریاستوں (ایسٹونیا، لیٹویا،

لیتھوینیا) اور روس کے درمیان کھنچی سرحدوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مغربی بیلا روس سے یوکرائن سے مغربی یونی ایٹ کو مشرقی آرتھوڈوکس سے الگ کرتے ہوئے رومانیہ اور لوینیا کے درمیان سے اس کی کیتھولک ہنگری نژاد آبادی اور باقی ماندہ ملک سمیت اور یوگوسلاویہ سے اس سرحد کے ساتھ ساتھ جو سلووینیا اور کروشیا کو دوسری جمہوریاؤں سے الگ کرتی ہے گزرتا ہے۔ بلقان میں یہ خط اس تاریخی تقسیم سے متصل ہے جو آسٹرو ہنگرین اور عثمانی ریاستوں کے درمیان تھی۔ یہ یورپ کی ثقافتی سرحد ہے اور مابعد سرد جنگ دنیا میں یہ یورپ اور مغرب کی سیاسی اور معاشی سرحد بھی ہے۔

لہٰذا تہذیبی تعریف مغربی یورپیوں کو درپیش سوال کا واضح اور بھرپور جواب دیتی ہے۔ یورپ کہاں ختم ہوتا ہے؟ یورپ وہاں ختم ہوتا ہے جہاں سے اسلام اور آرتھوڈوکسی شروع ہوتے ہیں۔ یہ وہ جواب ہے جو مغربی یورپی سننا چاہتے ہیں جس کی وہ پرجوش حمایت کرتے ہیں جیسا کہ مائیکل ہاورڈ کہتا ہے کہ یہ لازمی ہے کہ وسطی یورپ اور مشرقی یورپ کے درمیان اس فرق کو درست طور پر تسلیم کیا جائے جو سوویت دور کے دوران میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ وسطی یورپ میں شامل ہیں ''وہ ریاستیں جو کبھی مغربی عیسائیت کا جزو تھیں' ہیپسبرگ سلطنت کی پرانی ریاستیں' آسٹریا' ہنگری اور چیکوسلواکیہ بشمول پولینڈ اور جرمنی کی مشرقی متنازعہ سرحدیں۔''

''مشرقی یورپ'' کی اصطلاح ان علاقوں (ریجنز) کیلئے مختص کر دی جانی چاہئے جو آرتھوڈوکس کلیسا کے زیر اثر ارتقا پذیر ہوئے یعنی بلغاریہ اور رومانیہ کی بحر اسود کی برادریاں جو صرف انیسویں صدی میں عثمانی غلبے کی وجہ سے وجود پذیر ہوئیں اور سوویت یونین کے ''یورپی'' حصے۔ وہ کہتا ہے ''مغربی یورپ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ وسطی یورپ کے لوگوں کو اپنی ثقافتی اور معاشی برادری میں لازماً دوبارہ شامل کرے جہاں سے ان کا واقعتاً تعلق ہے۔ لندن پیرس' روم' میونخ' اور لیپزگ' وارسا' پراگ اور بوڈاپسٹ کے درمیان اتحادوں کو بحال کرے۔ دوسال پہلے پیئر بیر نے تبصرہ کیا کہ ایک نیا خط تقسیم ابھر رہا ہے۔ ایک طرف مغربی عیسائیت (رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ) کی شناخت رکھنے والے یورپ اور دوسری طرف مشرقی

عیسائیت اور اسلامی روایات کی شناخت رکھنے والے یورپ کے درمیان بنیادی طور پر ایک ثقافتی تقسیم۔'' ایک مشہور فن لینڈ کا رہنے والا شخص مساوی پر دیکھتا ہے کہ یورپ میں آہنی پردے کی جگہ ایک اہم تقسیم وقوع پذیر ہوئی ہے جو مغرب اور مشرق کے درمیان قدیم ثقافتی خط تقسیم کے طور پر موجود ہے۔ جو'' سابق آسٹرو ہنگرین سلطنت اور ساتھ ہی پولینڈ اور بالٹک ریاستوں'' کو مغربی یورپ میں اور باقی مشرقی یورپیوں اور بلقان ملکوں کو اس سے باہر رکھتی ہے۔ ایک نمایاں انگریز متفق ہے کہ یہ 'مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے مابین ایک عظیم مذہبی تقسیم تھی' زیادہ واضح طور پر کہا جائے تو یہ براہ راست روم سے یا کیلٹک یا جرمن سے عیسائیت کو حاصل کرنے والے لوگوں اور مشرق اور جنوب مشرقی کانسٹنٹینوپل (بازنطین) سے عیسائیت حاصل کرنے والے لوگوں کے درمیان ہے۔ وسطی یورپ کے لوگ بھی اس تقسیمی خط کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ ملک جنہوں نے کمیونسٹ ورثوں سے جان چھڑانے اور جمہوری ریاست اور مارکیٹ معیشت کی طرف آنے میں اہم پیش رفت کی ہے ان ملکوں سے الگ ہیں جو کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم نیز آرتھوڈوکسی سے الگ نہیں ہوئے ہیں۔ لیتھوینیا کے صدر نے کہا تھا لیتھوانیائیوں کو'' دو تہذیبوں'' میں چناؤ کرنا ہوگا اور'' لاطینی دنیا سے رومن کیتھولک ازم کی طرف آنا ہوگا اور ایسی طرز حکومت منتخب کرنا ہوگی جس کی بنیاد قانون پر ہو۔'' بالکل انہی لفظوں میں پولینڈ کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت سے مغرب کا حصہ ہیں جب دسویں صدی میں انہوں نے بازنطینی کے بجائے لاطینی عیسائیت کو منتخب کیا تھا۔ اس کے برعکس مشرقی یورپی آرتھوڈوکس ملکوں کے لوگ اس ثقافتی خط تقسیم اور بلغاروی اور رومانوی مغرب کا حصہ بننے اور اس کے اداروں سے متصل ہونے کے عظیم فوائد کو دیکھتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی آرتھوڈوکس روایت کو بھی اپنی پہچان بناتے ہیں اور بلغاروی روس اور بازنطین سے اپنے تاریخی طور پر قریبی تعلق کو اہمیت دیتے ہیں۔

یورپ کی مغربی عیسائیت والی شناخت نے مغربی تنظیموں میں نئے اراکین کے داخلے کا ایک واضح خاکہ پیش کر دیا ہے۔ یورپی یونین یورپ میں مغرب کی ابتدائی اکائی ہے اور 1994ء میں ثقافتی حوالے سے مغربی ملکوں آسٹریا' فن لینڈ اور سویڈن کی شمولیت سے ان کی

رکنیت میں دوبارہ توسیع ہوئی۔ 1994ء کے موسم بہار میں یونین نے عبوری طور پر فیصلہ کیا کہ بالٹک ریاستوں کے علاوہ تمام سابق سوویت جمہوریاؤں کی رکنیت ختم کر دی جائے۔ اس نے چار وسطی یورپی ریاستوں (پولینڈ' ہنگری' چیک ری پبلک اور سلوو یکیا) اور دو مشرقی یورپی ریاستوں (رومانیہ اور بلغاریہ) کے ساتھ ''اتحاد کے معاہدوں'' پر بھی دستخط کئے ہیں۔ اکیسویں صدی سے پہلے ان میں سے کسی بھی ریاست کے یورپی یونین کا رکن بننے کے امکانات نہیں ہیں نیز وسطی یورپی ریاستیں بلاشبہ رومانیہ اور بلغاریہ سے پہلے ہی یہ درجہ حاصل کر لیں گی۔ اسی اثنا میں بالٹک ریاستوں اور سلوو ینیا کی رکنیت حتمی دکھائی دیتی ہے جبکہ مسلمان ترکی' بہت ہی چھوٹے مالٹا اور آرتھوڈوکس قبرص کی درخواستیں 1995ء میں بھی تعطل اور التوا میں پڑی تھیں۔ یورپی یونین کی توسیع کیلئے واضح طور پر ان ریاستوں کو ترجیح دی جائے گی جو ثقافتی حوالے سے مغربی ہیں اور معاشی حوالے سے ترقی کا رجحان رکھتی ہیں۔ اگر اس معیار کا اطلاق کیا گیا تو پولینڈ' چیک جمہوریائیں' سلوو یکیا اور ہنگری' بالٹک' جمہوریائیں' سلوو ینیا' کروشیا اور مالٹا یورپی یونین کے رکن بن جائیں گے اور یونین مغربی تہذیب کے متصل وسعت اختیار کر لے گی جیسا کہ وہ یورپ میں تاریخی حوالے سے وجود رکھتی تھی۔

تہذیبوں کی منطق ناٹو کی توسیع کے حوالے سے اسی قسم کے نتیجے کو پیش کرتی ہے۔ سرد جنگ وسطی یورپ میں سوویت سیاسی اور فوجی توسیع سے شروع ہوئی۔ امریکہ اور مغربی یورپی ملکوں نے اس کی تحدید کیلئے ناٹو کو تشکیل دیا۔ مابعد سرد جنگ دنیا میں ناٹو کا ایک مرکزی اور کشش انگیز مقصد ہے یعنی وہ وسطی یورپ میں روسی سیاسی اور فوجی کنٹرول کو دوبارہ نافذ ہونے سے روکے گی۔ ناٹو نے مغرب کی سلامتی کی تنظیم کی حیثیت میں مغربی ملکوں کی طرف سے مناسب طور پر ان ریاستوں کیلئے رکنیت سازی کو کھلا کر دیا جو دفاعی صلاحیت' سیاسی جمہوریت اور فوج پر سول کنٹرول رکھنے جیسی بنیادی شرائط کو پورا کرتی ہیں۔

مابعد سرد جنگ یورپی سلامتی انتظامات کے حوالے سے امریکی پالیسی ابتداء میں آفاقی نوعیت کی تھی جو امن کیلئے باہمی اتفاق میں صورت پذیر ہوئی جو عمومی طور پر یورپیوں کیلئے کھلی تھی اور بہر حال یوریشائی ملکوں کیلئے بھی۔ یہ طرز فکر یورپ میں تنظیم کے سلامتی اور تعاون

کے کردار پر بھی زور دیتا ہے۔ یہ صدر کلنٹن کے ان ریمارکس سے عیاں ہے جو انہوں نے جنوری 1994ء میں دورۂ یورپ کے دوران دیئے: ''آزادی کی حدود کو اب نئے رویے سے متعین کرنا ہوگا نہ کہ پرانی تاریخ سے۔ میں سب سے کہتا ہوں...... جنہوں نے یورپ میں نیا خط کھینچا ہے۔ ہمیں یورپ کے بہتر مستقبل کے امکان کو پیشتر ہی ختم کر لینا چاہئے۔ یعنی ہر کہیں جمہوریت ہو، مارکیٹ اکانومی ہو، ملک باہمی طور پر سلامتی کیلئے تعاون کریں۔ ہمیں لازماً ایک کم تر نتیجے سے بچنا ہوگا۔'' ایک برس بعد انتظامیہ ''پرانی تاریخ کی متعین کردہ سرحدوں'' کو تسلیم کرنے اور کم تر نتیجے کو قبول کرنے لگی کیونکہ اس سے تہذیبی اختلافات کی حقیقتیں منعکس ہوتی تھیں۔ انتظامیہ نے مستعدی سے ناٹو کی توسیع کا معیار اور اوقات نامے کو تیار کیا: پہلے پولینڈ، ہنگری، چیک جمہوریہ اور سلوویکیا پھر سلووینیا اور بعد میں ممکنہ طور پر بالٹک ریاستیں۔

روس ناٹو کی توسیع کا شدید مخالف ہے۔ وہ روسی بھی جو زیادہ لبرل اور مغرب کے حامی ہیں کہتے ہیں کہ یہ توسیع روس میں قوم پرست اور مغرب دشمن سیاسی قوتوں کو بہت زیادہ تقویت دے گی...... ناٹو کی توسیع تاریخی طور پر مغربی عیسائیت کے جز و ملکوں تک محدود ہو تو روس کو اطمینان رہے گا کہ اس میں سربیا، بلغاریہ، رومانیہ، مالدووا، بیلارس اور یوکرائن شامل نہیں ہوں گے۔ ناٹو کی مغربی ریاستوں کی حد تک توسیع سے روس کے ایک علیحدہ آرتھوڈوکس تہذیب کی مرکزی ریاست والے کردار کی جڑیں کٹ جائیں گے۔

تہذیب کے حوالے سے ملکوں کے مابین امتیاز کرنا بالٹک جمہوریاؤں کے معاملے میں فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ یہ صرف سابق سوویت جمہوریائیں ہی ہیں جو تاریخ، ثقافت اور مذہب کے حوالے سے واضح طور پر مغربی ہیں اور ان کا مقدر مغرب کیلئے مستقل طور پر ایک مسئلہ رہا ہے۔ امریکہ نے ان کے سوویت یونین سے الحاق کو کبھی باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا اسی وجہ ہے اس نے سوویت یونین کے منہدم ہوتے ہوئے ان کی آزادی کی تحریک کی مدد کی اور اس امر پر اصرار کیا کہ روس ان جمہوریاؤں سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے کے متفقہ نظام الاوقات کی پابندی کرے۔ روسیوں کیلئے پیغام تھا کہ وہ لازماً تسلیم کر

لیس کہ بالٹک ریاستیں روس کے حلقہ اثر سے باہر ہیں جنہیں وہ سابق سوویت جمہوریاؤں کی طرح قائم کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ سویڈن کے وزیراعظم نے کہا کہ ''کلنٹن انتظامیہ کی یہ کامیابی مغرب کی سلامتی اور استحکام کے حوالے سے ایک انتہائی اہم قدم ہے۔''یورپی یونین اور ناٹو کی توسیع پر بہت زیادہ توجہ دی جارہی ہے تو ان تنظیموں کی ثقافتی تشکیل نو نے ان ممکنہ ارکان کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ ایک غیر مغربی ملک یونان دونوں تنظیموں کا رکن ہے اور دوسرا ملک ترکی ناٹو کا رکن ہے اور یونین کی رکنیت کا امیدوار ہے۔ یہ رشتے سرد جنگ کی پیداوار ہیں۔ کیا یہ مابعد سرد جنگ دنیا کی تہذیب میں کوئی مقام رکھتے ہیں؟ یورپی یونین میں ترکی کی رکنیت ایک مسئلہ ہے اور ناٹو میں اس کی رکنیت کو ویلفیئر پارٹی نے نشانہ بنایا ہے۔ ترکی ویلفیئر پارٹی کی عظیم انتخابی کامیابی کے باوجود ناٹو میں رہتا ہے یا ترکی شعوری طور پر اپنے اتاترک ورثے کو مسترد کرتے ہوئے خود کو اسلام کے ایک لیڈر کے طور پر نمایاں کرتا ہے؟ نہ صرف اس کا تصور کیا جا سکتا ہے اور ترکی کیلئے لائق آرزو بھی ہے بلکہ مستقبل قریب میں متوقع ہے۔ ناٹو میں اس کا جو بھی کردار ہو ترکی' بلقان' عرب دنیا اور وسطی ایشیا کے حوالے سے اپنے امتیازی مفادات کے حصول کی زیادہ کوشش کرے گا۔

یونان مغربی تہذیب کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ کلاسیکی تہذیب کا گھر ہے جو مغربی تہذیب کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔ ترکوں کے برخلاف تاریخی طور پر یونانی خود کو عیسائیت کے علم بردار تصور کرتے ہیں۔ سربوں' رومانیوں اور بلغاریوں کے برعکس ان کی تاریخ مغرب کی تاریخ میں گندھی ہوئی ہے تاہم یونان ایک بے قاعدگی بھی رکھتا ہے' مغربی تنظیموں میں ایک آرتھوڈوکس اجنبی (آؤٹ سائیڈر)' وہ نہ تو کبھی یورپی یونین اور نہ ہی ناٹو کا آسان رکن رہا ہے اور دونوں کے اصول اور ضوابط اپنانے دشوار پاتا رہا ہے۔ **1960**ء کی دہائی کے وسط سے **1970**ء کی دہائی کے وسط تک اس پر ایک فوجی جنتا کی حکمرانی مسلط رہی ہے اور جب تک جمہوریت کی طرف نہیں آیا یورپی کمیونٹی کی رکنیت نہیں پا سکتا تھا۔ اس کے لیڈر اکثر اوقات مغربی اقدار سے اعراض کی راہ پر چلتے ہوئے معلوم پڑے اور مغربی حکومتوں سے بگڑ بگڑ بیٹھے۔ یہ کمیونٹی اور ناٹو کے دوسرے اراکین کے مقابلے میں زیادہ

غریب ہے اور اکثر ایسی معاشی پالیسیاں اپناتا ہے جو بظاہر برسلز میں مسلط معیارات سے پھوٹتی ہیں۔ 1994ء میں یورپی یونین کے کونسل کے صدر کے طور پر اس کا رویہ' دوسرے اراکین اور مغربی یورپی افسران نجی طور پر اس کی رکنیت کو غلطی قرار دیتے ہیں۔

مابعد سرد جنگ دنیا میں مغربی ملکوں سے یونان کی پالیسیاں کافی زیادہ مختلف ہیں۔ اس کے مسیڈونیا کے محاصرے کی مغربی حکومتوں نے شدید مخالفت کی اور نتیجتاً یورپی کمیشن یورپی عدالت انصاف میں یونان کے خلاف فیصلہ حاصل کرنے گیا۔ سابق یوگوسلاویہ میں برپا جھگڑوں کے حوالے سے یونان نے خود کو بڑی یورپی طاقتوں کی پالیسیوں کو اپنانے سے الگ رکھا' سربوں کو بھرپور امداد دی اور ان پر لگائی گئیں اقوام متحدہ کی پابندیوں کو لاپروائی سے توڑ دیا۔ سوویت یونین اور کمیونسٹ خطرے کے اختتام کے بعد یونان' روس کے ساتھ اپنے مشترکہ دشمن کے بجائے مشترکہ مفادات کا حامل ہے۔ اس نے روس کو اجازت دی کہ وہ یونانی قبرص میں بھرپور طریقے سے موجود رہے اور ان کے مشترک مشرقی آرتھوڈوکس مذہب کا نتیجہ ہے کہ یونانی قبرصیوں نے جزیرے میں روسیوں اور سربوں کو خوش آمدید کہا۔ 1995ء میں قبرص میں روسیوں کے ملکیتی دو ہزار کاروبار چل رہے تھے' روسی اور سربی کروشیائی اخبارات وہاں سے شائع ہوتے تھے اور یونانی قبرصی حکومت روس سے بڑی مقدار میں اسلحہ خریدتی تھی۔ اس کے علاوہ یونان نے روس کے ساتھ کاکیشیا اور وسط ایشیا سے تیل کو بحرۂ روم تک لانے کیلئے گفت وشنید کی ہے اور اس معاملے میں ترکی اور دوسرے مسلمان ملکوں کو رد کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر یونان کی خارجہ پالیسی آرتھوڈوکسی پر استوار ہے۔ بلاشبہ یونان' ناٹو اور یورپی یونین کا رسمی رکن رہے گا۔ جیسے جیسے ثقافتی تشکیل نو کا عمل تیز ہوگا یہ رکنیتیں بھی بلاشبہ زیادہ کم بامعنی اور شریک پارٹیوں کیلئے زیادہ مشکل ہوں گی۔ سوویت یونین کا سرد جنگ کا دشمن روس کا مابعد سرد جنگ اتحادی بن رہا ہے۔

روس اور اس کے قریبی ہمسائے

زار اور کمیونسٹ سلطنتوں کا جانشین ایک تہذیبی بلاک ہے جو کئی حوالے سے یورپ میں مغرب کا مدمقابل روس' فرانس اور جرمنی کے ہم پلہ و مساوی ہوتے ہوئے مرکز میں

ایک داخلی دائرے سے جڑا ہوا ہے جس میں شامل ہیں دو سلاوک آرتھوڈوکس جمہوریائیں بیلا روس اور ملادوویا' قازقستان جس کی آبادی کا چالیس فیصد روسی ہے اور آرمیدیا جو تاریخی حوالے سے روس کا اتحادی ہے۔ 1990ء کی دہائی میں ان سارے ملکوں کی حکومتیں روس حامی تھیں جو کہ عمومی طور پر انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آئی تھیں۔ روس اور جارجیا (جو بھرپور طور پر آرتھوڈوکس ہے) اور یوکرائن (جس کی اکثریت آرتھوڈوکس ہے) میں قریبی لیکن تناؤ زدہ تعلقات موجود ہیں تاہم دونوں قومی تشخص اور ماضی کی آزادی کے مضبوط احساسات رکھتے ہیں۔ آرتھوڈوکس بلقان کے اندر روس کے بلغاریہ' یونان' سربیا اور قبرص کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ سابق سوویت یونین کی مسلمان جمہوریائیں معیشت اور سلامتی کے شعبوں میں روس پر مکمل طور پر انحصار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس بالٹک جمہوریائیں یورپ کی کشش کے زیر اثر روسی دائرۂ اثر سے خود کو نکال چکی ہیں۔

مجموعی طور پر روس اپنی لیڈر شپ میں ایک آرتھوڈوکس بلاک تخلیق کر رہا ہے جس کے اردگرد نسبتاً کمزور اسلامی ریاستوں کا بفر ہو جن پر مختلف درجوں میں اس کا غلبہ ہو اور جن میں سے وہ دوسری طاقتوں کے اثر کو خارج کرنے کی کوشش کرے گا۔ روس کی یہ توقع بھی ہے کہ دنیا اس نظام کو قبول کر لے گی۔ جیسا کہ یلسن نے فروری 1993ء میں کہا کہ خارجی حکومتوں اور بین الاقوامی تنظیموں کیلئے ضروری ہے کہ وہ ''روس کو سابق سوویت یونین کے علاقے میں امن اور استحکام کے ضامن کے طور پر خصوصی قوتیں سونپ دیں۔'' جبکہ سوویت یونین عالمی مفادات رکھنے والی سپر پاور رہا ہے۔ روس ایک ایسی بڑی طاقت ہے جس کے علاقائی اور تہذیبی مفادات ہیں۔

سابق سوویت یونین کے آرتھوڈوکس ممالک یوریشین اور عالمی معاملوں میں ایک مربوط روسی بلاک کی تشکیل میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے عمل کے دوران میں یہ پانچوں ملک ابتداء میں تو ایک انتہائی قوم پرستانہ سمت میں گامزن تھے جس میں انہوں نے اپنی نئی آزادی اور ماسکو سے دوری پر زور دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی' جیو پولیٹیکل اور ثقافتی حقائق کی رہنمائی میں ان میں سے چار ملکوں کے ووٹروں نے

روس کی حامی حکومتیں منتخب کیں اور روس کی حامی پالیسیوں کی طرف واپسی کو چنا۔ ان چاروں ملکوں کے عوام امداد اور تحفظ کیلئے روس کی طرف دیکھتے ہیں۔ پانچویں ملک جارجیا میں روسی فوج کی مداخلت نے طرز حکومت میں اسی طرح کی تبدیلی جبراً پیدا کر دی ہے۔

امریکہ کے برعکس بیلاروس میں قومی تشخص کا احساس کم ہے اس کا بہت زیادہ انحصار روسی امداد پر ہے۔ اس کے عوام کی اکثریت خود کو اپنے ملک سے زیادہ روس سے شناخت کروانا پسند کرتی ہے۔ جنوری 1994ء میں ووٹروں نے مرکزیت پسندوں اور معتدل قوم پرستوں کو جو کہ ایک روایت پسند روس حامی ریاست کے سربراہ تھے تبدیل کر دیا۔ جولائی 1994ء میں ووٹروں نے ولادی میر زرینوفسکی کے ایک اتحادی انتہا پسند روس حامی کو صدر چن لیا۔ بیلا روس آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کا ابتدائی رکن' 1993ء میں روس اور یوکرائن کے ساتھ بننے والے معاشی اتحاد کا چارٹر رکن تھا' اپنے ایٹمی ہتھیار روس کے حوالے کر کے اس کے ساتھ زری اتحاد (مانیٹری یونین) بنانے پر راضی تھا اور اپنی سرزمین پر بقیہ صدی کیلئے روسی فوجوں کے قیام پر بھی رضامند تھا۔ 1995ء میں نام کے سوا باقی تمام تر روس کا ایک حصہ تھا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد مالدووا کے آزاد ہونے سے بہت سے لوگ اس کے رومانیہ کے ساتھ دوبارہ اتحاد کے منتظر ہیں۔ اس کے وقوع پذیر ہونے کے خوف نے روس حامی مشرق میں تسلسل پسندوں کو تحریک دلائی جنہیں ماسکو کی بھرپور امداد حاصل ہے اور روس کی 14 ویں فوج عملی مدد فراہم کر رہی ہے جس کے نتیجے میں ٹرانس ٹائسٹرری پبلک قائم ہو گی۔ تاہم مالدووا کے رومانیہ کے ساتھ اتحاد کے جذبات دونوں ملکوں کے معاشی مسائل اور روس کے معاشی دباؤ کی وجہ سے گھٹ کر رہ گئے۔ مالدووا نے آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ (CIS) میں شمولیت اختیار کر لی اور روس کے ساتھ تجارت شروع کر دی۔ فروری 1994ء میں پارلیمانی انتخابات میں روس کی حامی جماعتیں بھرپور اکثریت سے کامیاب ہوئیں۔ ان تینوں ریاستوں میں سٹریٹیجک اور معاشی مفادات کے زیر اثر عوامی رائے نے ایسی حکومتوں کو منتخب کیا جو روس کے ساتھ قریبی اتحاد کی حامی ہیں۔ بالکل ایسا ہی طرز عمل یوکرائن میں ابھرا

ہے۔ جارجیا میں واقعات کی رفتار اور راہ مختلف تھی۔ 1801ء تک جارجیا آزاد ملک تھا تب اس کے بادشاہ جارج XIII نے ترکوں کے خلاف روس سے امداد طلب کی۔ 1918-1921ء...... روس میں انقلاب کے تین سال بعد تک جارجیا آزاد رہا لیکن بالشویکوں نے زبردستی اسے سوویت یونین کا حصہ بنالیا جب سوویت یونین ختم ہوا تو جارجیا نے دوبارہ آزادی کا اعلان کر دیا۔ ایک قوم پرست اتحاد نے انتخابات جیتے تاہم اس کا لیڈر خود کو تباہ کرنے والے جبر میں ملوث ہوا اور آخر کار تشدد کے ذریعے اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ ایڈورڈ اے شورد ناتزے جو کہ سوویت یونین کا وزیر خارجہ رہا تھا ملک کی لیڈری کیلئے واپس آیا اور 1992ء سے 1995ء کے صدارتی انتخابات میں اقتدار میں آ گیا۔ تاہم اس کو ابخازیا میں علیحدگی پسند تحریک سے نمٹنا پڑا جس کو ٹھوس روسی امداد حاصل ہو رہی تھی۔ اسے گمسا خوردیا کی رہنمائی میں ہونے والی بغاوت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ شاہ جارج کی ہمسری کرتے ہوئے اس نے کہا "ہمارے پاس کوئی عظیم انتخاب نہیں ہے" اور امداد کے لیے واپس روس کا رخ کر لیا۔ روس نے جارجیا کی سی آئی ایس میں شمولیت کی قیمت پر اس کی حمایت کے لیے مداخلت کی۔ 1994ء میں جارجیا روس کے تین فوجی ٹھکانے لامحدود مدت تک اپنے ہاں قائم رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ روسی فوجی مداخلت نے پہلے تو جارجیا کی حکومت کو کمزور کیا اور پھر آزاد ذہن جارجیا کو روسی کیمپ میں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔

روس کے علاوہ سابق سوویت یونین کی سب سے زیادہ آبادی والی جمہوریہ یوکرائن ہے۔ تاریخ میں مختلف اوقات میں یوکرائن آزاد رہا ہے۔ تاہم جدید دور میں زیادہ تر وہ ماسکو کے زیر حکومت سیاسی اکائی کا ایک حصہ رہا ہے۔ فیصلہ کن واقعہ 1654ء میں رونما ہوا جب بوڈن خمیلنٹیسکی نے جو پولش حکمرانی کے خلاف تحریک کا کوزاک لیڈر تھا' زار سے پولشوں کے خلاف مدد کے جواب میں اطاعت کا معاہدہ کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر 1991ء تک یوکرائن ماسکو کے سیاسی کنٹرول میں رہا۔ فقط 1917ء سے 1920ء کے دوران میں ایک محدود آزاد جمہوریہ رہا۔ تاہم دو تقاضوں میں منقسم ملک ہے۔ مغرب اور آرتھوڈوکسی کے درمیان تہذیبی تقسیمی خط اس کے قلب سے گزرتا ہے اور صدیوں سے موجود ہے۔ ماضی میں

یوکرائن' پولینڈ' لتھوانیا اور آسٹرو ہنگرین سلطنت کا حصہ تھا۔ اس کی آبادی کا بڑا حصہ یونیئیٹ چرچ سے وابستہ ہے جو آرتھوڈوکس رسوم کی پیروی کرتا ہے تاہم پوپ کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ تاریخی طور پر مغربی یوکرائنی لوگ یوکرائنی زبان بولتے ہیں اور اپنی وضع قطع کے اعتبار سے مضبوط قوم پرست ہیں۔ مشرقی یوکرائن کے لوگ' اس کے برعکس زبردست آرتھوڈوکس ہیں اور روسی زبان بولتے ہیں۔ 1990ء کی دہائی کی ابتداء میں یوکرائنی آبادی کا 22 فیصد غیر روسی اور 31 فیصد روسی بولنے والے مقامیوں پر مشتمل تھا۔ سکول کے طلباء کی اکثریت کو روسی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ کرائمیا روسی ہے اور 1954ء تک روسی فیڈریشن کا حصہ تھا جب خروشیف نے اسے یوکرائن کو سونپ دیا تھا۔

مشرقی اور مغربی یوکرائن کے اختلافات ان کے لوگوں کے رجحانات سے نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً 1992ء کے آخر میں مغربی یوکرائن کے روسیوں کی ایک تہائی نے بمقابلہ کیف کے صرف 10 فیصد کہا کہ وہ روس مخالف عداوت کا نشانہ بنے مشرق مغرب کی تقسیم ڈرامائی طور پر 1994ء کے صدارتی انتخابات میں ظاہر ہوئی۔ لیونائیڈ کراوچک نے جو روسی لیڈروں کے ساتھ کام کر چکا ہے خود کو ایک قوم پرست کے طور پر ظاہر کیا اور مغربی یوکرائن کے تیرہ صوبوں میں 90 فیصد کی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اس کے مخالف لیونائیڈ کچما نے جس نے مہم کے دوران یوکرائنی تقریروں کے لیکچر لئے۔ تیرہ مشرقی صوبوں میں اکثریت حاصل کی۔ کچما نے 52 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ 1994ء میں یوکرائنیوں کی ایک اکثریت نے 1654ء کے خمیلنٹسکی کے فیصلے کی تصدیق کر دی۔ جیسا کہ ایک امریکی ماہر نے تبصرہ کیا کہ انتخابات نے ''مغربی یوکرائن کے یورپ زدہ سلاووں اور روس سے متاثرہ سلاووں کے درمیان تقسیم کو نہ صرف منعکس کیا بلکہ واضح تر کر دیا ہے۔ یہ نسلی سے زیادہ ثقافتی تقسیم ہے۔''

اس تقسیم کے نتیجے میں یوکرائن اور روس کے مابین رشتے تین طرح سے فروغ پا سکتے تھے۔ 1990ء کے شروع میں نیوکلیئر ہتھیاروں' کرائمیا' یوکرائن میں روس کے حقوق' بحیرہ اسود کے بیڑوں اور معاشی رشتوں کے حوالے سے دونوں ملکوں میں اہم مسئلے موجود تھے۔

1994ء میں روسی جھکاؤ رکھنے والے صدر کے انتخاب سے دونوں ملکوں کے درمیان کشمکش کم ہونے کا امکان پیدا ہو گیا جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سابق سوویت یونین میں کئی جگہ سخت لڑائی ہوئی اور شدید تناؤ اور کچھ لڑائی ہوئی۔ روسیوں اور بالٹک لوگوں کے درمیان جبکہ 1995ء میں روسی اور یوکرائنیوں میں کوئی تشدد رونما نہیں ہوا۔

ایک دوسرا اور زیادہ یقینی امکان یہ ہے کہ یوکرائن تقسیمی خط کے ساتھ ساتھ دو اکائیوں میں بٹ جائے جس کے نتیجے میں مشرقی حصہ روس میں ضم ہو جائے۔ علیحدگی کا مسئلہ سب سے پہلے کرائمیا کے حوالے سے پیدا ہوا تھا۔ کرائمیائی جمہوریہ نے جس کی آبادی کا 70 فیصد روسیوں پر مشتمل ہے دسمبر 1991ء کے ریفرنڈم میں یوکرائن کی سوویت یونین سے آزادی کی ٹھوس حمایت کی تھی۔ مئی 1990ء میں کرائمیائی پارلیمنٹ نے یوکرائن سے آزادی کیلئے ووٹ دیا اور پھر یوکرائنی دباؤ کے تحت اس ووٹ کو کالعدم کر دیا تاہم روسی پارلیمنٹ نے کرائمیا کے یوکرائن سے 1954ء کا الحاق کینسل کر دیا۔ جنوری 1994ء میں کرائمیائیوں نے ایسے صدر کو چنا جس نے "روس سے اتحاد" کا نعرہ لگایا تھا۔ اس سے کچھ لوگوں کو یہ سوال کرنے کی تحریک ملی کہ "کیا کرائمیا اگلا نگورنو کاراباخ یا ابخازیا ہوگا؟" اس کا پرزور جواب تھا "نہیں!" مئی 1994ء میں صورتحال دوبارہ خراب ہو گئی جب کرائمین پارلیمنٹ نے 1992ء کے آئین کو بحال کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ آئین اسے یوکرائن سے حقیقتاً آزادی عطا کرتا ہے۔ تاہم روسی اور یوکرائنی لیڈروں کی وجہ سے یہ مسئلہ پرتشدد ہونے سے محفوظ رہا اور دو ماہ بعد روس نواز کچما کے یوکرائن کا صدر بن جانے سے کرائمیا کی تحریک علیحدگی کی جڑیں کٹ گئیں۔

تاہم ان انتخابات نے ملک کے مغربی حصے میں یوکرائن سے علیحدگی کے امکان کو ابھارا ضرور ہے جو کہ روس سے نزدیک تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ روسی اس امر کو خوش آمدید کہیں گے۔ جیسا کہ ایک روسی جنرل نے کہا کہ 'یوکرائن بلکہ مشرقی یوکرائن پانچ' دس یا پندرہ برسوں میں واپس آ جائے گا اور مغرب اسے اس یوکرائن صرف مغرب کی امداد کے سہارے پنپ سکے گا۔' ایسی امداد اسی وقت ممکن ہے جب مغرب اور روس کے تعلقات اس

حد تک کشیدہ ہو جائیں جتنے کے سرد جنگ کہ دوران میں ہوا کرتے تھے۔

تیسرا اور زیادہ ممکنہ منظر نامہ یہ ہے کہ یوکرائن متحد رہے گا' منقسم رہے گا' آزاد رہے گا اور روس کے ساتھ عمومی طور پر قریبی تعاون کرے گا۔ جب ایک مرتبہ نیوکلیئر ہتھیاروں اور فوجوں کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل حل ہو گئے تو پھر طویل المیعاد مسائل معاشی ہوں گے۔ جیسا کہ جان موریسن نے واضح کیا ہے کہ روس یوکرائن تعلقات مشرقی یورپ کیلئے ویسے ہی ہیں جیسے کہ مغربی یورپ کیلئے فرانس جرمنی تعلقات تھے۔ موخرالذکر یورپی یونین کا مرکز ہے اور اول الذکر آرتھوڈوکس دنیا میں اتحاد کا مرکز ہے۔

عظیم چین اور اس کا حلقہ خوشحالی

چین تاریخی حوالے سے خود کو ایک ''عظیم سلطنت'' تصور کرتا ہے جس میں کوریا' ویتنام' جزیرہ لیوچیو اور بعض اوقات جاپان شامل ہیں۔ ایک ''اندرونی ایشیائی علاقہ (زون)'' جس میں غیر چینی مانچو' منگول' اویغور' ترک اور تبتی شامل ہیں جنہیں سلامتی کے خدشات کے تحت کنٹرول کیا جاتا ہے اور پھر آتا ہے ایک ''خارجی علاقہ (زون)'' معاصر چینی تہذیب اس انداز سے تشکیل پذیر ہوئی ہے۔ مرکز ہان چین' سرحدی صوبے جو کہ چین کا حصہ ہیں لیکن قابل لحاظ خودمختاری کے حامل ہیں؟ وہ صوبے جو قانونی طور پر تو چین کا حصہ ہیں لیکن ان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ دوسری غیر چینی تہذیبوں (تبت' زن جیانگ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ چینی معاشرے جو یا تو بیجنگ مرکز چین کا حصہ ہوں گے یا ہونے کو ہیں (ہانگ کانگ' تائیوان) ایک ...... چینی ریاست بیجنگ کی طرف زیادہ جھکاؤ ظاہر کر رہی ہے (سنگاپور' تھائی لینڈ' ویتنام' ملائیشیا' انڈونیشیا اور فلپائن میں موجود انتہائی پراثر چینی آبادی اور غیر چینی معاشرے (شمالی اور جنوبی کوریا' ویتنام) جو کہ چین کی کنفیوشسی ثقافت میں حصہ دار ہیں۔

1950ء کی دہائی میں چین نے روس کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا تھا پھر چین روس اختلاف کے بعد وہ خود کو دونوں سپر پاوروں کے خلاف تیسری دنیا کا لیڈر تصور کرنے لگا جس کی وجہ سے اسے کچھ نقصان اور چند فوائد ہوئے۔ نکسن انتظامیہ کے تحت امریکی پالیسی

میں تبدیلی کے بعد چین دونوں سپر پاوروں کے توازن قوت کے کھیل میں تیسری پارٹی کا کردار مانگنے لگا۔ 1970ء کی دہائی کے دوران میں جب امریکہ کمزور دکھائی دینے لگا تو وہ اس کا دوست بن گیا اور 1980ء کی دہائی میں برابر کے فاصلے والی حالت میں چلا گیا۔ جب امریکی فوجی قوت بڑھی اور سوویت یونین معاشی طور پر زوال پذیر ہوا اور افغانستان میں شکست سے دوچار ہوا تاہم سپر پاور مقابلے کے اختتام کے ساتھ ہی ''چین کارڈ'' اپنی ساری کی ساری قدر و قیمت کھو بیٹھا اور چین دنیا کے معاملوں میں اپنی حیثیت کو دوبارہ متعین کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے دو ہدف طے کئے ہیں: چین ثقافت کا چیمپئن بننا' ایسی مرکزی ریاست بننا جو دوسری تمام چینی برادریوں کیلئے ایک تہذیبی مقناطیس ثابت ہو نیز اپنی تاریخی حیثیت کی بحالی جو اس نے انیسویں صدی میں گنوادی تھی یعنی مشرقی ایشیا میں قوت بننا۔

چین کے یہ ابھرتے ہوئے کردار دیکھے جا سکتے ہیں: اول اس طریقے میں جس کے ذریعے چین دنیا کے معاملوں میں اپنی حیثیت بیان کرتا ہے۔ دوم' سمندر پار چینیوں کا چین کے اندر معاشی حوالے سے بہت زیادہ حصہ لینا اور سوم' دوسری تین بڑی چینی اکائیوں ہانگ کانگ' تائیوان اور سنگاپور کے چین کے ساتھ معاشی' سیاسی اور سفارتی تعلقات میں اضافہ۔ اس کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کا چین کی طرف بڑھتا ہوا جھکاؤ جن میں چینی خاص سیاسی اثر رکھتے ہیں۔

چینی حکومت چینی سرزمین کو چینی تہذیب کی مرکزی ریاست کے طور پر دیکھتی ہے جس کی طرف دوسری چینی برادریوں کو جھکاؤ رکھنا چاہئے۔ چینی حکومت طویل عرصے تک دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیوں کے ذریعے اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور خود کو چینیت کے عالم گیر نمائندہ کی حیثیت دلوانے کی خواہشمند رہی۔ چینی حکومت کیلئے چینی نسل کے لوگ' خواہ کسی دوسرے ملک کے شہری ہی کیوں نہ ہوں' چینی برادری کے رکن ہیں لہٰذا چینی حکومت کے زیر اقتدار ہیں۔ چینی شناخت کا تعین نسلی اصطلاح میں کیا جاتا ہے۔ چینی وہ ہیں جو ایک ہی ''نسل' خون اور ثقافت'' سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ بات عوامی جمہوریہ چین کے ایک دانشور (سکالر) نے کہی۔ 1990ء کی دہائی کے دوران میں یہ نظریہ چینی حکومت اور

نجی چینی ذریعوں سے بہت زیادہ پھیلایا گیا۔ چینیوں اور غیر چینی معاشروں میں رہنے والے چینی نسل کے لوگوں کیلئے ''آئینہ ٹیسٹ'' شناخت کا ٹیسٹ بن چکا ہے۔ ''جاؤ آئینہ دیکھو'' بیجنگ نہاد چینیوں کی ان چینی نسل کے لوگوں کیلئے تنبیہہ ہے جو غیر ملکی معاشروں میں جذب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔...... ہوارن (Huaren) یا چینی الاصل لوگ جوژونگوورن (Zhongguoren) یا چینی ریاست کے لوگوں سے مختلف ہیں اپنی گونشی (Gonshi) یا عمومی آگہی کے اظہار کیلئے ''ثقافتی چین'' کے تصور کو پیش کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مغرب کی طرف سے متعدد حملوں کی وجہ سے چینی شناخت اب چینی ثقافت کے رواں عناصر کے حوالے سے نئے سرے سے تشکیل دی جا رہی ہے۔

تاریخی حوالے سے یہ شناخت چینی ریاست کی مرکزی حکومتوں کے بدلتے ہوئے رشتوں کے ساتھ موازنہ کی گئی ہے۔ یہ ثقافتی شناخت کا شعور بہت سے چینیوں کے درمیان وسیع ہوتے ہوئے معاشی رشتوں سے اور نئے سرے سے تشکیل پذیر ہوا ہے جس کے نتیجے میں چینی سرزمین پر تیز رفتار معاشی ترقی رونما ہوئی ہے جس کی وجہ سے چینی ثقافتی شناخت کے تصور کو مادی اور نفسیاتی حوالے سے بڑھاوا ملا ہے۔

لہٰذا ''عظیم چین'' صرف ایک مجرد تصور ہی نہیں ہے۔ یہ ایک فروغ پاتی ہوئی ثقافتی اور معاشی حقیقت ہے اور ایک سیاسی حقیقت میں ڈھلنا بھی شروع ہو گئی ہے۔ 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں چینی درج ذیل مقامات پر ڈرامائی معاشی ترقی کے ذمے دار ہیں: چینی سرزمین' ٹائیگرز میں (جن میں تین چینی ہیں) اور جنوب مشرقی ایشیا۔ مشرقی ایشیا کی معیشت چین مرکز (China Centred) ہے اور چین کے غلبے تلے ہے۔ ہانگ کانگ' تائیوان اور سنگاپور کے چینی 1990ء کی دہائی میں چینی سرزمین کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ رکھتے ہیں۔ سمندر پار چینی جو جنوب مشرقی ایشیا میں رہتے ہیں اپنے اپنے ملکوں کی معیشتوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں چینی فلپائن کی آبادی کا ایک فیصد تھے لیکن مقامی ملکیہ فرموں کی فروخت (Sales) میں ان کا حصہ 35 فیصد تھا۔ انڈونیشیا میں 1980ء کی ۔ہائی کے وسط میں چینی اس کی آبادی کا 3.2 فیصد تھے لیکن نجی مقامی

سرمائے کے ستر فیصد کے مالک تھے۔ سب سے بڑے کاروباروں میں سے سترہ کے مالک چینی تھے اور ایک چینی کمپنی انڈونیشیا کی خام قومی پیداوار (GNP) میں 5 فیصد کی حصہ دار تھی۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں چینی تھائی لینڈ کی آبادی کا دس فیصد تھے لیکن دس سب سے بڑے کاروباری گروپوں میں سے نو کے مالک تھے اور اس کی خام قومی پیداوار (GNP) میں پچاس فیصد کے حصہ دار تھے۔ چینی ملائیشیا کی آبادی کا ایک تہائی ہیں لیکن معیشت پر قریباً مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں۔ جاپان اور کوریا سے ہٹ کر مشرقی ایشیا کی معیشت بنیادی طور پر ایک چینی معیشت ہے۔

عظیم چین مشترکہ خوشحالی کی فضا کے پیدا ہونے میں خاندان اور ذاتی رشتہ داریوں کے ''بانس کے جال'' اور مشترکہ ثقافت نے عظیم کردار ادا کیا ہے۔ سمندر پار چینی مغرب کے لوگوں اور جاپانیوں کی نسبت چین کے اندر کاروبار کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔ چین کے اندر بھروسہ اور اعتماد ذاتی تعلقات پر منحصر ہوتا ہے' معاہدوں یا قوانین اور دوسری قانونی دستاویزات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مغرب کے کاروباری افراد چین کی نسبت بھارت میں کاروبار آسانی سے کر سکتے ہیں کیونکہ چین میں کسی معاہدے کا انحصار فریقوں کے ذاتی تعلقات پر ہوتا ہے۔ ایک بڑے جاپانی مبصر نے 1993ء میں حسد کے ساتھ کہا تھا کہ چین کو فائدہ ہوا ہے ''ہانگ کانگ' تائیوان اور جنوب مشرقی ایشیا میں سرحدوں سے بالاتر چینی تاجروں کے نیٹ ورک کا۔'' ایک امریکی کاروباری کی رائے ہے کہ سمندر پار چینی ''کاروباری مہارت کے حامل ہیں' ایک ہی زبان بولتے ہیں اور معاہدوں کیلئے فائدہ مند ایک مشترکہ خاندانی بانس کے جال کا حصہ ہیں۔ کسی ایسے شخص کیلئے جس نے ایکرون یا فلاڈیلفیا میں کسی بورڈ کے سامنے واپس آ کر اطلاع دینی ہو اس میں ایک بہت بڑا فائدہ موجود ہے۔'' لی کوان یو نے چین سے باہر موجود چینیوں کو جو چینی سرزمین پر کاروبار کرتے ہیں' حاصل فوائد کے حوالے سے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے ''ہم نسلی چینی ہیں۔ ہم مشترک نسل اور ثقافت کے حوالے سے مخصوص اوصاف کے حامل ہیں...... لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ فطری پر اپنائیت محسوس ہوتی ہے جو انہی جیسے جسمانی خدوخال کے حامل ہوتے ہیں۔ قربت

کا یہ احساس اس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ ایک ثقافت اور زبان کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ اعتماد اور بھروسے کا ضامن ہوتا ہے جو کہ تمام کاروباری رشتوں کی بنیاد ہوا کرتا ہے۔''
1980ء اور 1990ء کی دہائی میں سمندر پار نسلی چینی اس قابل تھے کہ ''ایک شہد کے چھتے جیسی دنیا میں ایک ہی ثقافت اور زبان کے ذریعے کوانگ زی تعلقات ظاہر کر سکیں جس سے قوانین اور ضوابط میں شفافیت (ٹرانسپیرنسی) کی کمی کو دور کیا جا سکے۔'' معاشی ترقی کی جڑیں ایک مشترکہ ثقافت میں ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت نومبر 1993ء میں ہانگ کانگ میں منعقد ہونے والی چینی کاروباریوں کی دوسری عالمی کانفرنس میں واضح ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کو ''چینی فتح مندی کی تقریب کا نام دیا گیا تھا جس میں ساری دنیا سے چینی کاروباری افراد نے شرکت کی۔'' دنیا میں جہاں کہیں ''ثقافتی اشتراک ہے وہیں معاشی ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

تیان آن من (Tiananmen) چوک کے بعد چین میں مغربی معاشی حصہ داری میں کمی کے بعد' اس کے علاوہ چینی معیشت میں تیز رفتار ترقی کی ایک دہائی کے بعد' سمندر پار چینیوں کیلئے ایک موقع اور محرک پیدا ہوا کہ وہ مشترک ثقافت اور ذاتی تعلقات کی بنیادوں پر چین کے اندر بھاری سرمایہ کاری کریں۔ اس کے نتیجے میں چینی برادریوں کے درمیان معاشی معاہدوں میں ڈرامائی نوعیت کی توسیع واقع ہوئی۔ 1992ء میں چین میں براہ راست بیرونی سرمایہ کاری (11.3 بلین امریکی ڈالر) کا اسی فیصد سمندر پار چینیوں کی طرف سے آیا جس میں بنیادی طور پر ہانگ کانگ میں (68.3 فیصد) تھا تاہم تائیوان میں (9.3 فیصد) تھا' سنگاپور' مکاؤ اور دیگر علاقے شامل تھے۔ اس کے برعکس کل سرمایہ کاری میں جاپان کا حصہ 6.6 فیصد اور امریکہ کا 4.6 فیصد تھا۔ 50 بلین ڈالر کی غیر ملکی سرمایہ کاری میں سے 67 فیصد چینی ذریعوں سے آئی۔ تجارت میں ترقی بھی اسی طرح حیرت ناک انداز میں ہوئی۔ 1986ء میں تائیوان کی چین کیلئے برآمدات صفر تھیں جو 1992ء میں تائیوان کی کل برآمدات کا آٹھ فیصد ہو گئیں اور اس سال 35 فیصد کی شرح سے بڑھیں۔ 1992ء میں سنگاپور کی چین کیلئے برآمدات اس کی کل برآمدات میں کل اضافے (دو فیصد) کے

مقابلے میں 22 فیصد بڑھیں۔ جیسا کہ مرے وائڈن بام نے 1993ء میں تبصرہ کیا "علاقے میں جاپان کے حالیہ غلبے کے باوجود ایشیا کی چین اساس معیشت' صنعت' تجارت اور سرمایہ کاری کیلئے ایک نئے مرکز کے طور پر ابھری ہے۔ اس سٹریٹیجک علاقے میں ٹھوس ٹیکنالوجی اور مینوفیکچرنگ کی صلاحیت بہت زیادہ ہے (تائیوان)' غیر معمولی کاروباری' مارکیٹنگ اور خدمات (سروسز) کی فراست (ہانگ کانگ)' ایک عمدہ مواصلاتی (کمیونیکیشن) نیٹ ورک (سنگاپور)' ایک حیران کن مالی ذخیرہ (پول) (تمام تین) نیز زمین' وسائل اور محنت کی بہت وسیع عطائے قدرت (چینی سرزمین) اس کے علاوہ چینی سرزمین ایک سب سے زیادہ وسیع ہوتی ہوئی مارکیٹ ہے اور 1990ء کی دہائی کے وسط میں چین میں سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا جو کہ فروخت (سیلز) اساس تھیں ساتھ ہی اس سے برآمدات بھی ہوئیں۔

جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں میں رہنے والے چینی مقامی آبادیوں کے ساتھ مختلف درجوں میں ہم آہنگ اور جذب ہو چکے ہیں۔ جبکہ مقامی لوگوں میں چینیوں کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں جو کہ بعض اوقات پرتشدد کارروائیوں میں ڈھل جاتے ہیں جیسا کہ 1994ء کے اپریل میں انڈونیشیا کے میڈان فسادات میں رونما ہوا۔ کچھ ملائیشیائی اور انڈونیشیائی اس بات پر تنقید کرتے ہیں کہ چینی لوگ چینی سرزمین میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں جس سے "سرمائے کا فرار" (Capital Flow) ہو رہا ہے اور سیاسی لیڈر جن کی قیادت صدر سوہارتو کر رہے ہیں اپنے عوام کو یقین دلوا رہے ہیں کہ اس سے ان کی معیشتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے چینی اصرار کرتے ہیں کہ ان کی وفاداریاں ان کے پیدائشی ملک کے ساتھ ہیں نہ کہ ان کے آباؤ اجداد کے ملک کے ساتھ۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں جنوب مشرقی ایشیا سے چین کی طرف چینی سرمائے کے بہاؤ کا تقابل فلپائن' ملائیشیا اور ویتنام میں بھاری تائیوانی سرمایہ کاری سے کیا جا سکتا تھا۔

بڑھتی ہوئی معاشی قوت اور مشترکہ چینی ثقافت کی وجہ سے ہانگ کانگ' تائیوان اور سنگاپور چینی سرزمین کے ساتھ اپنے رشتے مضبوط کر رہے ہیں۔ ہانگ کانگ کے چینی خود کو

طاقت کی تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے لندن کے مقابلے میں بیجنگ کی حکمرانی کو قبول کر رہے ہیں۔ کاروباری افراد اور دوسرے لیڈر چین پر تنقید کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں یا ایسے کام کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں جو چین کے خلاف ہوں۔ اگر انہوں نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو چینی حکومت بھرپور جواب دینے میں دیر نہیں کرے گی۔ 1994ء میں سینکڑوں کاروباری افراد بیجنگ سے تعاون کر رہے تھے اور ایک شیڈو حکومت کیلئے ''ہانگ کانگ میٹرز'' کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز میں ہانگ کانگ میں چینی معاشی اثر ڈرامائی انداز میں بڑھ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چین کی سرمایہ کاری جاپان اور امریکہ ہر دو کی مجموعی سرمایہ کاری سے بھی زیادہ ہوگئی۔ 1990ء کی دہائی کے وسط سے ہانگ کانگ اور چینی سرزمین کا معاشی اتحاد و ارتباط پوری طرح رونما ہو چکا تھا جبکہ سیاسی اتحاد 1997ء میں ہوا۔

تائیوان کے چین کے ساتھ بڑھتے ہوئے معاہدات ہانگ کانگ سے ہونے والے معاہدوں سے پیچھے تھے تاہم 1980ء کی دہائی میں اہم تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں کیونکہ 1941ء کے بعد تین دہائیوں تک دونوں چینیوں نے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ دونوں کے درمیان کوئی کمیونی کیشن نہیں تھا اور حقیقت میں ایک حالت جنگ میں تھے اور وقتاً فوقتاً گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ تاہم ڈینگ ژیاؤ پنگ نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد معاشی اصلاح کا عمل شروع کیا اور چین نے صلح کے اقدامات کا آغاز کیا۔ 1981ء میں تائیوان کی حکومت نے اس کا جواب دیا اور اپنی ''تین انکار'' کی پالیسی میں تبدیلی کی یعنی چین سے رابطہ نہیں، مذاکرات نہیں، مصالحت نہیں۔ مئی 1986ء میں دونوں فریقوں کے نمائندوں کے مابین مذاکرات پہلی مرتبہ اس وقت ہوئے جب ری پبلک آف چائنا سے اغوا کیا جانے والا ایک جہاز چین نے واپس کیا اور اسی سال ری پبلک آف چائنا (ROC) نے چین کی طرف سفر پر پابندی اٹھالی۔

''مشترکہ حیثیت'' کی بنیاد پر تائیوان اور چین کے درمیان معاشی رشتے تیزی سے وسعت پا رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں باہمی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ جیسا کہ تائیوان

کے مرکزی مذاکرات کار نے تبصرہ کیا کہ چین اور تائیون کے لوگ ''خون پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے کی قسم کا جذبہ'' رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو فضیلت دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ 1993ء میں 4.2 ملین تائیوانی افراد نے چین کی سیاحت کی اور 40000 چینیوں نے تائیوان کا سفر کیا۔ روزانہ 40000 خطوط اور 13000 فون کالز کا تبادلہ ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دونوں چینیوں کے درمیان تجارت 1993ء میں 14.4 بلین ڈالر تک پہنچ گئی اور بیس ہزار تائیوان کے کاروباریوں نے 15 سے 30 بلین ڈالر کے درمیان چین میں سرمایہ کاری کی۔ تائیوان چین میں زیادہ توجہ مرکوز کر رہا ہے اور اس کی کامیابی کا دارومدار چین پر ہے۔ ایک تائیوانی مبصر نے 1993ء میں کہا ''1980ء سے پہلے امریکہ تائیوان کیلئے سب سے اہم مارکیٹ تھا لیکن 1990ء کی دہائی سے ہم جانتے ہیں کہ تائیوان کی کامیابی کا سب سے اہم عامل چین ہے۔'' مقامی طور پر محنت کی قلت کا شکار تائیوانی سرمایہ کاروں کیلئے چین کی سستی محنت میں بہت کشش ہے۔ 1994ء میں دونوں چینیوں کے درمیان سرمایہ، محنت کا عدم توازن یوں درست ہوا کہ تائیوان کی ماہی پروری کی کمپنیوں نے چین سے دس ہزار چینیوں کو بھرتی کیا۔

بڑھتے ہوئے معاشی رابطوں نے دونوں حکومتوں کے درمیان مذاکرات کی راہ ہموار کی ہے۔ 1991ء میں تائیوان نے سٹریٹس ایکسچینج فاؤنڈیشن (Straits Exchange Foundation) قائم کی اور چین نے ''دی ایسوسی ایشن فار ریلیشن ایکراس دی تائیوان سٹریٹ'' (The Association For Relations Across The Taiwan Strait) قائم کی تا کہ دونوں ملک باہمی کمیونی کیشن کر سکیں۔ پہلی میٹنگ اپریل 1993ء میں سنگاپور میں ہوئی جس کے نتیجے میں دوسری میٹنگیں چین اور تائیوان میں منعقد ہوئیں۔ اگست 1994ء میں ایک ''کامیاب'' معاہدہ ہوا جو کئی کلیدی مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور دونوں حکومتوں کے چوٹی کے لیڈروں میں میٹنگ کا امکان پیدا ہوا ہے۔

1990ء کی دہائی کے وسط میں بڑے مسائل ہنوز تائی پی اور بیجنگ کے مابین موجود تھے جن میں شامل تھے خودمختاری کا مسئلہ، بین الاقوامی تنظیموں میں تائیوان کی شرکت اور یہ

امکان کہ تائیوان خود کو ایک آزاد ریاست کے طور پر نئے سرے سے متعارف کروائے گا تاہم موخرالذکر کے وقوع کا امکان تو دور ہو گیا ہے کیونکہ آزادی کی بڑی وکیل ڈیموکریٹک پروگریسو پارٹی کو معلوم ہوا کہ تائیوانی ووٹر چین کے ساتھ موجود تعلقات کو منقطع کرنے کے حق میں نہیں ہیں اور یہ کہ اس کے انتخابی امکانات کو اس مسئلے پر زور دینے کی وجہ سے دھچکا لگے گا لہٰذا ڈی پی پی کے لیڈروں نے زور دیا ہے کہ اگر انہوں نے اقتدار حاصل کیا تو آزادی ان کے ایجنڈا کا فوری جزو (آئٹم) نہیں ہو گی۔ دونوں حکومتیں سپارٹلی اور جنوبی چینی سمندر میں واقع دوسرے جزیروں پر چینی خودمختاری کو تسلیم کرنے میں مشترک دلچسپی رکھتی ہیں اور چین کیلئے امریکہ کو تجارت کے حوالے سے سب سے زیادہ پسندیدہ قوم (موسٹ فیورڈ نیشن) کی حیثیت دینے میں متفق ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز میں دونوں چینیوں نے دھیرے دھیرے لیکن ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے نزدیک آنا جاری رکھا اور وسعت پذیر معاشی رشتوں اور مشترکہ ثقافتی شناخت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مشترکہ مفادات کو فروغ دیا ہے۔

1995ء میں مصالحت کی اس تحریک کو اس وقت تعطل کا سامنا کرنا پڑا جب تائیوان کی حکومت نے جارحانہ طور پر بین الاقوامی تنظیموں میں سفارتی طور پر تسلیم کئے جانے پر زور دیا۔ صدر لی تنگ ہوئی نے امریکہ کا ''نجی'' دورہ کیا اور تائیوان نے دسمبر 1995ء میں مقننہ کے انتخابات منعقد کئے جن کے بعد مارچ 1996ء میں صدارتی انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کے جواب میں چینی حکومت نے بڑی تائیوانی بندرگاہوں کے قریب سمندر میں میزائلوں کے تجربے کئے اور تائیوان کے زیرقبضہ جزیروں کے نزدیک فوجی مشقیں کیں۔ ان سرگرمیوں سے دو مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ فوری مسئلہ یہ ہے کہ کیا اب تائیوان رسمی طور پر آزاد ہوئے بغیر جمہوری رہے گا؟ کیا مستقبل میں تائیوان حقیقت میں آزاد ہوئے بغیر جمہوری ہو گا؟

تائیوان اور چین کے تعلقات دو مراحل سے گزر کر تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ برسوں تک قوم پرست حکومت دعویٰ کرتی رہی کہ وہ سارے چین کی حکومت ہے۔ اس

دعویٰ کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ اس حکومت سے تنازع جو تائیوان کو چھوڑ کر حقیقت میں سارے چین کی حکمران تھی۔ 1990ء کی دہائی میں تائیوان کی حکومت نے اس دعوے سے دست برداری اختیار کی اور خود کو تائیوان کی حکومت کے طور پر متعارف کروانا شروع کیا جس سے چین کے ساتھ مصالحت کی بنیادیں فراہم ہوئیں جو کہ ''ایک ملک دو نظام'' کے تصور پر عمل پیرا تھا۔ تاہم تائیوان میں بہت سے افراد اور گروپ تائیوان کی علیحدہ ثقافتی شناخت پر زور دے رہے ہیں۔ اس مختصر عرصے کیلئے چینی حکمرانی میں رہنے پر اور مینڈرین بولنے والی اس کی مقامی آبادی کی زبان پر وہ لوگ تائیوان کو غیر چینی معاشرہ قرار دلوانے پر زور دے رہے ہیں اور چین سے قانونی طور پر آزادی دلوانے کیلئے کوشاں ہیں۔ اس کے علاوہ تائیوان کی حکومت بین الاقوامی طور پر زیادہ متحرک ہوگئی ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو چین کا حصہ نہیں بلکہ ایک الگ ملک قرار دلوانا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ تائیوان کی حکومت کی اپنی تعریف یہ ہے کہ وہ سارے چین کی حکومت ہے۔ بیجنگ حکومت کیلئے اس کی آزادی مکمل طور پر نا قابل قبول ہے جو اس تصور کو حقیقت میں بدلنے سے روکنے کیلئے طاقت کے استعمال کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ چینی حکومت کے لیڈروں نے بیان دیا ہے کہ 1997ء میں ہانگ کانگ کی عوامی جمہوریہ چین میں شمولیت اور 1999ء میں مکاؤ کی چین میں شمولیت کے بعد وہ تائیوان کو دوبارہ چین میں شامل کرنے کیلئے سرگرم ہوں گے۔ یہ کیسے واقع ہوگا؟ اس کا انحصار تائیوان میں رسمی آزادی کی حمایت کے درجے پر ہے۔ بیجنگ میں جانشینی کی جدوجہد کی قرارداد جس نے سیاسی اور فوجی لیڈروں کو زیادہ قوم پرست بننے پر اکسایا ہے اور چینی فوجی استعداد کے ارتقا پر ہے جو تائیوان کے محاصرے یا اس پر حملے کو ممکن بنائے گی۔ اکیسویں صدی کے شروع میں ایسا لگتا ہے کہ جبر واستبداد یا مصالحت یا زیادہ متوقع طور پر دونوں کے آمیزے کے تحت تائیوان چین سے زیادہ قریب اور متحد ہو جائے گا۔

1970ء کی دہائی کے آخر تک کمیونسٹ مخالف سنگاپور اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین تعلقات سرد تھے اور لی کوان یو اور دوسرے سنگاپوری لیڈر چینی پسماندگی کے نقاد تھے۔ تاہم جیسے ہی 1980ء کی دہائی میں چین میں معاشی ترقی کا آغاز ہوا۔ سنگاپور نے چینی سرزمین

سے اپنے رشتے جوڑنے کا آغاز کلاسیکی حاشیہ بردارانہ انداز میں کر دیا۔ 1992ء میں سنگاپور نے چین میں 1.9 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور آئندہ برس شنگھائی کے باہر ایک صنعتی شہر سنگاپور دوم (Singapore II) تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی ہے جس میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہوگی۔ لی چین کے معاشی امکانات کا پرجوش وکیل اور اس کی طاقت کی تعریف کرنے والا بن گیا ہے۔ اس نے 1993ء میں کہا "چین وہاں ہے جہاں عمل ہے۔" سنگاپور کی خارجی سرمایہ کاری جو ملائیشیا اور انڈونیشیا پر مرکوز تھی اب چین کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ 1993ء میں سنگاپوری حکومت کی امداد سے قائم ہونے والے سمندر پار پراجیکٹوں میں سے آدھے چین میں تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ 1970ء کی دہائی میں لی کوان یو نے بیجنگ کے اپنے پہلے دورے کے دوران چینی لیڈروں کے ساتھ مینڈرین کے بجائے انگریزی بولنے پر اصرار کیا تھا۔ دو دہائیوں بعد وہ ایسا ہی کر رہا ہے۔

اسلام: یکجہتی کے بغیر شعور

عربوں میں اور عمومی طور پر مسلمانوں میں سیاسی وفاداری کی ساخت جدید مغرب سے مختلف ہے۔ موخرالذکر کیلئے قومی ریاست (نیشن سٹیٹ) سیاسی وفاداری کی چوٹی ہے۔ تنگ وفاداریاں اس کے تحت ہیں اور قومی ریاست سے وفاداری میں شامل ہیں۔ قومی ریاستوں سے بالاتر گروپ...... لسانی یا مذہبی برادریاں یا تہذیبیں...... کم شدید وفاداری اور ارتباط کے حامل ہوتے ہیں۔ مغرب میں تنگ سے وسیع اکائیوں کی طرف حرکت کرتے ہوئے وفاداریوں کی شدت کا خط ایک u شکل بناتا ہے جس میں مرکز میں عروج ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا میں وفاداری کی ساخت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام کی وفاداریوں کا نظام اندر سے کھوکھلا ہے۔ جیسا کہ آئرا لیپی ڈس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا "دو بنیادی، اصلی اور مستقل ساختیں رہی ہیں۔ ایک تو خاندان، برادری اور قبیلہ اور دوسری ایک بڑے پیمانے پر ثقافت، مذہب اور سلطنت کے اشتراکات۔" ایک لیبیائی دانشور (سکالر) نے ایسا ہی تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "قبائلیت اور مذہب (اسلام) نے عرب معاشروں کے سماجی، معاشی،

ثقافتی اور سیاسی ارتقا اور سیاسی نظاموں میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ یہ اس انداز سے باہمی طور پر گندھے ہوئے ہیں کہ انہیں عرب سیاسی کلچر اور عرب سیاسی ذہن کو تشکیل کرنے والے سب سے اہم عوامل تصور کیا جاتا ہے۔" عرب ریاستوں میں قبائل کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ جیسا کہ تحسین بشیر نے بیان کیا ہے کہ ان میں سے بہت سے قبائل تو بس "علم بردار قبائل" ہیں۔ سعودی عرب کا بانی دیگر ذرائع اور شادیوں کے ذریعے اتحاد کی اپنی مہارت کی وجہ سے قبائلی اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ سعودی سیاست ایک قبائلی سیاست کے طور پر ہی جاری ہے۔ کم از کم اٹھارہ بڑے قبائل نے لیبیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سوڈان میں پانچ سو قبائل آباد ہیں جن میں سے سب سے بڑا قبیلہ ملکی آبادی کا بارہ فیصد ہے۔

وسطی ایشیا میں تاریخی حوالے سے قومی شناختیں وجود نہیں رکھتی ہیں۔ "وفاداری قبیلے' برادری اور وسیع خاندان سے ہوتی ہے نہ کہ ریاست سے۔" دوسری انتہا پر لوگ مشترک طور پر "زبان' مذہب' ثقافت اور طرز زندگی" رکھتے تھے نیز "امیر کی طاقت سے زیادہ اسلام لوگوں کو متحد رکھنے والی سب سے مضبوط قوت تھا۔" ایک سو کے قریب "پہاڑی" اور ستر "میدانی" قبیلے چیچن اور متعلقہ جنوبی کوہ قاف کے لوگوں میں موجود ہیں اور سیاست اور معیشت کو اس انداز سے کنٹرول کرتے ہیں کہ سوویت کنٹرولڈ معیشت کے مقابلے میں چیچن لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ ان کی معیشت "قبائلی" معیشت ہے۔

پورے اسلام میں چھوٹا گروپ اور بڑا عقیدہ' قبیلہ اور امت' وفاداری اور وابستگی (کمٹمنٹ) کا مرکزی نکتہ رہے ہیں اور قومی ریاست کم اہم رہی ہے۔ عرب دنیا میں موجود ریاستوں کو قانونی جواز کے مسائل درپیش ہیں۔ ان میں سے اکثر یورپی استعماریت کی پیداوار ہیں اور ان کی سرحدیں اکثر بربروں اور کردوں جیسے نسلی گروہوں سے متصل نہیں ہیں۔ ان سرحدوں نے عرب قوم کو تقسیم کر دیا ہے لیکن اس کے برعکس ایک کل عرب ریاست کبھی ٹھوس روپ اختیار نہیں کر پائی۔ مزید یہ کہ خودمختار قومی ریاستوں کا تصور اللہ کی حاکمیت کے عقیدے اور امت کی اولیت کے خلاف ہے۔ ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے اسلامی بنیاد

پرستی اسلام کی یکتائی کے مقابلے میں قومی ریاست کو رد کرتی ہے بالکل جیسے مارکسزم نے بین الاقوامی پرولتاریہ کی یکتائی کے مقابلے میں اس کو مسترد کر دیا تھا۔ اسلام میں قومی ریاست کی کمزوری اس حقیقت سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے برسوں میں مسلم گروپوں کے مابین ان گنت جھگڑے رونما ہوئے ہیں۔ مسلم ریاستوں کے مابین جنگیں تو کبھی کبھار ہوئی ہیں۔ سب سے نمایاں عراق کا اپنے ہمسایوں پر یلغار اور حملہ کرنا ہے۔

1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں انہی عوام نے جنہوں نے ملکوں کے اندر اسلامی بغاوت کو ابھارا تھا مجموعی طور پر امت یا اسلامی تہذیب کو مضبوط کیا جیسا کہ ایک دانشور (سکالر) نے 1980ء کی دہائی کے وسط میں تبصرہ کیا تھا:

> ''مسلم شناخت اور اتحاد کا ایک گہرا مسئلہ آئندہ مزید بڑھے گا جس کی وجہ ہے عدم نو آبادیت' ترقی' صنعت میں اضافہ' شہروں میں اضافہ اور ایک بدلتا ہوا بین الاقوامی معاشی نظام (آرڈر) جس سے دوسری چیزوں کے علاوہ منسلک ہے مسلم زمینوں کے نیچے موجود تیل کی دولت ...... جدید ترسیلات (کمیونی کیشنز) نے مسلمانوں کے درمیان معاہدوں کو مضبوط اور واضح کیا ہے۔ حج کیلئے مکہ آنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے دور دراز کے ملکوں مثلاً چین اور سینیگال' یمن اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے اندر ایک مشترک شناخت کا شدید احساس پیدا کیا ہے۔ انڈونیشیا' ملائیشیا اور جنوبی فلپائن اور افریقہ سے مشرق وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں حصول علم کیلئے آنے والے طلباء کی تعداد بڑھ رہی ہے جس سے تصورات پھیل رہے ہیں اور ملکوں سے بالاتر تعلقات قائم ہو رہے ہیں۔ مسلمان دانشوروں (انٹلکچوئلز) اور علماء کے مابین کانفرنسیں اور اجلاس زیادہ سے زیادہ ہو رہے ہیں جو کہ تہران' مکہ اور کوالالمپور جیسے مراکز میں منعقد ہوتے ہیں۔ کیسٹوں نے (آواز والی اور اب تصویری) مسجد کے وعظوں کو بین الاقوامی سرحدوں سے پرے پہنچا دیا ہے چنانچہ اثر رکھنے والے مبلغوں کی پہنچ ان کی مقامی

برادریوں سے بڑھ کر کہیں آگے تک ہو گئی ہے۔"

اسلامی اتحاد کا شعور ریاستوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے اقدامات سے جھلکتا اور فروغ پاتا ہے۔ 1969ء میں سعودی عرب کے لیڈروں نے پاکستان، مراکش، ایران، تیونس اور ترکی کے ساتھ مل کر رباط میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد کی۔ اس کے نتیجے میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم بنی جو کہ 1972ء میں رسمی طور پر جدہ میں ہیڈکوارٹر بننے سے وجود پذیر ہوئی۔ اب ٹھوس مسلمان آبادی رکھنے والی ریاستیں حقیقت میں کانفرنس سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ اپنی نوعیت کی واحد بین الریاستی تنظیم ہے۔ عیسائی، آرتھوڈوکس، بدھ، ہندو حکومتیں مذہب کی بنیاد پر رکنیت رکھنے والی بین الریاستی تنظیمیں نہیں رکھتی ہیں جبکہ اسلامی حکومتیں رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ سعودی عرب، پاکستان، ایران اور لیبیا کی حکومتیں غیر حکومتی تنظیموں (این جی اوز) مثلاً ورلڈ مسلم کانگرس (ایک پاکستانی تخلیق) اور مسلم ورلڈ لیگ (ایک سعودی تخلیق) کی مدد اور حمایت کرتی ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار، اکثر بہت دور دور، حکومتوں، جماعتوں، تحریکوں اور مقاصد کی جو کہ مشترک نظریاتی نہاد میں یقین رکھتے ہیں" اور جو کہ "مسلمانوں کے درمیان اطلاعات کے بہاؤ کو زرخیز بنا رہے ہیں۔"

تاہم اسلامی شعور سے اسلامی اتحاد کی طرف تحریک میں دو پیراڈاکس ہیں۔ اول، اسلام ایسے مقابلے باز قوت کے مراکز میں بٹا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک اس امر کیلئے کوشاں ہے کہ اس کی لیڈرشپ کے تحت امت میں اسلامی شناخت کو فروغ ملے جس سے اسلامی اتحاد میں اضافہ ہو۔ ایک طرف تو یہ مقابلہ مضبوط و مستحکم حکومتوں اور ان کی تنظیموں میں جاری ہے اور دوسری طرف اسلام پسند حکومتوں اور ان کی تنظیموں کے مابین جاری ہے۔ سعودی عرب نے او آئی سی کو ناصر کے غلبے تلے چلنے والی عرب لیگ کے مقابلے میں بنایا تھا۔ 1991ء میں خلیج کی جنگ کے بعد، سوڈان کے لیڈر حسن ترابی نے پاپولر عرب اور اسلامی کانفرنس (PAIC) بنائی جو کہ سعودی غلبے والی او آئی سی کا جواب تھی۔ 1995ء کے شروع میں پی اے آئی سی (PAIC) کی تیسری کانفرنس خرطوم میں ہوئی۔ اس میں اسی ملکوں کی اسلام پسند تنظیموں اور تحریکوں کے کئی سو نمائندوں نے شرکت کی۔ ان رسمی تنظیموں

کے ساتھ ساتھ افغانستان کی جنگ نے غیر رسمی اور زیرزمین گروپوں کو پیدا کیا ہے جو الجیریا' چیچنیا' مصر' تیونس' بوسنیا' فلسطین' فلپائن اور ہر کہیں اسلام پسندی کے مقاصد کے تحت مصروف جنگ ہیں۔ جنگ کے بعد ان کے عہدے تبدیل ہو جاتے ہیں ان جنگجوؤں کے ساتھ جو پشاور کے باہر واقع یونیورسٹی آف دعوۃ و جہاد میں تربیت پاتے ہیں اور ان کیمپوں میں جنہیں بہت سے حلقے اور افغانستان میں ان کے خارجی پشت پناہ مدد فراہم کرتے ہیں۔ انقلابی حکومتوں اور تحریکوں کے مشترکہ مفادات زیادہ روایتی اختلافات پر غالب آ گئے ہیں اور ایرانی امداد کے تحت سنی اور شیعہ بنیاد پرست گروپوں کے درمیان روابط استوار ہوئے ہیں۔ سوڈان اور ایران کے درمیان قریبی فوجی روابط موجود ہیں۔ ایرانی فضائیہ اور بحریہ سوڈانی آلات استعمال کرتی ہیں اور دونوں حکومتیں الجیریا اور مختلف جگہوں پر سرگرم بنیاد پرستوں کو مدد فراہم کرتی ہیں۔ حسن الترابی اور صدام حسین نے مبینہ طور پر 1994ء میں قریبی معاہدے کئے ہیں اور ایران اور عراق مصالحت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

دوم' امت کا تصور قومی ریاست کے عدم جواز کا باعث ہے اور امت صرف ایک یا زیادہ مرکزی ریاستوں کے اقدامات سے ہی وجود پذیر ہو سکتی ہے جو کہ فی الحال عدم موجود ہیں۔ اسلام کا ایک مذہبی سیاسی برادری کے تصور کے طور پر مطلب تھا کہ مرکزی ریاستیں عمومی طور پر ماضی میں صرف اس وقت ٹھوس روپ میں آئیں جب مذہبی اور سیاسی لیڈر شپ' خلافت اور سلطنت واحد حکومتی ادارے میں مجتمع ہو گئیں۔ ساتویں صدی کی شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا کی تیز عرب فتوحات کے نتیجے میں خلافت امیہ کو عروج حاصل ہوا جس کا دارالحکومت دمشق تھا۔ اس کے بعد آٹھویں صدی میں فارسی اثرات کی حامل بغداد میں مرکز رکھنے والی عباسی خلافت قائم ہوئی۔ چار سو برس بعد عثمانی ترکوں نے پورے مشرق وسطیٰ میں صفایا پھیر دیا۔ 1453ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ جمایا اور 1517ء میں ایک نئی خلافت کی داغ بیل ڈالی۔ عین اسی زمانے میں دوسرے ترک نژاد لوگوں نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور مغل شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ مغرب کے ابھار نے عثمانی اور مغل ہر دو سلطنتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور عثمانی سلطنت کے خاتمے سے اسلام مرکزی ریاست کے بغیر رہ گیا۔ اس کے

علاقوں کو مغربی طاقتوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ جب وہ واپس ہوئے تو نازک ریاستوں کی صورت میں پیچھے چھوڑ گئے جنہیں مغربی نمونے پر تشکیل دیا گیا تھا جو کہ اسلام کی روایتوں کیلئے اجنبی تھا لہذا بیسویں صدی کے زیادہ عرصہ میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں تھا جو اتنی اطمینان بخش طاقت نیز ثقافتی اور مذہبی جواز رکھتا ہو کہ اس کردار کو بحال کرے اور دوسری مسلمان ریاستیں اور غیر مسلمان ملک اسے اسلام کا لیڈر تسلیم کریں۔

اسلام کے داخلی اور خارجی جھگڑوں کی بڑی وجہ ایک اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی ہے۔ اسلام کی کمزوری کا سبب بغیر اتحاد کے شعور ہے اور دوسری تہذیبوں کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ کیا یہ صورتحال برقرار رہے گی؟

ایک اسلامی مرکزی ریاست کو معاشی وسائل، فوجی قوت، تنظیمی استعداد اور اسلامی تشخص کا حامل ہونا چاہئے نیز امت کو سیاسی اور مذہبی لیڈر شپ فراہم کرنے کی کمٹمنٹ کا حامل ہونا چاہئے۔ چھ ریاستیں مختلف وقتوں میں اسلام کے ممکنہ لیڈر کے طور پر بیان کی گئی ہیں تاہم اس وقت ان میں سے کوئی بھی ایک موثر مرکزی ریاست کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتی۔ انڈونیشیا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے اور تیزی سے معاشی حوالے سے ترقی کر رہا ہے تاہم یہ عرب مرکز سے دور اسلام کے محیط پر واقع ہے۔ اس کا اسلام ڈھیلا ڈھالا جنوب مشرقی ایشیائی رنگ کا حامل ہے۔ نیز اس کے لوگ اور ثقافت مقامیوں، مسلمانوں، ہندوؤں، چینیوں اور عیسائیوں کے اثرات کا امتزاج ہے۔ مصر ایک عرب ملک ہے۔ اس کی آبادی کافی زیادہ ہے۔ مشرق وسطی میں ایک مرکزی، سٹریٹیجک اعتبار سے اہم جغرافیائی محل وقوع رکھتا ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات کا اہم ادارہ الازہر یونیورسٹی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک غریب ملک ہے جس کا انحصار معاشی حوالے سے امریکہ، مغرب کے کنٹرول والے اداروں اور تیل سے مالا مال عرب ریاستوں پر ہے۔

ایران، پاکستان اور سعودی عرب خود کو مسلمان ملک قرار دیتے ہیں اور امت پر اثر انداز ہونے اور اسے لیڈر شپ مہیا کرنے کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تنظیموں کی مدد کرتے ہیں، اسلامی گروپوں کو فنڈ دیتے ہیں،

افغانستان میں جنگجوؤں کو امداد مہیا کرتے ہیں اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے دل جیتنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ایران بڑا حجم' مرکزی محل وقوع' آبادی' تاریخی روایات' تیل کے ذخائر اور اوسط درجے کی معاشی ترقی کا حامل ہے جو اسے ایک مرکزی اسلامی ریاست کا اہل بناتے ہیں۔ تاہم نوے فیصد مسلمان سنی ہیں جبکہ ایران شیعہ ہے۔ فارسی عربی کے بعد اسلام کی دوسری زبان ہے اور عربوں اور فارسیوں کے مابین تعلقات تاریخی حوالے سے کشیدہ چلے آرہے ہیں۔

پاکستان بڑا حجم' آبادی اور فوجی مہارت کا حامل ہے اور اس کے لیڈر مستقل طور پر اسلامی ریاستوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کے کردار کے داعی رہے ہیں نیز باقی ساری دنیا کیلئے اسلام کے ترجمان بنے رہے ہیں۔ تاہم پاکستان نسبتاً غریب ہے اور داخلی طور پر سنگین نسلی اور علاقائی تفریقوں (Divisions) سے دوچار ہے۔ اس کا سیاسی ریکارڈ غیر مستحکم ہے اور ہندوستان سے مسلسل حالت جنگ میں ہونے کی وجہ سے سلامتی کے مسائل سے دوچار ہے جس کی وجہ سے اسے اپنے مفادات کیلئے دوسرے مسلمان ملکوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلمان ملکوں مثلاً چین اور امریکہ کے ساتھ قریبی تعلقات بنانے پڑے ہیں۔

سعودی عرب اسلام کا حقیقی گھر تھا۔ اسلام کے مقدس مقامات یہیں ہیں۔ اس کی زبان اسلام کی زبان ہے۔ یہ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر رکھتا ہے اور نتیجتاً مالی اثر کا بھی حامل ہے نیز اس کی حکومت نے سعودی معاشرے کو اسلامی خطوط پر پوری طرح استوار کیا ہے۔ 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں کے دوران میں سعودی عرب اسلام کی واحد موثر قوت تھا۔ اس نے دنیا بھر میں اسلامی مقاصد کیلئے اربوں ڈالر خرچ کئے۔ مسجدوں اور نصابی کتابوں سے لے کر سیاسی جماعتوں' اسلام پسند تنظیموں اور دہشت گرد تحریکوں تک کو مالی مدد فراہم کی اور یہ سب بلا تفریق کیا۔ دوسری طرف اس کی نسبتاً تھوڑی آبادی اور جغرافیائی محل وقوع نے اس کو سلامتی کے حوالے سے مغرب کا محتاج (Dependent) بنا دیا ہے۔

آخر میں ترکی تاریخ' آبادی' معاشی ترقی کا اوسط درجہ' قومی اتحاد اور فوجی روایت اور اہلیت کے اعتبار سے اسلامی مرکزی ریاست بن سکتا ہے۔ تاہم عثمانی سلطنت کے اثرات

سے آزاد کروانے کیلئے اتاترک نے اسے جو سیکولر شناخت عطا کی تھی اسی نے اسے اس کردار کیلئے نااہل قرار دلوا دیا ہے۔ ترکی او آئی سی کا چارٹر رکن بھی نہیں بن سکا کیونکہ اس کے دستور میں سیکولرازم کے ساتھ وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ جب تک ترکی خود کو ایک سیکولر ریاست کہلواتا رہے گا' اسلام کی لیڈر شپ اس کو رد کرتی رہے گی۔ تاہم اگر ترکی خود کو نیا تعارف دے بھی دے تو کیا ہوگا؟ ترکی مغرب میں رکنیت کے فقیر کی حیثیت والے تذلیل سے بھرے ہوئے اور پریشانی پیدا کرنے والے کردار کو ترک کرنے سے راضی ہوسکتا ہے اور اپنے کہیں زیادہ متاثر کن اور اعلیٰ تاریخی کردار کو اختیار کرسکتا ہے جس کے تحت وہ عظیم اسلامی فیصلہ ساز اور مغرب کا دشمن تھا۔ بنیاد پرستی ترکی میں عروج پر رہی ہے۔ اوزال کے تحت ترکی نے خود کو عرب دنیا سے ہم آہنگ کروانے کی متعدد کوششیں کی تھیں اس نے نسلی اور لسانی روابط کے تحت وسطی ایشیا میں اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بوسنیائی مسلمانوں کو حوصلہ افزائی اور امداد دی ہے۔

ترکی اس اعتبار سے ایک منفرد ملک ہے کہ بلقان' مشرق وسطیٰ' شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ تاریخی رشتے رکھتا ہے۔ خیال ہے کہ ترکی ''ایک جنوبی افریقہ'' بن سکتا ہے۔ اس کیلئے اسے ویسے ہی سیکولرازم کو ترک کرنا ہوگا جس طرح جنوبی افریقہ نے نسل پرستی کو ترک کیا تھا اور اپنے آپ کو اپنی تہذیب کیلئے مطعون ریاست سے اپنی تہذیب کی رہنما ریاست میں تبدیل کرلیا تھا۔ عیسائیت اور نسل پرستی میں مغرب کے اچھے اور برے کے تجربے رکھتے ہوئے جنوبی افریقہ خاص طور پر افریقہ کی رہنمائی کررہا ہے۔ بالکل اسی طرح سیکولرازم اور جمہوریت میں مغرب کے اچھے اور برے تجربات رکھتے ہوئے ترکی اسلام کا رہنما بن سکتا ہے لیکن ایسا کرنے کیلئے اسے اتاترک کے ورثے کو مسترد کرنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے روس نے لینن کے ورثے کو مسترد کردیا ہے۔ اس کو اتاترک کی سطح کا لیڈر بھی مطلوب ہے جو مذہبی اور سیاسی قانونی جواز کو مجتمع کر کے ترکی کو کٹے پھٹے ملک سے ایک مرکزی ریاست میں تبدیل کردے۔

..............☆☆☆..............

حصہ چہارم

تہذیبوں کے تصادم

باب 8

بین التہذیبی مسائل

مغربی آفاقیت

ابھرتی ہوئی دنیا میں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات قریبی نوعیت کے نہیں بلکہ مناقشانہ نوعیت کے ہوں گے تاہم کچھ بین التہذیبی تعلقات دوسروں کی نسبت زیادہ اختلاف کی طرف مائل ہیں۔ چھوٹی (Micro) سطح پر سب سے زیادہ پرتشدد تقسیمی خط اسلام اور اس کے آرتھوڈوکس، ہندو، افریقی اور مغربی عیسائی ہمسایوں کے درمیان کھنچا ہوا ہے۔ بڑی (Macro) سطح پر غالب تقسیم ''مغرب اور باقی دنیا'' کے درمیان ہے جس میں ایک طرف تو مسلم اور ایشیائی معاشروں کے مابین اور دوسری طرف مغرب کے ساتھ شدید جھگڑے رونما ہو رہے ہیں۔ مستقبل میں مغرب کے گھمنڈ، اسلامی عدم برداشت اور چینی جارحانہ دعوے داری کی وجہ سے خطرناک تصادمات کے رونما ہونے کا امکان ہے۔

تہذیبوں کے درمیان تنہا مغرب ہر دوسری تہذیب پر نمایاں اور گہرا اثر ڈال چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر مغرب کے اقتدار اور ثقافت میں رشتہ اور دوسری تہذیبوں کے اقتدار اور ثقافت میں رشتہ تہذیبوں کی دنیا میں سب سے زیادہ چھایا ہوا ہے۔ دوسری تہذیبوں سے نسبت رکھنے والی قوت کی حیثیت سے مغربی ثقافت کی کشش کم ہوئی ہے اور غیر مغربی لوگوں نے اپنی مقامی ثقافتوں میں دلچسپی اور وابستگی میں اضافہ کیا ہے۔ نتیجتاً مغرب اور باقی دنیا

کے تعلقات میں مرکزی مسئلہ مغرب کا خصوصاً امریکہ کا ایک آفاقی مغربی ثقافت کو تشکیل دینے کی کوشش کرنا اور ایسا کرنے کی اہلیت کا زوال ہے۔

کمیونزم کے انہدام نے اس مغالطے کو پختہ تر کیا ہے۔ مغرب میں اس سوچ کے غلبہ پانے کی صورت میں کہ اس کا جمہوری لبرل ازم کا نظریہ عالمی طور پر فتح پا گیا ہے اور لہٰذا آفاقی طور پر درست ہے۔ مغرب اور خاص طور پر امریکہ، جو کہ ہمیشہ ایک تبلیغی (مشنری) ریاست رہا ہے، یقین رکھتے ہیں کہ غیر مغربی لوگوں کو مغرب کی جمہوریت، آزاد منڈی (فری مارکیٹ)، محدود حکومت، انسانی حقوق، انفرادیت پسندی، قانون کی حکمرانی جیسی اقدار سے وابستہ ہونا چاہئے اور اپنے اداروں میں ان اقدار کو نافذ کرنا چاہئے۔ دوسری تہذیبوں میں اقلیتیں ان اقدار کو تسلیم کرتی اور فروغ دیتی ہیں لیکن غیر مغربی ثقافتوں کے اندر غالب رجحان تو ان اقدار کے حوالے سے تشکیک پسندی ہی کا ہے جو وسیع اختلاف تک جا پہنچتا ہے۔ مغرب کیلئے جو آفاقیت ہے وہ باقی دنیا کیلئے استعماریت، سامراجیت ہے۔ مغرب اپنی غالب حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہے گا نیز اپنے مفادات کا تحفظ یوں کرے گا کہ ان مفادات کو ''عالمی برادری'' کے مفادات باور کروائے گا۔ یہ اصطلاح (آزاد دنیا کی جگہ) لے چکی ہے جس کے ذریعے امریکہ اور دوسری مغربی طاقتیں اپنے مفاد کیلئے کئے گئے کاموں کو عالمی جواز مہیا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر مغرب غیر مغربی معاشروں کی معیشتوں کو ایک عالمی معاشی نظام سے مربوط کرنا چاہ رہا ہے جس پر اس کا تسلط ہو گا۔ آئی ایم ایف اور دوسرے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ذریعے مغرب اپنے معاشی مفادات کو فروغ دیتا ہے اور دوسری قوموں پر وہ معاشی پالیسیاں نافذ کرواتا ہے جنہیں خود درست سمجھتا ہے تاہم غیر مغربی لوگوں کے کسی بھی انتخاب میں آئی ایم ایف بلا شبہ وزرائے خزانہ اور چند دوسروں کی حمایت حاصل کر لے گا۔ تاہم ان کے علاوہ ایسا ہر شخص اس کی بھرپور مخالفت کرے گا جو کہ آئی ایم ایف کے افسروں کے بارے میں جارجی آربیٹو کے اس بیان سے متفق ہے کہ وہ ''نئے بالشویک ہیں جو دوسرے لوگوں کی دولت کو ضبط کرنے غیر جمہوری اور اوپرے (Alien) معاشی و سیاسی ضابطوں کو نافذ کرنے اور معاشی آزادی

کوسلب کرنے سے محبت کرتے ہیں۔''

غیر مغربی مغرب کے اصولوں اور عمل کے مابین فرق کو بیان کرنے سے بھی ہچکچاتے نہیں ہیں۔ منافقت' دوہرے معیارات اور ''اگر مگر'' آفاقیت پسندانہ روش کی قیمت ہیں۔ جمہوریت کوفروغ دیا جاتا ہے مگر اسے نہیں جو مسلمان بنیاد پرستوں کو اقتدار میں لے آئے۔ ایران اور عراق کیلئے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی تبلیغ کی جاتی ہے لیکن اسرائیل کیلئے نہیں۔ آزاد تجارت معاشی ترقی کا اکسیر ہے مگر زراعت کیلئے نہیں۔ انسانی حقوق صدام حسین کے معاملے میں تو ایک مسئلہ ہیں لیکن سعودی عرب کے حوالے سے نہیں۔ تیل کے مالک کویتیوں کے خلاف جارحیت کوتو بڑے پیمانے پر روکا جاتا ہے مگر تیل کی ملکیت سے محروم بوسنیائیوں کی مدد نہیں کی جاتی ہے۔ عملاً دوہرے معیارات آفاقی اصول کے معیاروں کی ناگزیر قیمت ہیں۔

غیر مغربی معاشرے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد خود کو مغرب کے معاشی' فوجی اور ثقافتی تسلط سے بھی آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ ایشیائی اور اسلامی ملک مغرب سے فوجی حوالے سے توازن حاصل کرنے کیلئے شارٹ کٹ تلاش کر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب کی آفاقی نامقبولیت' مغرب کی نسبتی طاقت میں زوال اور دوسری تہذیبوں کے بڑھتے ہوئے ثقافتی اثبات نے عمومی طور پر مغرب اور باقی دنیا کے درمیان تعلقات کو دشوار بنا دیا ہے۔ تاہم ان رشتوں کی نوعیت اور جس انداز سے وہ مخالفانہ بنتے ہیں نمایاں طور پر مختلف ہے اور ان کو تین درجوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ چیلنج کرنے والی تہذیبوں' اسلام اور چین کے ساتھ مغرب کے تعلقات مستقل طور پر تناؤ کا شکار ہیں اور اکثر اوقات بہت زیادہ مخالفانہ ہو جاتے ہیں۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ کی قدرے کمزور تہذیبوں کے ساتھ کم کشیدہ ہیں جو کہ کئی حوالوں سے مغرب پر انحصار کرتی ہیں خصوصاً لاطینی امریکہ' روس' جاپان اور ہندوستان کے مغرب کے ساتھ تعلقات دوسرے دو گروپوں سے مختلف ہیں یعنی تعاون و اشتراک بھی اور تنازع و اختلاف بھی۔ بعض اوقات یہ تینوں مرکزی ریاستیں چیلنج کرنے والی تہذیبوں کے ساتھ صف آرا ہوتی ہیں اور بعض اوقات مغرب کی طرف دار ہوتی ہیں۔ یہ تہذیبیں ایک طرف تو مغرب

اور دوسری طرف اسلامی اور چینی تہذیبوں کے درمیان ''جھول'' رہی ہیں۔

اسلام اور چین عظیم ثقافتی روایات کو تشکیل دیتے ہیں جو مغرب سے بہت مختلف ہیں اور ان کی اپنی نگاہوں میں تو لامحدود طور پر مغرب سے افضل و برتر ہیں۔ مغرب کے تناظر میں ہر دو کی قوت اور اثبات بڑھ رہے ہیں نیز ان کی اقدار اور مفادات اور مغرب کی اقدار اور مفادات میں تنازع و اختلاف میں اضافہ ہو رہا ہے اور مزید شدت اختیار کر رہا ہے کیونکہ اسلام کی کوئی مرکزی ریاست نہیں ہے لہٰذا ملک ملک کے حوالے سے اس کے تعلقات مغرب کے ساتھ جدا جدا ہیں تاہم 1970ء کی دہائی سے ایک مستقل مغرب دشمن رجحان موجود رہا ہے۔ جو بنیاد پرستی کے ابھار' مسلمان ملکوں کے اندر مغرب کے حامیوں سے مغرب کے مخالفوں کی طرف اقتدار کی تبدیلی' مغرب اور چند اسلامی گروپوں کے درمیان جنگ کے ظہور اور امریکہ اور چند اسلامی ملکوں کے درمیان سرد جنگ کے دوران ہونے والے سلامتی کے معاہدوں کے کمزور ہو جانے سے عیاں ہے۔ مغرب کے مقابلے میں یہ تہذیبیں مستقبل کی دنیا کی تشکیل پذیری میں جو کردار ادا کریں گی اس کے حوالے سے چند خاص مسائل پر اختلافات کو حل کرنا ایک بنیادی سوال ہے۔ کیا اکیسویں صدی میں عالمی (گلوبل) ادارے' اقتدار کی تقسیم اور قوموں کی سیاست اور معیشت مغربی اقدار اور مفادات کی ترجمان ہوں گی یا یہ اسلام اور چین کی اقدار اور مفادات کے تحت صورت پذیر ہوں گی؟

بین الاقوامی تعلقات کا حقیقت پسندانہ نظریہ تو پیش گوئی کرتا ہے کہ غیر مغربی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کو مغرب کی غالب قوت کو متوازن کرنے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ ہونا چاہئے۔ تاہم ایک عمومی مغرب دشمن اتحاد مستقبل قریب میں متوقع نہیں ہے۔ اسلامی اور چینی تہذیبیں مذہب' ثقافت' سماجی ساخت' روایات' سیاست اور طرز حیات کے بنیادی تصورات کے حوالوں سے ایک دوسرے سے اساسی طور پر مختلف ہیں۔ یہ دونوں وراثتی طور پر ایک دوسرے سے کم اشتراک رکھتی ہیں جبکہ مغربی تہذیب کے ساتھ ان کا اشتراک زیادہ ہے۔ تاہم سیاست میں ایک مشترک دشمن مشترک مفاد کو جنم دیتا ہے۔ اسلامی اور چینی معاشرے جنہیں مغرب اپنے دشمن کے طور پر دیکھتا ہے مغرب کے خلاف ایک دوسرے

سے تعاون کرنے کا جواز رکھتے ہیں' بالکل جیسا کہ اتحادیوں اور سٹالن نے ہٹلر کے خلاف کیا تھا۔ یہ تعاون مختلف نوعیت کے معاملات میں رونما ہوسکتا ہے۔ بشمول انسانی حقوق' معیشت اور سب سے زیادہ اہم دونوں معاشروں کی اپنی اپنی فوجی استعداد کو بڑھانے کی کوششیں کرنا' خصوصاً وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور انہیں پھینکنے کیلئے میزائلوں کی تیاری کی کوششیں کرنا. تاکہ مغرب کی روایتی فوجی برتری کا توڑ کیا جا سکے۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز سے ''کنفیوشسی اسلامی تعلق'' ایک طرف تو چین اور شمالی کوریا کے درمیان تھا اور دوسری طرف ایک بدلتے ہوئے درجے میں پاکستان' ایران' عراق' شام' لیبیا اور الجیریا مغرب کے ساتھ مختلف مسائل پر متصادم تھے۔

وہ مسائل جو مغرب اور باقی دوسرے معاشروں کو تقسیم کر رہے ہیں بین الاقوامی ایجنڈا پر رفتہ رفتہ اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ایسے تین مسائل مغرب کی کوششوں میں شامل ہیں۔ (1) نیوکلیائی' حیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کی پرولی فیریشن اور نان پرولی فیریشن نیز انہیں پھینکنے کے ذرائع کی تیاری کی پالیسیوں کے ذریعے اپنی فوجی برتری کو برقرار رکھنا۔ (2) دوسرے معاشروں پر دباؤ ڈال کر مغرب کی سیاسی اقدار اور اداروں کو فروغ دینا' انسانی حقوق جیسا کہ مغرب انہیں تصور کرتا ہے کے حوالے سے اور مغربی خطوط پر جمہوریت کو قبول کرنے کیلئے دباؤ ڈالتا ہے۔ (3) مغربی معاشروں کے ثقافتی' سماجی اور نسلی اتحاد و ارتباط کے تحفظ کیلئے غیر مغربی لوگوں کے امیگرنٹ یا مہاجر کے طور پر داخلے پر پابندی لگانا۔ ان تینوں شعبوں میں مغرب کو غیر مغربی معاشروں کے برخلاف اپنے مفادات کے دفاع میں مسلسل دشواریاں درپیش ہیں۔

ہتھیار سازی

فوجی استعدادوں کا پھیلاؤ نتیجہ ہے عالمی (گلوبل) معاشی اور سماجی ترقی کا۔ جیسے ہی جاپان' چین اور دوسرے ایشیائی ملک معاشی حوالے سے امیر ہوں گے وہ فوجی حوالے سے بھی طاقتور ہو جائیں گے۔ نیز اسلامی معاشرے بھی آخرکار اسی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

اسی طرح روس بھی طاقتور ہو جائے گا بشرطیکہ وہ اپنی معاشی اصلاحات میں کامیاب ہو گیا۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں نے کئی غیر مغربی اقوام کو مغربی معاشروں سے اسلحہ کے تبادلے کے ذریعے ترقی یافتہ ہتھیاروں کا حامل ہوتے ہوئے مشاہدہ کیا ہے۔ ان میں روس، اسرائیل اور چین ایسے ہی ملک ہیں جو مقامی طور پر بھی ہتھیار سازی کی سہولیات تخلیق کر چکے ہیں۔ ان عملوں کے اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بھی جاری بلکہ تیز ہونے کا امکان ہے۔ تاہم صرف مغرب یعنی بنیادی طور پر امریکہ ہی فرانس اور برطانیہ کی ہمراہی میں دنیا کے کسی بھی حصے میں فوجی مداخلت کرنے کا اہل ہوگا۔ نیز امریکہ ہی اتنی فضائی قوت رکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی بمباری کر سکتا ہے۔ یہ ہیں امریکہ کی فوجی قوت کے مرکزی عناصر بطور ایک عالمی طاقت کے اور مغرب کے بطور دنیا کی غالب تہذیب کے۔ مغرب اور باقی دنیا کا روایتی فوجی توازن طاقت مستقبل قریب میں مغرب ہی کے حق میں ہوگا۔

اول درجے کے روایتی فوجی استعداد حاصل کرنے کیلئے درکار وقت، کوشش اور اخراجات نے غیر مغربی ریاستوں کو مغرب کی روایتی فوجی قوت کا توڑ کرنے کیلئے دیگر ذرائع اپنانے پر راغب کیا ہے۔ سب سے عمومی شارٹ کٹ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور ان کے پھینکنے کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔ تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں اور وہ ملک جو علاقائی برتری کے خواہشمند ہیں ان ہتھیاروں کو حاصل کرنے میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ اول تو ایسے ہتھیار ان ریاستوں کو اس قابل بنا دیں گے کہ وہ اپنی تہذیب کی حواری ریاستوں اور علاقے پر برتری حاصل کر لیں اور دوسرے یہ کہ امریکہ یا دوسری خارجی طاقتوں کی اپنے علاقے یا تہذیب میں مداخلت کو روکنے کے ذرائع مہیا کرنا۔ اگر صدام حسین کویت پر اپنی یلغار کو دو یا تین سال کیلئے مؤخر کر دیتا تو عراق نیوکلیائی ہتھیار حاصل کر لیتا جس کے بعد وہ نہ صرف کویت پر بلکہ سعودی آئل فیلڈز پر بھی قابض ہو سکتا تھا۔ غیر مغربی ریاستوں نے خلیج کی جنگ سے واضح سبق حاصل کئے ہیں۔ شمالی کوریا کیلئے یہ اسباق درج ذیل تھے ''امریکیوں کو اپنی افواج کھڑی مت کرنے دو، انہیں فضائی قوت بڑھانے نہیں دو، انہیں پہل نہیں کرنے دو، انہیں کم امریکی نقصانات کے ساتھ جنگ نہیں

لڑنے دو۔" ایک ہندوستانی چوٹی کے فوجی افسر کیلئے یہ سبق واضح تھا "جب تک تم نیوکلیائی طاقت حاصل نہ کرلو امریکہ سے جنگ مت کرو۔" یہ سبق پوری غیر مغربی دنیا کے سیاسی لیڈروں اور فوجی چیفس نے دل پر نقش کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "اگر تم نیوکلیائی ہتھیار رکھتے ہو تو امریکہ تم سے نہیں لڑے گا۔"

لارنس فریڈمین نے تبصرہ کیا ہے کہ "معمول کے مطابق طاقت کی سیاست کے نفاذ کے بجائے نیوکلیائی ہتھیاروں نے درحقیقت بین الاقوامی نظام کی تشکیل کے رجحان کی تصدیق کردی ہے جس میں موجودہ عظیم طاقتوں کا کردار محدود ہوگا۔" لہٰذا مابعد سرد جنگ دنیا میں مغرب کیلئے نیوکلیائی ہتھیاروں کا کردار سرد جنگ کے دوران کے کردار سے مختلف ہے۔ جیسا کہ ڈیفنس سیکرٹری لیس ایسپن نے نشان دہی کی ہے کہ نیوکلیائی ہتھیار سوویت یونین پر مغربی روایتی برتری کی تلافی کرتے ہیں۔ وہ "برابری دلانے والے" ہیں۔ تاہم مابعد سرد جنگ دنیا میں امریکہ کے پاس سب سے زیادہ روایتی فوجی طاقت ہے اور ہمارے خفیہ دشمن نیوکلیئر ہتھیار حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم ہی برابری دلانے والوں کو مٹا سکتے ہیں۔"

لہٰذا اب یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں رہی کہ روس اپنی دفاعی منصوبہ بندی میں نیوکلیائی ہتھیاروں کے کردار پر زور دیتا ہے اور اس نے 1995ء میں یوکرائن سے مزید انٹر کانٹی نینٹل میزائل اور بمبار خریدے ہیں۔ ایک امریکی ماہر اسلحہ نے تبصرہ کیا کہ "اب ہم وہ کچھ سن رہے ہیں کہ جو 1950ء کی دہائی میں روسیوں کے بارے میں سنا کرتے تھے۔ اب روسی کہہ رہے ہیں ہمیں ان کی روایتی بالادستی کی تلافی کیلئے نیوکلیائی ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔" سرد جنگ کے دوران میں امریکہ نے ایک نسبتی جواب میں امتناعی مقاصد کیلئے نیوکلیائی ہتھیاروں کے استعمال میں پہل کرنے کے اعلان کو مسترد کر دیا تھا۔ مابعد سرد جنگ دنیا میں نیوکلیائی ہتھیاروں کے امتناعی مقاصد کے مدنظر 1993ء میں روس نے پہل نہ کرنے کے سابقہ سوویت وعدے کو رد کر دیا۔ اسی طرح چین نے بھی مابعد سرد جنگ کی محدود امتناع کی نیوکلیائی سٹریٹجی کو ترقی دیتے ہوئے اپنے 1964ء کے پہل نہ کرنے کے وعدے کو کمزور کرنا شروع کر دیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے نیوکلیائی اور عمومی تباہی پھیلانے

والے ہتھیار حاصل کر لئے ہیں تو دوسری مرکزی ریاستیں اور علاقے ان کی پیروی کرنے لگی ہیں تاکہ اپنے خلاف ہونے والے مغرب کے روایتی فوجی اقدام کیلئے امتناع کو بڑھا لیں۔

نیوکلیائی ہتھیار مغرب کو زیادہ براہ راست طور پر بھی دھمکا سکتے ہیں۔ چین اور روس کے پاس بیلسٹک میزائل ہیں جو کہ نیوکلیائی وار ہیڈز کو لے کر یورپ اور شمالی امریکہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ شمالی کوریا' پاکستان اور ہندوستان اپنے میزائلوں کی رینج بڑھا رہے ہیں اور کسی حد تک مغرب کو نشانہ بنانے کی استعداد رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ نیوکلیائی ہتھیار دوسرے ذرائع سے بھی گرائے جا سکتے ہیں۔ فوجی تجزیہ کاروں نے بہت کم درجے کی جنگ' مثلاً دہشت گردی اور گوریلا جنگ سے لے کر محدود جنگ اور آگے بڑھ کر وسیع نیوکلیائی جنگ تک کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ تاریخی حوالے سے دہشت گردی کمزور کا ہتھیار ہے یعنی وہ جو روایتی فوجی طاقت کے مالک نہیں ہوتے۔ دوسری عالمی جنگ سے نیوکلیائی ہتھیار یہ حیثیت حاصل کر چکے ہیں کہ ان کے ذریعے کمزور اپنی روایتی کمتری کی تلافی کر سکتے ہیں۔ ماضی میں دہشت گرد صرف محدود تشدد ہی کر سکتے تھے کہیں چند لوگوں کو قتل کر دیا یا کسی جگہ کسی تنصیب کو تباہ کر دیا۔ وسیع تشدد کیلئے وسیع فوجی قوت درکار ہوتی تھی تاہم چند دہشت گرد وسیع تشدد اور وسیع تباہی کے اہل ہو جائیں گے۔ دہشت گردی اور نیوکلیائی ہتھیار غیر مغربی کمزور کے ہتھیار ہیں اگر اور جب یہ مل گئے غیر مغربی کمزور طاقتور ہو جائیں گے۔

مابعد سرد جنگ دنیا میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور ان کو پھینکنے کے ذرائع کی تیاری کی کوششیں اسلامی اور کنفیوشسی ریاستوں میں جاری ہیں۔ پاکستان اور شاید شمالی کوریا کے پاس تھوڑی تعداد میں نیوکلیائی ہتھیار موجود ہیں یا کم از کم انہیں تیزی سے تیار کر لینے کی اہلیت موجود ہے اور انہیں پھینکنے کیلئے لانگ رینج میزائل تیار کر چکے ہیں یا حاصل کر رہے ہیں۔ عراق کے پاس کیمیائی جنگ کی بڑی استعداد ہے نیز وہ حیاتیاتی اور نیوکلیائی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے بڑی کوششیں کر رہا ہے۔ ایران نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری کا ایک وسیع پروگرام رکھتا ہے نیز وہ انہیں پھینکنے کے ذرائع کی استعداد بڑھانے کیلئے سرگرم ہے۔ 1988ء میں صدر رفسنجانی نے کہا تھا کہ ایران ''دفاع اور حملہ

کرنے کے حوالے سے حیاتیاتی' کیمیائی اور ریڈیو لوجیکل ہتھیار تیار کرے گا۔" اور تین سال بعد اس کے نائب صدر نے ایک اسلامی کانفرنس کو بتایا "اسرائیل نیوکلیائی ہتھیاروں کا مالک ہے تو ہم مسلمانوں کو لازماً ایک ایٹم بم تیار کرنے کیلئے تعاون باہمی کرنا چاہئے اور اس حوالے سے اقوام متحدہ کی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی پالیسی کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔"

1992ء اور 1993ء میں امریکہ کے چوٹی کے انٹیلی جنس کے افسران نے کہا کہ ایران نیوکلیائی ہتھیار حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا ہے اور 1995ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ وارن کرسٹوفر نے واضح طور پر بیان دیا کہ "آج ایران نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے کی زبردست کوشش کر رہا ہے۔" دوسری مسلم ریاستیں بھی مبینہ طور پر نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں ان میں لیبیا' الجیریا اور سعودی عرب شامل ہیں۔ علی ماذوری کے رنگین الفاظ میں "کھمبی کے بادل کے اوپر ہلال" مغرب سمیت سب دوسروں کو دھمکا سکتا ہے۔ اسلام ختم کر سکتا ہے "روسی نیوکلیائی رولیٹ کھیلنا بشمول دوسری دو تہذیبوں ...... جنوبی ایشیا میں ہندوازم اور صیہونیت کے ساتھ نیز مشرق وسطٰی میں یہودیت کو سیاسی بنانے کے۔"

جہاں جہاں کنفیوشسی اسلامی روابط وسیع اور مضبوط ہیں وہاں وہاں ہتھیار سازی ہو رہی ہے۔ چین بہت سی مسلم ریاستوں کو روایتی اور غیر روایتی ہتھیار فراہم کرنے میں مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس میں شامل ہے الجیریا کے صحرا میں انتہائی خفیہ اور انتہائی سخت حفاظت کے تحت قائم ہونے والا نیوکلیائی ری ایکٹر جس کو بظاہر تحقیق کیلئے بنایا گیا ہے لیکن مغربی ماہرین کا پختہ یقین ہے کہ یہاں پلوٹونیم تیار کیا جاتا ہے' لیبیا کو کیمیائی ہتھیاروں کے مواد کی فروخت' سعودی عرب کو C55-2 میزائلوں کی فراہمی' نیوکلیائی ٹیکنالوجی یا مواد کی عراق' لیبیا' شام' اور شمالی کوریا کو فراہمی اور عراق کو بڑی تعداد میں روایتی ہتھیاروں کی فراہمی۔ چین کے ساتھ ساتھ شمالی کوریا نے 1990ء کی دہائی کے شروع میں شام کو سکڈ میزائل دیئے جو کہ ایران کے توسط سے پہنچائے گئے تھے اور پھر موبائل چیسز جن کے ذریعے انہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔

اسلامی کنفیوشسی ہتھیاروں کے تعاون میں مرکزی کردار ایک طرف تو چین اور کسی

حد تک شمالی کوریا کے درمیان رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان اور ایران۔ 1980ء سے 1991ء کے درمیان چین سے بڑی مقدار میں اسلحہ حاصل کرنے والے دو ملک پاکستان اور ایران تھے جبکہ عراق کا نمبر ان کے بعد آتا ہے۔ 1970ء کی دہائی کے شروع ہی میں چین اور پاکستان کے درمیان انتہائی خفیہ قریبی فوجی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ 1989ء میں دونوں ملکوں نے ''خریداری' مشترکہ تحقیق اور ترقی' مشترکہ تیاری' ٹیکنالوجی کے تبادلے کے ساتھ ساتھ مشترکہ معاہدوں کے تحت تیسرے ملکوں کو برآمد جیسے میدانوں میں تعاون'' کی دس سالہ مفاہمت کی یادداشت پر دستخط کیے۔ 1993ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کے تحت چینی پاکستانیوں کو اسلحہ کی خریداری کیلئے قرضے دیں گے۔ اس کے نتیجے میں ''چین پاکستان کا سب سے زیادہ با اعتماد اور فوجی سازوسامان' پاکستانی فوج کے ہر شعبے کیلئے کارآمد فوجی برآمدات کا بڑا فراہم کنندہ'' بن گیا۔ چین پاکستان کو جیٹ ہوائی جہاز' ٹینک' توپ خانہ اور میزائل تیار کرنے کیلئے پروڈکشن کی سہولیات فراہم کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ چین نے پاکستان کو نیوکلیائی ہتھیاروں کی صلاحیت کو ترقی دینے میں بنیادی نوعیت کی مدد دی ہے۔ اس نے افزودگی کیلئے یورینیم مہیا کی ہے' بم کے ڈیزائن کیلئے مشورے فراہم کئے ہیں اور امکان ہے کہ چین نے اپنی ٹیسٹ سائٹ میں پاکستان کو ایک نیوکلیائی ڈیوائس کے دھماکے کی اجازت دی ہے۔ چین نے امریکہ سے کئے گئے عہد کو توڑتے ہوئے پاکستان کو ایم 11 بیلسٹک میزائل دیئے ہیں جن کی رینج 300 کلومیٹر ہے اور جو نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھینکنے میں کام آ سکتے ہیں۔ اس کے بدلے میں پاکستان نے چین کو فضا میں دوبارہ ایندھن بھرنے کی ٹیکنالوجی اور سٹنگر میزائل دیئے ہیں۔

1990ء کی دہائی سے چین اور ایران کے درمیان بھی اسلحے کے حوالے سے تعلقات میں اضافہ ہوا ہے۔ 1980ء کی دہائی میں ہونے والی ایران عراق جنگ کے دوران میں چین نے ایران کو اس کے ہتھیاروں کا 22 فیصد فراہم کیا تھا اور 1989ء میں تو اس کو ہتھیار فراہم کرنے والا واحد سب سے بڑا ملک بن گیا۔ چین نے ایران کی کھلم کھلا اعلان کردہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے حصول کی پالیسی میں بھی فعال تعاون فراہم کیا ہے۔ ''ایک ابتدائی چین ایران

معاہدے'' پر دستخط کے بعد دونوں ملک جنوری 1990ء میں اس بات پر متفق ہو گئے کہ اگلے دس برسوں میں سائنسی تعاون کیا جائے گا اور فوجی ٹیکنالوجی کا تبادلہ ہو گا۔ ستمبر 1992ء میں صدر رفسنجانی نے ایرانی نیوکلیائی ماہرین کے ساتھ پاکستان کا دورہ کیا اور پھر چین گئے جہاں انہوں نے نیوکلیائی تعاون کے دوسرے معاہدے پر دستخط کئے نیز فروری 1993ء میں چین ایران میں 300 میگاواٹ کا نیوکلیائی ری ایکٹر تعمیر کرنے پر متفق ہو گیا۔ ان معاہدوں کے تحت چین نے ایران کو نیوکلیائی ٹیکنالوجی اور اطلاعات مہیا کیں۔ ایرانی سائنس دانوں اور انجنیئروں کو تربیت دی اور ایٹمی مواد افزودہ کرنے والا آلہ مہیا کیا۔ امریکہ کے مسلسل دباؤ کے بعد 1995ء میں چین دو 300 میگاواٹ کے ری ایکٹر کی فروخت امریکہ کے کہنے کے مطابق ''ملتوی'' اور چین کے کہنے کے مطابق ''معطل'' کرنے پر متفق ہو گیا۔ چین ایران کو میزائل اور میزائل ٹیکنالوجی مہیا کرنے والا بڑا ملک تھا۔ اس نے 1980ء کی دہائی میں شمالی کوریا کے ذریعے ایران کو ریشم کا کیڑا (سلک وارم) میزائل فراہم کئے ''اور درجنوں شاید سینکڑوں میزائلوں کی رہنمائی کے نظام اور کمپیوٹرائزڈ مشینی آلات مہیا کئے۔'' 1994ء-1995ء میں چین نے ایران کو زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائلوں کی تیاری کیلئے مدد دی۔ شمالی کوریا نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے ایران کو سکڈ میزائل بھیجے نیز ایران کو انہیں خود تیار کرنے کی سہولیات بھی فراہم کیں۔ 1993ء میں شمالی کوریا ایران کو اپنا 600 میل رینج والا نوڈونگ 1 میزائل دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس تکون کے تیسرے زاویے پر ایران اور پاکستان نیوکلیائی شعبے میں وسیع تعاون باہمی کو بڑھانے پر رضامند ہو گئے ہیں جس کے تحت پاکستان ایرانی سائنسدانوں کو تربیت دے گا۔ نیز پاکستان، ایران اور چین کے درمیان نومبر 1992ء میں نیوکلیائی منصوبوں پر مل کر کام کرنے کا معاہدہ ہوا۔ پاکستان اور ایران کو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری میں چین کی مدد سے صاف ثبوت ملتے ہیں کہ ان ملکوں کے مابین وابستگی اور تعاون باہمی کی سطح اور درجہ کیا ہے۔

ان سرگرمیوں اور ان سے مغربی مفادات کو درپیش پوشیدہ خطرات کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی روک تھام مغرب کے سلامتی کے

ایجنڈے پر سب سے پہلے آ گئی۔ مثال کے طور پر 1990ء میں 59 فیصد امریکی عوام سوچتے تھے کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا خارجہ پالیسی کا ایک اہم ہدف ہے۔ 1994ء میں 82 فیصد عوام اور 90 فیصد خارجہ پالیسی کے لیڈروں نے اسی رائے اور سوچ کا اظہار کیا۔ صدر کلنٹن نے 1993ء میں ہتھیاروں کی روک تھام کی پالیسی کو ترجیح دینے کا اعلان کیا اور 1994ء کے موسم خزاں میں ''قومی ایمرجنسی'' کا اعلان کیا جس کے تحت ''امریکہ کی قومی سلامتی' خارجہ پالیسی اور معیشت کو درپیش خطرات سے'' نمٹا جائے گا اور اس مقصد کے حصول کیلئے ''نیوکلیائی' حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں اور ایسے ہتھیاروں کو پھینکنے والے ذرائع کی روک تھام'' کی جائے گی۔ 1991ء میں سی آئی اے نے سو افراد پر مشتمل ہتھیاروں کی روک تھام کا ایک مرکز قائم کیا اور دسمبر 1993ء میں سیکرٹری آف ڈیفنس ایسپن نے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے اقدام کا اعلان کیا اور نیوکلیائی سلامتی اور ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام کے شعبے کیلئے ایک اسسٹنٹ سیکرٹری کا عہدہ بھی وضع کرنے کا اعلان کیا۔

سرد جنگ کے دوران میں امریکہ اور سوویت یونین ہتھیاروں کی ایک کلاسیک دوڑ میں شریک رہے اور تکنیکی حوالے سے زیادہ سے زیادہ بہتر نیوکلیائی ہتھیار اور ان کو پھینکنے کے ذرائع کی تیاری میں مصروف رہے۔ یہ تعمیر بمقابلہ تعمیر کی مثال ہے۔ مابعد سرد جنگ دنیا میں ہتھیاروں کا مرکزی مقابلہ ایک دوسری قسم کا ہے۔ مغرب کے دشمن بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں اور مغرب انہیں ایسا کرنے سے روکنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ یہ تعمیر بمقابلہ تعمیر کی نہیں بلکہ تعمیر بمقابلہ تعمیر سے روکنا کی مثال ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر مغرب کے نیوکلیائی اسلحہ خانے کی استعداد اور سائز اس مقابلے کا حصہ نہیں ہے۔ تعمیر بمقابلہ تعمیر کی دوڑ کا نتیجہ منحصر ہوتا ہے دونوں فریقوں کے وسائل اور کمٹمنٹ اور تکنیکی استعداد پر۔ اس کے متعلق پہلے سے کچھ طے شدہ نہیں ہوتا۔ تعمیر اور تعمیر سے روکنے کی دوڑ کے متعلق پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ مغرب کی تعمیر سے روکنے کی کوشش دوسرے معاشروں کی ہتھیاروں کی تیاری کے عمل کو سست کر سکتی ہے لیکن وہ اسے روک نہیں

سکتے ہیں۔ غیر مغربی معاشروں کی معاشی اور سماجی ترقی، ہتھیاروں، ٹیکنالوجی اور مہارت کی فروخت سے دولت کمانے کے مغربی اور غیر مغربی سب معاشروں کیلئے تجارتی محرکات نیز مرکزی ریاستوں اور علاقائی طاقتوں کے اپنی مقامی رعایا کو تحفظ دینے کے سیاسی مقاصد ان سب کی وجہ سے مغرب کی ہتھیار سازی کو روکنے کی کوششیں برباد ہو کے رہ گئی ہیں۔

مغرب ہتھیاروں کی روک تھام کی پالیسی کو بین الاقوامی نظام اور استحکام کے اندر تمام معاشروں کے مفادات کے حوالے سے فروغ دے رہا ہے تاہم دوسری قومیں ہتھیاروں کی روک تھام کو مغربی اجارہ داری کے مفادات کا تحفظ تصور کرتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے مغرب خصوصاً امریکہ کی ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر فکرمندی میں اختلافات ہیں دوسری طرف علاقائی طاقتوں کو اختلاف ہے جن کی سلامتی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے متاثر ہوئی ہے۔ کوریا کے حوالے سے یہ بات قابل غور ہے۔ 1993ء اور 1994ء میں امریکہ شمالی کوریا کے نیوکلیائی ہتھیاروں کے امکان کے حوالے سے ایک بحرانی صورتحال سے دوچار تھا۔ نومبر 1993ء میں صدر کلنٹن نے واضح طور پر کہا "شمالی کوریا کو نیوکلیائی بم بنانے کی اجازت دی نہیں جا سکتی ہے۔ ہم کو اس معاملے میں سختی برتنا ہو گی۔" سینیٹرز نمائندے اور سابق بش انتظامیہ کے افسران شمالی کوریا کی نیوکلیائی تنصیبات پر حملے کی ضرورت کی بات کر رہے ہیں۔ شمالی کوریا کے پروگرام کے حوالے سے امریکی فکرمندی ہتھیاروں کے عالمی پھیلاؤ پر فکرمندی سے براہ راست جڑی ہوئی ہے۔ نہ صرف اس قسم کی صلاحیت امریکہ کے مشرقی ایشیا میں اقدامات کو مشکل اور پیچیدہ بنا دے گی بلکہ اگر شمالی کوریا اپنی ٹیکنالوجی اور ہتھیار بیچ دیتا ہے تو اس سے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں امریکہ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف جنوبی کوریا اپنے علاقائی مفادات کے حوالے سے بم کے بارے میں سوچتا ہے۔ بہت سے جنوبی کوریائی شمالی کوریائی بم کو کوریائی بم کے طور پر دیکھتے ہیں جو کہ کبھی دوسرے کوریائیوں کے خلاف نہیں بلکہ جاپان اور دوسرے خفیہ خطرات سے نمٹنے کیلئے استعمال ہو گا۔ جنوبی کوریا کے سول اور فوجی افسر مستقبل میں اس صلاحیت کے مالک متحدہ

کوریا کے بارے میں کھلم کھلا سوچ رہے ہیں۔ شمالی کوریا کو بم کی تیاری کے اخراجات اور بین الاقوامی مذمت کا سامنا کرنا پڑے گا؟ جنوبی کوریا کو آخر کار لازماً یہ ورثے میں ملتے ہیں۔ شمالی نیوکلیائی ہتھیار اور جنوبی صنعتی ترقی ایک متحدہ کوریا کو مشرقی ایشیائی منظر (سین) کے ایک بڑے اداکار کے کردار کے حوالے سے سوچنے پر اکسا سکتی ہے۔ اس حوالے سے واضح اختلافات سامنے آتے ہیں۔ واشنگٹن 1994ء میں کوریائی جزیرہ نما میں ایک بڑے بحران کو دیکھ رہا تھا جبکہ سیول میں اس بحران کے حوالے سے کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ اس سے دونوں دارالحکومتوں کے مابین ایک ''تکلیف دہ خلا'' نمودار ہوا۔ ایسا خلا امریکی سلامتی مفادات اور جنوبی ایشیائی علاقائی طاقتوں کے مابین نمودار ہوا ہے۔ امریکہ وہاں ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر علاقہ کے باشندوں سے زیادہ فکرمند ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کے نیوکلیائی خطرے کو قبول کرنا آسان سمجھتے ہیں بہ نسبت دونوں خطروں کو کیپ کرنے' مختصر کرنے یا بالکل ختم کرنے کی امریکی تجاویز کو قبول کرنے کے۔

بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے ''مساوی کرنے والے'' کے طور پر پھیلاؤ کو روکنے کی امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی کوششیں محدود کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی کامیابی آئندہ بھی محدود ہی ہوگی۔ صدر کلنٹن کے اعلان کہ شمالی کوریا کو نیوکلیائی ہتھیار بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ایک ہی ماہ بعد امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اس کو رپورٹ پیش کی کہ اس کے پاس ایک یا دو بم ہونے کا امکان ہے۔ امریکی پالیسی میں نتیجتاً یہ تبدیلی ہوئی کہ اس نے شمالی کوریا سے اپنے نیوکلیائی اسلحہ خانے کو بڑھانے سے روکنے کی درخواست شروع کی۔ امریکہ تو ہندوستان اور پاکستان کو نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے سے روکنے یا اس عمل کو واپس کرنے پر آمادہ کرنے کا بھی اہل نہیں تھا نیز وہ ایران کی نیوکلیائی پیش رفت کو بھی روکنے کا اہل نہیں ہے۔ اپریل 1995ء میں نیوکلیائی ہتھیاروں کی روک تھام کے معاہدے (NPT) کی کانفرنس کا بنیادی مسئلہ ہی یہ تھا کہ کیا اس کو 25 ں کیلئے بڑھایا جائے یا لامحدود مدت کیلئے۔ امریکہ نے مستقل توسیع کی کوشش پر سب ے زیادہ زور دیا۔ تاہم دوسرے بہت سے ملکوا ں نے اس بات پر زور دیا کہ

ایسی توسیع اسی وقت کی جائے جب پانچوں تسلیم شدہ نیوکلیائی طاقتیں اپنے نیوکلیائی ہتھیاروں میں بہت زیادہ کمی کر دیں۔ مزید یہ کہ مصر نے اس وقت تک توسیع کی مخالفت کا اعلان کیا جب تک اسرائیل معاہدے پر دستخط نہ کرے اور حفاظتی نگرانی کو قبول نہ کرے۔ آخر میں یہ کہ امریکہ بازو مروڑنے' رشوت اور دھمکی دینے کی انتہائی کامیاب حکمت عملی کے ذریعے لامحدود توسیع کو بھرپور اتفاق رائے سے منظور کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ مصر اور میکسیکو دونوں لامحدود مدت تک توسیع کی مخالفت کے باوجود امریکہ پر اپنے معاشی انحصار کی وجہ سے اس کی حمایت پر مجبور ہیں معاہدے کی اتفاق رائے سے توسیع ہو رہی تھی تو سات مسلم قوموں (شام' اردن' ایران' عراق' لیبیا' مصر اور ملائیشیا) کے نمائندوں اور ایک افریقی قوم (نائیجیریا) کے نمائندے نے آخری مباحثے میں اختلافی سوچ کا اظہار کیا۔

1993ء میں مغرب کے بنیادی مقاصد جیسا کہ امریکی پالیسی میں بیان کیے گئے تھے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام سے تبدیل ہو کر جوابی ہتھیار سازی ہو گئے۔ یہ تبدیلی اس بات کا حقیقت پسندانہ اعتراف تھا کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر امریکی حکومت کا سرد جنگ کے زمانے کا یہ خیال بدل جائے کہ ہتھیاروں کا پھیلاؤ امریکی اور مغربی مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے تو جوابی ہتھیار سازی کی پالیسی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے نمٹنے کے دوسرے ذرائع کی طرف بدل سکتی ہے۔ تاہم 1995ء میں امریکہ اور مغرب روک تھام کی پالیسی پر گامزن رہے جو کہ آخرکار ناکام ہی ہونی ہے۔ نیوکلیائی اور دوسرے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیارں کے پھیلاؤ کی روک تھام کثیر التہذیبی دنیا کے اندر ایک آہستہ رو مگر ناگزیر مرکزی مظہر ہے۔

انسانی حقوق اور جمہوریت

1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی کے دوران میں تیس سے زیادہ ملک آمریت سے جمہوری سیاسی نظام کی طرف آئے۔ اس تبدیلی کی لہر کی بہت سی وجوہات تھیں۔ معاشی ترقی ان سیاسی تبدیلیوں کو پیدا کرنے والے اہم عوامل میں سے ایک تھی۔ تاہم اس کے علاوہ

امریکہ، بڑی مغربی یورپی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں کی پالیسیوں کی وجہ سے سپین، پرتگال، بہت سے لاطینی امریکی ملکوں، فلپائن، جنوبی کوریا اور مشرقی یورپ میں جمہوریت کے آنے میں مدد ملی۔ جمہوریت ان ملکوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہی جن میں عیسائی اور مغربی اثرات مضبوط تھے۔ نئی جمہوری حکومتیں ان جنوبی اور وسطی یورپی ملکوں میں ابھریں جو کیتھولک یا پروٹسٹنٹ تھے اور قدرے کم یقینی طور پر لاطینی امریکی ملکوں میں۔ مشرقی ایشیا میں کیتھولک اور زبردست امریکی اثرات والا ملک فلپائن 1980ء کی دہائی میں جمہوریت کی طرف واپس آیا جبکہ تائیوان اور جنوبی کوریا میں عیسائی لیڈر جمہوریت کیلئے تحریک چلا رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا گیا ہے سابق سوویت یونین کے اندر، بالٹک جمہوریائیں، جمہوریت کو استحکام دے رہی ہیں۔ آرتھوڈوکس ملکوں میں درجہ اور استحکام متغیر اور غیر یقینی ہے۔ وسط ایشیائی مسلم جمہوریاؤں میں جمہوری امکانات معدوم ہیں۔ 1990ء کی دہائی سے، کیوبا کے علاوہ بہت سے ملکوں میں جمہوری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔

ان تبدیلیوں اور سوویت یونین کے اقدام نے مغرب، خصوصاً امریکہ میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ عالمی (گلوبل) جمہوری انقلاب واقع ہو رہا ہے نیز یہ کہ انسانی حقوق کے مغربی تصورات اور سیاسی جمہوریت کی مغربی صورتیں ساری دنیا میں جلد ہی چھانے کو ہیں۔ لہٰذا مغرب والوں کا سب سے زیادہ ترجیحی مقصد ہی جمہوریت کے اس پھیلاؤ کو فروغ دینا طے پا گیا ہے۔ بش انتظامیہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر نے اپریل 1990ء میں یہ اعلان کر کے مذکورہ بالا صداقت کو عیاں کیا کہ "جمہوریت تحدید سے ماوراء ہے۔" نیز مابعد سرد جنگ دنیا کیلئے "صدر بش نے ہمیں نیا مشن سونپا ہے کہ جمہوریت کو فروغ اور استحکام بخشا جائے۔" بل کلنٹن نے اپنی 1992ء کی مہم کے دوران میں مسلسل کہا کہ جمہوریت کا فروغ کلنٹن انتظامیہ کی سب سے پہلی ترجیح ہوگی نیز جمہوریت کا فروغ خارجہ پالیسی کا وہ واحد موضوع تھا جس کیلئے اس نے اپنی ساری مہم کی اہم تقریر مختص کی تھی۔ اقتدار میں آ کر اس نے جمہوریت کیلئے قومی فنڈ میں دو تہائی اضافہ کیا تھا۔ اس کے قومی سلامتی کے اسسٹنٹ نے خارجہ پالیسی کے مرکزی خیال کو یوں واضح کیا تھا "جمہوریت کا پھیلاؤ" نیز اس کے

سیکرٹری آف ڈیفنس نے جمہوریت کے فروغ کو چار بڑے اہداف میں سے ایک ہدف قرار دیا تھا اور اپنے شعبے میں اس ہدف کو پانے کیلئے ایک سینئر آسامی تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی۔ قدرے کم درجے میں اور قدرے کم واضح انداز سے' انسانی حقوق اور جمہوریت کا فروغ یورپی ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں میں بھی ایک بظاہر اہم کردار پاتا دکھائی پڑتا ہے نیز مغربی کنٹرول والے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ترقی پذیر ملکوں کو دیئے جانے والے قرضوں اور گرانٹوں میں بھی۔

1995ء میں ان اہداف کو پانے کی یورپی اور امریکی کوششیں کم کامیاب ہوئیں۔ قریباً ساری ہی غیر مغربی تہذیبیں مغرب کے اس دباؤ کی مزاحمت کرتی ہیں۔ ان میں ہندو' آرتھوڈوکس' افریقی اور کسی حد تک لاطینی ملک بھی شامل ہیں۔ تاہم مغرب کی جمہوریت پھیلانے کی کوششوں کی سب سے زیادہ مزاحمت اسلام اور ایشیا نے کی ہے۔ اس مزاحمت کی جڑیں اسلام کے احیا اور ایشیائی خودشناسی میں رونما ہونے والی ثقافتی ادعائیت ہے۔

امریکہ کی ایشیا کے حوالے سے ناکامی بنیادی طور پر ایشیائی حکومتوں کی بڑھتی ہوئی خودمختاری اور معاشی ثروت سے پھوٹی ہے۔ ایشیائی تشہیر کار مغرب کو مسلسل باور کرواتے رہتے ہیں کہ انحصار اور اطاعت کا پرانا دور اب ماضی کا حصہ بن گیا ہے نیز مغرب جو 1940ء کی دہائی میں دنیا کی معاشی پیداوار کا نصف پیدا کرتا تھا' اقوام متحدہ پر غلبہ رکھتا تھا اور جس نے انسانی حقوق کا آفاقی اعلامیہ تحریر کیا تھا اب تاریخ میں غائب ہو چکا ہے۔ ایک سنگاپوری اہلکار نے کہا ''ایشیا میں انسانی حقوق کے فروغ کیلئے کوششیں مابعد سرد جنگ دنیا کے اندر طاقت کی تقسیم سے لازماً بری طرح متاثر ہوں گی ...... مغرب کی مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا پر بالادستی اور گرفت کم ہو گئی ہے۔''

اس کا کہنا درست ہے۔ امریکہ کا شمالی کوریا کے ساتھ نیوکلیائی معاملات پر معاہدہ درست الفاظ میں ''مذاکراتی سقوط'' قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ چین اور دوسری ایشیائی طاقتوں کے ساتھ انسانی حقوق کے مسائل پر معاہدے امریکہ کا غیر مشروط سقوط ہے۔ امریکہ چین کو دھمکیاں دیتا رہا کہ اگر انسانی حقوق میں مزید پیش رفت نہیں کی تو امریکہ اسے سب سے

پسندیدہ قوم کا درجہ عطا نہیں کرے گا۔ ان دھمکیوں کے بعد کلنٹن انتظامیہ نے اپنے سیکرٹری آف سٹیٹ کو بیجنگ میں یوں ذلت اٹھاتے ہوئے دیکھا کہ چین نے اپنی سابقہ پالیسی ترک نہ کرنے کا اعلان کیا نیز ایم ایف این سٹیٹس کو انسانی حقوق سے الگ کرنے پر زور دیا۔ امریکہ کی کمزوری کے اس مظاہرے پر چین نے اپنے اس رویے کو جاری رکھنے اور شدت دینے کا عمل روا رکھا جس پر کہ کلنٹن انتظامیہ کو اعتراض تھا۔ امریکی انتظامیہ کو ایسی ہی پسپائی سنگاپور میں ایک امریکی شہری پر تشدد کے معاملے میں اور انڈونیشیا میں مشرقی تیمور میں تشدد کے معاملے میں اختیار کرنی پڑی۔

ایشیائی حکومتوں کے مغرب کے انسانی حقوق کے حوالے سے دباؤ کی مزاحمت کرنے کو بہت سے عوامل کی وجہ سے بڑھاوا ملا ہے۔ امریکی اور یورپی کاروباری افراد ان ملکوں میں اپنی تجارت کے پھیلاؤ کے حوالے سے اضطراری مایوسی کا شکار ہیں اور وہ ان تیزی سے ترقی پاتے ہوئے ملکوں میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی اپنی حکومتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کا دباؤ ہمارے معاشی تعلقات میں خلل ڈالنے کا سبب نہیں بننا چاہئے۔ ایشیائی ممالک اس طرح کے دباؤ کو اپنی خودمختاری میں مداخلت سمجھتے ہیں اور جب یہ مسائل ابھرتے ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ جاپانی' تائیوانی اور ہانگ کانگ کے کاروباری افراد جنہوں نے چین کے اندر بھاری سرمایہ کاری کی ہوئی ہے چاہتے ہیں کہ امریکہ چین کی ایم ایف این مراعات بحال کرے۔ جاپانی حکومت بھی امریکی انسانی حقوق کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتی ہے۔ وزیراعظم کیچی میازاوا نے تیان آن من چوک کے واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کہا تھا کہ ہم "انسانی حقوق کے ایسے مجرد تصورات" کو چین کے ساتھ اپنے تعلقات خراب کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آسیان کے ملک میانمار پر دباؤ ڈالنے پر رضامند نہیں تھے اور بہرحال 1994ء میں فوجی جنتا کو اپنی میٹنگ میں خوش آمدید کہا جبکہ جیسا کہ یورپی یونین کے ترجمان نے تسلیم کیا کہ اس کی پالیسی بہت کامیاب نہیں رہی ہے اور یہ کہ اسے آسیان کی میانمار کے حوالے سے سوچ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ مزید یہ کہ ان کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت نے ان ریاستوں کو آزادی دی ہے کہ مثلاً ملائیشیا اور

انڈونیشیا خود پر تنقید کرنے والے ملکوں اور فرموں پر جوابی شرط عائد کردیں۔

مجموعی طور پر ایشیائی ملکوں کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت نے انہیں انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالے سے بڑھتے ہوئے مغربی دباؤ کے مقابلے میں محفوظ بنا دیا ہے۔ رچرڈنکسن نے 1994ء میں کہا تھا ''آج چین کی معاشی طاقت نے امریکہ کے انسانی حقوق کے حوالے سے لیکچروں کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک دہائی کے اندر اندر یہ غیر متعلق ہو کر رہ جائیں گے۔ دو دہائیوں کے اندر اندر یہ انہیں مضحکہ خیز بنا دیں گے۔'' تاہم وقت کے ساتھ ساتھ چینی معاشی ترقی مغربی لیکچروں کو غیر ضروری بنا سکتی ہے۔ معاشی ترقی نے ایشیائی ملکوں کو مغربی ملکوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔ آئندہ دور میں یہ ایشیائی معاشروں کو مغربی حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط کرے گی۔ اگر ایشیائی ملکوں میں جمہوریت آئی تو اس کا سبب بڑھتی ہوئی مضبوط ایشیائی بورژوازی اور متوسط طبقہ ہوگا جو چاہتا ہوگا کہ جمہوریت آئے۔

این پی ٹی میں لامحدود توسیع کے برخلاف اقوام متحدہ کے اداروں میں مغرب کی انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالے سے کوششیں صفر رہی ہیں۔ چند ایک مستثنیات کے ساتھ' جیسا کہ عراق کی مذمت کرنے والی قراردادوں کے علاوہ' اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کے حوالے سے قراردادوں کی مخالفت ہی میں ووٹ پڑے ہیں۔ کچھ لاطینی امریکی ملکوں کے علاوہ دوسری حکومتیں ''انسانی حقوق کی سامراجیت'' کے فروغ کی کوششوں کا حصہ بننے سے ہچکچاتی ہیں۔ مثال کے طور پر 1990ء میں سویڈن نے بیس مغربی ملکوں کی جانب سے میانمار میں فوجی اقتدار کی مذمت کی قرارداد پیش کی لیکن ایشیائی اور دوسرے ملکوں کی مخالفت نے اس کو ''قتل'' کر دیا۔ انسانی حقوق کی توہین کے حوالے سے ایران کے خلاف آنے والی قراردادوں کو بھی مسترد کر دیا گیا نیز 1990ء کی دہائی کے پانچ برسوں میں چین انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے اپنے خلاف آنے والی مغربی حمایت کی حامل قراردادوں کو ایشیائی ملکوں کی حمایت سے مسترد کرنے میں کامیاب رہا۔ 1994ء میں پاکستان نے ہندوستان کے خلاف کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر قرارداد پیش کی جس کی ہندوستان کے دوست

ملکوں نے تو مخالفت کرنا ہی تھی چین اور ایران جیسے پاکستان کے دوست ملکوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں خود ایسی قراردادوں کا ہدف بنے ہوئے تھے اور انہوں نے پاکستان کو بھی اس قرارداد کی واپسی کا مشورہ دیا۔ اکنامسٹ نے تبصرہ کیا کہ کشمیر میں درندگی کے حوالے سے ہندوستان کی مذمت میں ناکامی کے بعد اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے "یکطرفہ طور پر اس کی منظوری دے دی۔" دوسرے ملک ترکی' انڈونیشیا' کولمبیا اور الجیریا سب کے سب تنقید سے بچ گئے ہیں۔ لہٰذا کمیشن ان حکومتوں کی حمایت کر رہا ہے جو درندگی اور تشدد کر رہی ہیں جو کہ اس کمیشن کے خالقوں کے حقیقت میں مطلوب مقاصد کا الٹ ہیں۔

مغرب اور دوسری تہذیبوں کے درمیان انسانی حقوق کے حوالے سے اختلافات اور مغرب کے اپنے اہداف کے حصول کی محدود صلاحیت کا انکشاف ویانا میں جون 1993ء میں منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی عالمی کانفرنس میں ہوا۔ ایک طرف تو یورپی اور شمالی امریکی ملک تھے اور دوسری طرف قریباً پچاس غیر مغربی ریاستوں کا بلاک تھا جس کے پندرہ فعال ترین ارکان میں ایک لاطینی امریکی ملک کی حکومت (کیوبا)' ایک بدھ ملک (میانمار)' چار کنفیوشسی ملک جن میں سیاسی نظریات' معاشی نظاموں اور ترقی کے درجوں کے حوالے سے اختلافات ہیں۔ (سنگاپور' ویتنام' شمالی کوریا اور چین) اور نو مسلم ملک (ملائیشیا' انڈونیشیا' پاکستان' ایران' عراق' شام' یمن' سوڈان اور لیبیا) شامل تھے۔ اس ایشیائی اسلامی گروپ بندی کی لیڈر شپ چین' شام اور ایران نے کی تھی۔ ان دو گروپ بندیوں کے درمیان کیوبا کے علاوہ لاطینی امریکی ملک تھے جو اکثر مغرب کی حمایت کرتے ہیں نیز افریقی اور آرتھوڈوکس ملک تھے جو کبھی کبھار تو حمایت کرتے ہیں تاہم اکثر اوقات مغربی پوزیشنوں (موقفوں) کی مخالفت کرتے ہیں۔

وہ مسائل جن پر ملکوں میں تہذیبی خطوط پر تقسیم رونما ہوئی ہے ان میں شامل ہیں انسانی حقوق کے حوالے سے آفاقیت بمقابلہ ثقافتی تعلق داری' معاشی اور سماجی حقوق بشمول ترقی کے حق کو ترجیح بمقابلہ سیاسی اور شہری حقوق' معاشی تعاون کے حوالے سے سیاسی مشروطیت' اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمشنر کی تخلیق' انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں کو جو ویانا میں اجلاس کر رہی

تھیں؛ حکومتی کانفرنس میں شرکت کی اجازت دینا' کانفرنس کی خصوصی حقوق کی منظوری نیز زیادہ خاص معاملات و مسائل جیسے کہ دلائی لاما کو کانفرنس سے خطاب کی اجازت دینی چاہئے؟ اور آیا بوسنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی کھلم کھلا مذمت کی جانی چاہئے؟

ان مسائل کے حوالے سے مغربی ملکوں اور ایشیائی اسلامی بلاک کے مابین بڑے اختلافات موجود ہیں۔ ویانا کانفرنس سے دو مہینے پہلے ایشیائی ملکوں نے بنکاک میں میٹنگ کی اور ایک اعلامیے کی منظوری دی جس میں زور دیا گیا تھا کہ انسانی حقوق کو ''قومی اور علاقائی خصوصیات نیز مختلف تاریخی' مذہبی اور ثقافتی پس منظروں کے تناظر میں'' دیکھا جانا ضروری ہے۔ اعلامیے میں زور دے کر کہا گیا کہ انسانی حقوق کی مانیٹرنگ سے ریاستوں کی خودمختاری مجروح ہو رہی ہے نیز یہ کہ معاشی امداد کو انسانی حقوق سے مشروط کرنے سے ترقی کے حق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ ان اور دوسرے مسائل پر اختلافات اس قدر بڑے تھے کہ مئی میں جنیوا میں ہونے والی پری ویانا کانفرنس تیاری میٹنگ میں تیار ہونے والی ساری دستاویز میں ایک یا ایک سے زیادہ ملکوں کی اختلافی آرا بریکٹوں میں درج تھیں۔

ویانا کیلئے مغربی اقوام کی تیاری مجہول تھی۔ وہ کانفرنس میں کسی گنتی میں نہیں تھیں اور اس کے اجلاسوں کے دوران میں اپنے مخالفین کے مقابلے میں زیادہ رعایتیں دے رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کی بھرپور منظوری کے علاوہ کانفرنس کی طرف سے منظور کیا گیا اعلامیہ حقیر سا ہی تھا۔ ایک انسانی حقوق کے حامی نے تبصرہ کیا کہ وہ ایک ''متنازع اور اختلافی'' دستاویز تھا نیز ایشیائی اسلامی اتحاد کی فتح اور مغرب کی شکست کی نمائندگی کرتا تھا۔ ویانا اعلامیے میں تقریر' پریس' اجتماع اور مذہب کی آزادی کے حقوق کی واضح منظوری نہیں ہے لہٰذا وہ بہت سے حوالوں سے 1948ء میں منظور ہونے والے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے آفاقی اعلامیے سے کمزور تھا۔ یہ تبدیلی مغرب کی طاقت میں زوال کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک امریکی انسانی حقوق کے حامی نے کہا ''1945ء کا انسانی حقوق کا دور اب ختم ہو گیا ہے۔ امریکی برتری ختم ہو گئی ہے۔ 1992ء کے واقعات کے باوصف یورپ ایک جزیرہ نما سے بھی کم ہو کر رہ گیا ہے۔ دنیا جو کہ مغربی تھی اب عرب' ایشیائی اور افریقی ہو گئی ہے۔ دوسری عالمی

جنگ کے فوری بعد کے زمانے کے برعکس آج انسانی حقوق کا آفاقی اعلامیہ اور بین الاقوامی معاہدے کم اہم ہو گئے ہیں۔" مغرب کا ایک ایشیائی نقاد بالکل اسی طرح کہتا ہے: "1948ء میں منظور ہونے والے انسانی حقوق کے آفاقی اعلامیے کے بعد پہلی مرتبہ ملکوں نے یہودیت و عیسائیت کی مکمل حمایت ظاہر نہیں کی اور فطری قانون کی روایات پہلے درجے میں آ گئی ہیں۔ یہ بینظیر صورتحال انسانی حقوق کی نئی بین الاقوامی سیاست کو طے کرے گی۔ اس سے جھگڑوں کے مواقع میں بھی بہت اضافہ ہوگا۔"

ایک اور تبصرہ نگار کا کہنا تھا "ویانا کا بڑا فاتح' واضح طور پر چین تھا۔ اگر کامیابی بے دھڑک لوگوں سے بات کرنے ہی کو کہتے ہیں تو چین کامیاب ہوا۔ وہ ساری میٹنگ کے دوران اپنے وزن کو ادھر سے ادھر منتقل کرتا رہا۔" تاہم مغرب ویانا میں مسترد ہونے کے بعد چین کے خلاف ایک اہم فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گرمائی اولمپکس 2000ء کیلئے بیجنگ کو منتخب کروانا چینی حکومت کا ایک بڑا ہدف تھا۔ اس نے اس کے حصول کیلئے بے پناہ ذرائع استعمال کئے۔ چین کے اندر اس حوالے سے بہت زیادہ تشہیر (پبلسٹی) کی گئی تھی اور عوام کی توقعات بہت زیادہ تھیں۔ حکومت نے دوسرے ملکوں کے ساتھ لابنگ کی کہ وہ اپنی اولمپک ایسوسی ایشنوں پر دباؤ ڈالیں۔ ہانگ کانگ اور تائیوان اس مہم میں اس کے ہمراہ تھے۔ دوسری طرف امریکی کانگرس' یورپی پارلیمنٹ اور انسانی حقوق کی تنظیموں بھی نے مل کر بیجنگ کو منتخب کرنے کی بھرپور مخالفت کی۔ اگرچہ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی میں ووٹنگ خفیہ ہوتا تھی تاہم یہ واضح طور پر تہذیبی خطوط پر ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی ووٹنگ میں افریقی ملکوں کی وسیع حمایت سے بیجنگ پہلی پوزیشن پر تھا اور سڈنی دوسری پر۔ دوسرے انتخاب میں جب استنبول غائب ہو گیا تھا کنفیوشسی اسلامی اتحاد نے بیجنگ کو زبردست ووٹ دلوائے۔ جب برلن اور مانچسٹر میدان سے ہٹ گئے تو ان کے ووٹ سڈنی کو ملے اور اسے چوتھے انتخاب میں فتح جبکہ چین کو ذلت آمیز شکست ہو گئی جس کیلئے اس نے امریکہ پر برملا الزام لگایا۔ لی کوان یو نے تبصرہ کیا "امریکہ اور برطانیہ چین کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے...... بظاہر وجہ "انسانی حقوق" تھے۔ حقیقی وجہ سیاسی تھی' مغرب کا سیاسی اثر و رسوخ دکھانا تھا۔" بے شک دنیا میں بہت

زیادہ لوگ انسانی حقوق کے مقابلے میں کھیلوں سے وابستہ ہیں تاہم مغرب کو ویانا اور دوسری جگہوں پر شکستیں اٹھانے کے بعد یہ مغربی فتح مغرب کی کمزوری کا بھی آئینہ دار تھی۔

نہ صرف مغربی ادعا بلکہ جمہوریت کے پیراڈاکس نے بھی مابعد سرد جنگ دنیا میں مغرب کے جمہوریت پھیلانے کے ارادے کو کمزور کیا ہے۔ سرد جنگ کے دوران میں مغرب اور امریکہ خصوصی طور پر ''دوستانہ جبر'' کے مسئلے سے نبرد آزما تھے یعنی فوجی جنتاؤں اور آمروں سے تعاون کے مخمصے سے، جو کہ کمیونسٹ مخالف تھے اور لہٰذا سرد جنگ میں فائدہ مند ساتھی تھے۔ اس طرح کے تعاونوں سے دشواریاں پیدا ہوئیں اور بعض اوقات شرمندگی نے بھی جنم لیا کہ جب ان حکومتوں نے انسانی حقوق کی سخت پامالی شروع کر دی تاہم تعاون کو کم تر برائی کی اصطلاح سے جواز فراہم کیا گیا یعنی یہ حکومتیں کمیونسٹ حکومتوں سے کم جابرانہ تھیں نیز دیرپا نہیں تھیں اور امریکی اور دوسرے بیرونی اثرات کیلئے زیادہ احساس قبولیت رکھتی تھیں۔ کیوں نہ ایک کم سفاک دوست جابر سے تعاون کیا جاتا جبکہ متبادل ایک زیادہ سفاک غیر دوست جابر تھا؟ مابعد سرد جنگ دنیا میں ایک دوست جابر اور ایک غیر دوست جمہوریت میں انتخاب بہت مشکل ہو گیا ہے۔ مغرب کا یہ مفروضہ کہ جمہوری انداز سے منتخب شدہ حکومتیں مغرب نواز اور تعاون کرنے والی ہوں گی غیر مغربی معاشروں میں درست ہونا ضروری نہیں جہاں انتخابی مقابلے مغرب دشمن قوم پرستوں اور بنیاد پرستوں کو اقتدار میں لا سکتے ہیں۔ مغرب کو حمایت کرنی پڑی جب 1992ء میں الجیریائی فوج نے مداخلت کی اور انتخاب ملتوی کر دیے جن میں بنیاد پرست ایف آئی ایس واضح طور پر جیتنے والی تھی۔ مغربی حکومتوں کو دوبارہ یقین دہانی کروانا پڑی جب ترکی میں بنیاد پرست ویلفیئر پارٹی (رفاہ پارٹی) اور ہندوستان میں قوم پرست بی جے پی 1995ء اور 1996ء میں انتخاب میں فتح حاصل کرنے کے بعد اقتدار سے ہٹائی گئیں۔ دوسری طرف ایران میں اس کے انقلاب کے تناظر میں اسلامی دنیا کے اندر بعض حوالوں سے زیادہ جمہوری حکومتیں رہیں نیز بہت سے عرب ملکوں بشمول سعودی عرب اور مصر میں مقابلہ جاتی انتخابات میں مغربی مفادات کی کم دوست حکومتیں منتخب ہوئیں۔ حالانکہ ان کے غیر جمہوری پیش رو ایسے نہیں

تھے۔ چین میں ایک عوامی طور پر منتخب حکومت مکمل طور پر قوم پرست ہوتی ہے۔ جیسا کہ مغربی لیڈر اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ غیر مغربی معاشروں میں جمہوری عمل اکثر مغرب کیلئے غیر دوستانہ حکومتیں پیدا کرتے ہیں۔ وہ دونوں ان انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ان ملکوں میں جمہوریت پھیلانے کے اپنے جوش اور ولولے سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

ترکِ وطن (امیگریشن)

صدیوں پہلے پیداوار کی مختلف شرحوں' معاشی صورتحال اور حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے یونانیوں' یہودیوں' جرمن قبیلوں' نوروں' ترکوں' روسیوں' چینیوں اور دوسروں کو بڑے پیمانے پر ایک ملک سے دوسرے ملک جانا پڑا۔ چند مثالوں میں یہ سرگرمیاں پرامن رہیں جبکہ دوسری میں بہت زیادہ پرتشدد تاہم انیسویں صدی کے یورپی ...... مداخلت کاری کی ماسٹر نسل تھے۔ 1821ء سے 1924ء کے درمیان ساڑھے پانچ کروڑ یورپی لوگوں نے سمندر پار مائیگریشن کی جن میں تین کروڑ چالیس لاکھ امریکہ گئے تھے۔ مغربیوں نے دوسرے لوگوں کو فتح کیا اور بعض اوقات نیست و نابود کر دیا۔ کم آبادی والے علاقوں کو دریافت کر کے وہاں آباد کاری کی۔ سولہویں اور بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں مغرب کے عروج کا واحد سب سے زیادہ اہم سبب لوگوں کی برآمد تھا۔

بیسویں صدی کے آخر نے مائیگریشن میں ایک مختلف اور اسی طرح کی بڑی لہر دیکھی۔ 1990ء میں قانونی طور پر بین الاقوامی مائیگرنٹ (ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے والے) 100 ملین تھے۔ پناہ گزین (ریفیوجی) 19 ملین اور غیر قانونی مائیگرنٹ شاید 10 ملین مزید تھے۔ مائیگریشن کی اس نئی لہر کا سبب نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ' نئی ریاستوں کا قیام اور ریاستوں کی وہ پالیسیاں تھیں جو لوگوں کو حرکت کرنے پر مجبور یا ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ تاہم یہ جدیدیت اور ٹیکنالوجیکل ترقی کا نتیجہ بھی تھی۔ ٹرانسپورٹ کی ترقیوں نے مائیگریشن کو آسان تر' تیز تر اور سستا بنا دیا' مواصلاتی ترقیوں نے معاشی مواقع

کی جستجو کو بڑھاوا دیا اور مائیگرنٹ اور ان کے خاندانوں کے درمیان رابطوں کو بڑھایا۔ جس طرح انیسویں صدی میں مغرب میں معاشی ترقی نے امیگریشن کو بڑھایا تھا اسی طرح بیسویں صدی میں غیر مغربی معاشروں میں معاشی ترقی نے امیگریشن کو بڑھایا۔ مائیگریشن ایک خود نافذ کردہ عمل بن گئی۔ مارُون وائنز کہتا ہے "اگر مائیگریشن کا واحد قانون ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک مائیگریشن بہاؤ جب ایک دفعہ شروع ہوتا ہے تو خود ہی اپنے بہاؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ وطن ترک کرنے والے (مائیگرنٹس) اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو ترک وطن کیلئے اطلاعات بہم پہنچا کر' سفر کی سہولیات اور وسائل مہیا کر کے اور ملازمت اور رہائش تلاش کرنے میں تعاون کر کے انہیں مائیگریشن کے قابل بناتے ہیں۔" اس کے الفاظ میں نتیجہ یہ نکلا ہے کہ "ترک وطن کا عالمی بحران" پیدا ہو گیا۔ مغرب کے لوگ مستقلاً اور بھرپور انداز میں نیو کلیائی پھیلاؤ کی مخالفت اور جمہوریت اور انسانی حقوق کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس امیگریشن (ترک وطن) کے حوالے سے ان کے نظریات بدلے ہیں اور بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں خصوصاً تبدیل ہوتے ہوئے توازن کے ساتھ بدلے ہیں۔ 1970ء کی دہائی تک یورپی ملک عمومی طور پر امیگریشن کے حوالے سے مثبت رویے کے حامل تھے اور کچھ مثالوں میں تو' زیادہ قابل توجہ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ' مزدوروں کی کمیابی کو دور کرنے کیلئے اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ امریکہ نے 1965ء میں 1920 سے چلے آرہے یورپی نہاد کوٹے ختم کر دیئے اور اس کے قوانین پر سختی سے نظر ثانی کی اور 1970ء اور 1980ء کی دہائی میں ترک وطن کرنے والوں کے نئے ذرائع ڈھونڈے اور مائیگریشن میں بہت زیادہ اضافے کو ممکن بنایا تاہم 1980ء کی دہائی کے آخر سے بیروزگاری کی زیادہ شرح' وطن ترک کر کے آنے والوں کی بہت بڑی تعداد اور ان کے نمایاں "غیر یورپی" کردار کی وجہ سے یورپی رجحانات اور پالیسی میں واضح تبدیلیاں آئیں۔ چند ہی برسوں کے بعد ایسی ہی دشواریوں کی وجہ سے امریکہ میں بھی قابل موازنہ تبدیلی آئی۔

بیسویں صدی کے آخر کے وطن ترک کرنے والوں (مائیگرنٹس) اور پناہ گزینوں (ریفوجیز) کی اکثریت نے ایک غیر مغربی معاشرے سے دوسرے کی طرف سفر کیا تھا

تاہم مغربی معاشروں کی طرف وطن [illegible] کرنے والوں کی تعداد انیسویں صدی کے مغربی ترک وطن کرنے والوں کی مطلق تعداد تک پہنچ گئی۔ 1990ء میں امریکہ میں 2 کروڑ پہلی نسل کے ترک وطن کرنے والے تھے۔ یورپ میں ایک کروڑ پچپن لاکھ اور آسٹریلیا اور کینیڈا میں 80 لاکھ تھے۔ بڑے یورپی ملکوں میں وطن ترک کرنے والوں کا تناسب کل آبادی کے سات سے آٹھ فیصد تک پہنچ گیا۔ امریکہ میں 1994ء میں وطن ترک کر کے آنے والے کل آبادی کا 8.7 فیصد تھے جو 1970ء سے دگنا ہے اور 1980ء کی دہائی میں امریکہ میں قریباً 8.3 ملین لوگ داخل ہوئے تھے نیز 1990ء کی دہائی کے پہلے چار برسوں میں 4.5 ملین لوگ داخل ہوئے تھے۔

نئے امیگرنٹس غیر مغربی معاشروں سے بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ جرمنی میں 1990ء میں 1,675,000 ترک بیرونی رہائشی تھے جبکہ یوگوسلاویہ' اٹلی اور یونان کے لوگوں کا درجہ ان کے بعد آتا تھا۔ اٹلی میں دوسرے ملکوں سے آنے والے میں سب سے زیادہ مراکش' امریکہ (بہت زیادہ امریکی اطالوی واپس چلے گئے ہیں)' تیونس اور فلپائن سے آئے۔ 1990ء کی دہائی کے وسط میں قریباً چالیس لاکھ مسلم فرانس میں رہتے تھے اور مغربی یورپ میں مجموعی طور پر ایک کروڑ تیس لاکھ مسلم رہتے تھے۔ 1950ء کی دہائی میں امریکہ میں ترک وطن کر کے آنے والوں کی دو تہائی تعداد یورپ اور کینیڈا سے تھی۔ 1980ء کی دہائی میں ترک وطن کر کے امریکہ آنے والوں میں سے 35 فصد کا تعلق ایشیا سے تھا' 45 فیصد کا لاطینی امریکہ سے اور 15 فیصد سے کم کا یورپ اور کینیڈا سے۔ امریکہ میں قدرتی افزائش آبادی کی شرح کم ہے اور یورپ میں تو صفر ہے۔ ترک وطن کرنے والوں میں پیدائش کی شرح بہت زیادہ ہے اور مستقبل میں مغربی معاشروں میں آبادی کی افزائش انہی کی مرہون منت ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغرب کے لوگوں میں یہ خوف بڑھ رہا ہے کہ ''اب ان پر حملہ تو کیا گیا ہے لیکن فوجوں اور ٹینکوں سے نہیں بلکہ ان ترک وطن کرنے والوں کے ذریعے جو دوسری زبانیں بولتے ہیں' دوسرے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں' دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز انہیں خوف ہے کہ یہ لوگ ان کا روزگار چھین لیں

کے زمینوں پر قبضہ کر لیں گے، ویلفیئر سسٹم کو تباہ کر دیں گے اور ان کے طرز زندگی کو برباد کر دیں گے۔" یہ خوف متعلقہ آبادیاتی زوال میں جڑیں رکھتے ہیں۔ سٹینلے ہوف مین تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ خوف "حقیقی ثقافتی تصادمات اور قومی شناخت کو درپیش پریشانیوں کی پیداوار ہیں۔"

1990ء کی دہائی کے آغاز سے یورپ میں ترک وطن کر کے آنے والے مسلم تھے، نیز ترک وطن (امیگریشن) کے حوالے سے یورپی فکرمندی سب سے زیادہ مسلم امیگریشن سے وابستہ ہے۔ چیلنج آبادیاتی ہے...... مغربی یورپ میں پیدا ہونے والوں میں سے دس فیصد ترک وطن کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں، عرب برسلز میں 50 فیصد...... نیز ثقافتی ہے۔ مسلم برادریاں (کمیونٹیز) آیا جرمنی میں ترکی ہوں یا فرانس میں الجیریائی اپنے میزبان ملکوں کی ثقافتوں میں ضم نہیں ہوئے ہیں اور یورپی لوگوں کیلئے لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ ضم ہوتے دکھائی بھی نہیں دیتے ہیں۔ ژاں میری ڈومینیک نے 1991ء میں کہا تھا "سارے یورپ میں ایک خوف پھیل رہا ہے کہ مسلم کمیونٹی جس نے سارے یورپ کو کاٹ ڈالا ہے یورپی کمیونٹی کی تیرہویں قوم نہ بن جائے۔" ترک وطن کرنے والوں کے حوالے سے ایک امریکی صحافی نے تبصرہ کیا تھا:

یورپی عداوت انتخابی ہے۔ فرانس میں کچھ لوگ مشرق سے یلغار سے خوفزدہ ہیں...... پولینڈ کے لوگ بہرحال یورپی اور کیتھولک ہیں اور غیر عرب افریقی ترک وطن کرنے والوں سے بھی نہ تو کوئی خوف کھاتا ہے نہ نفرت کرتا ہے۔ دشمنی تو براہ راست زیادہ تر مسلموں کے ساتھ ہے۔ لفظ "ترک وطن" درحقیقت اسلام کا مترادف بن کر رہ گیا ہے جواب فرانس کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے نیز ایک ثقافتی بعد اور نسل پرستی کی نشاندہی کرتا ہے جس کی جڑیں فرانسیسی تاریخ میں بہت گہری ہیں۔"

تاہم فرانسیسی کسی بھی سخت معیار سے پرکھا جائے نسل پرست کے بجائے ثقافت پرست ہیں۔ انہوں نے کالے افریقیوں کو قبول کر لیا ہے جو درست فرانسیسی بولتے ہیں لیکن انہوں نے ان مسلم لڑکیوں کو قبول نہیں کیا جو اپنے سکولوں میں سروں کو سکارف سے ڈھانپنا

چاہتی ہیں۔ 1990ء میں 76 فیصد فرانسیسی عوام سوچتے تھے کہ فرانس میں عربوں کی تعداد کافی سے زیادہ ہے۔ 46 فیصد کالوں کے متعلق، 40 فیصد ایشیائیوں کے متعلق اور 24 فیصد یہودیوں کے متعلق۔ 1994ء میں 47 فیصد جرمن کہتے تھے کہ وہ عربوں کو اپنے ہمسائے میں قبول کرنے کو ترجیح نہیں دیں گے، 39 فیصد پولینڈ کے لوگوں کو نہیں چاہتے تھے، 36 فیصد ترکوں کو اور 22 فیصد یہودیوں کو۔ مغربی یورپ میں سامی دشمنی براہ راست عربوں کے خلاف ہو گئی ہے جو کہ پہلے براہ راست یہودیوں کے خلاف ہوا کرتی تھی۔

ترک وطن کے حوالے سے عوامی مخالفت اور عداوت و نفرت ترک وطن کرنے والی کمیونٹیوں اور افراد کے خلاف پرتشدد سرگرمیوں میں ظاہر ہوئی ہے کہ 1990ء کی دہائی میں جرمنی میں خصوصاً ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ سب سے زیادہ اہم بات دائیں بازو کی قوم پرست ترک وطن مخالف جماعتوں کے ووٹوں میں اضافہ ہے۔ تاہم یہ ووٹ کبھی کبھار ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی نے جرمنی میں 1989ء کے یورپی انتخابات میں سات فیصد ووٹ حاصل کئے لیکن 1991ء کے قومی انتخابات میں صرف 2.1 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ فرانس میں نیشنل فرنٹ (قومی محاذ) جو کہ 1981ء میں بالکل نظر انداز ہوا تھا، 1988ء میں 9.6 فیصد تک جا پہنچا اور علاقائی اور پارلیمانی انتخابات میں 12 سے 15 فیصد کے درمیان تھم گیا ہے۔ 1995ء میں دو قوم پرستوں نے جو صدر کے عہدے کیلئے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے ووٹوں کا 19.9 فیصد حاصل کیا نیز نیشنل فرنٹ نے بہت سے شہروں بشمول تولون اور نیس میئر منتخب کروائے۔ اٹلی میں ایم ایس آئی، قومی محاذ (نیشنل الائنس) 1980ء کی دہائی کے قریباً پانچ فیصد سے اٹھ کر 1990ء کی دہائی کے شروع میں 10 سے 15 فیصد تک پہنچ گیا۔ بیلجیئم میں فلیمش بلاک، نیشنل فرنٹ لوکل انتخابات میں 1994ء میں 9 فیصد ووٹوں تک جا پہنچا جبکہ اینٹورپ میں اس نے 28 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ آسٹریا میں عام انتخابات میں فریڈم پارٹی کے ووٹ 1986ء کے 10 فیصد سے کم سے بڑھ کر 1990ء میں 15 فیصد سے زیادہ اور 1994ء میں قریباً 23 فیصد ہو گئے۔

مسلم ترک وطن کرنے والوں کی مخالف یورپی پارٹیاں مسلمان ملکوں کی اسلام پسند

پارٹیوں کی آئینہ دار ہیں۔ دونوں ہی کرپٹ اسٹیبلشمنٹ اور اس کی پارٹیوں کی نفی کرتی ہیں' معاشی خدشات کا استحصال کرتی ہیں' خصوصاً بیروزگاری کا' نسلی اور مذہبی ترغیبات دیتی ہیں اور اپنے معاشروں پر پڑنے والے بیرونی اثرات پر تنقید کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں انتہا پسندی دہشت گردی اور تشدد کی وجہ بنتی ہے۔ اسلام پسند اور یورپی قوم پرست پارٹیاں ہر دو مثالوں میں' قومی انتخابات کی نسبت لوکل (مقامی) انتخابات میں بہتر کارکردگی کا رجحان رکھتی ہیں۔ مسلم اور یورپی سیاسی اسٹیبلشمنٹ ان پیش رفتوں کا ایک سے انداز ہی میں جواب دیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلم ملکوں میں حکومتیں عالمی سطح پر اپنی نہاد' علامات' پالیسیوں اور سرگرمیوں کے حوالے سے زیادہ اسلامی ہو رہی ہیں۔ یورپ میں مرکزی دھارے (مین سٹریم) کی پارٹیاں دائیں بازو کی ترک وطن مخالف پارٹیوں کا لب ولہجہ اپنا رہی ہیں اور انہیں کے سے اقدامات کو فروغ دے رہی ہیں۔ جہاں جمہوری سیاست موثر انداز میں جاری ہے اور دو یا زیادہ متبادل پارٹیاں اسلام پسند یا قوم پرست پارٹیوں کے متبادل کے طور پر موجود ہیں وہاں بھی ان کے ووٹ 20 فیصد کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ احتجاجی پارٹیاں اس حد کو تبھی پار کرتی ہیں جب کوئی مؤثر متبادل پارٹی یا اتحاد موجود نہیں ہوتا جیسا کہ الجیریا' آسٹریا نیز بعض لائق توجہ حوالوں سے اٹلی میں ہوا۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں یورپی لیڈر ترک وطن مخالف جذبات میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ فرانس میں ژاک شیراک نے 1990ء میں اعلان کیا کہ ''ترک وطن (امیگریشن) کو مکمل طور پر روک دیا جائے گا'' وزیر داخلہ چارلس پاسکا نے 1993ء میں ''صفر ترک وطن'' کی دلیل دی اور فرانس متراں' ریڈتھ کریسن' والیری جسکارڈ ڈی ایسٹنگ اور دوسرے مرکزی دھارے (مین سٹریم) کے سیاستدانوں نے ترک وطن مخالف لہجہ اپنا لیا۔ 1993ء کے پارلیمانی انتخابات کا مرکزی مسئلہ (ایشو) ترک وطن تھا اور کنزرویٹو پارٹیوں کی فتح اسی کی مرہون منت تھی۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں فرانسیسی حکومت کی پالیسی میں یہ تبدیلی ہوئی کہ بیرونی لوگوں کے بچوں کی شہریت کا معاملہ زیادہ مشکل بنا دیا گیا۔ بیرونی لوگوں کے خاندانوں کا ترک وطن مشکل بنا دیا گیا۔ بیرونی لوگوں

کیلئے پناہ کا حق مانگنا مشکل بنا دیا گیا اور الجیریائیوں کو فرانس آنے کیلئے ویزا کا پابند کر دیا گیا۔ غیر قانونی وطن ترک کرنے والوں کو ملک سے نکال دیا گیا نیز پولیس اور ترک وطن (امیگریشن) پر نظر رکھنے والے اداروں کو زیادہ اختیارات دے دیئے گئے۔

جرمنی میں چانسلر ہیلمٹ کوہل اور دوسرے سیاسی لیڈروں نے بھی ترک وطن کے حوالے سے فکرمندی ظاہر کی ہے نیز جرمن حکومت نے ایک اہم اقدام یہ اٹھایا ہے کہ جرمن آئین کے آرٹیکل XII میں ترمیم کر دی ہے جس کے تحت ان لوگوں کو جنہیں سیاسی بنیادوں پر سزائیں دی گئی ہوں پناہ کا تحفظ دیا گیا تھا اور پناہ کے طلب گاروں کیلئے فوائد میں کمی کر دی گئی۔ 1992ء میں جرمنی میں 438,000 افراد پناہ کی تلاش میں آئے۔ 1994ء میں صرف 127,000' برطانیہ نے 1980ء میں امیگریشن میں پچاس ہزار سالانہ کی کمی کی لیکن اس مسئلے پر بہت کم شدید جذبات اور مخالفت پیدا ہوئی۔ تاہم 1992ء سے 1994ء کے درمیان برطانیہ نے 29000 پناہ خواہوں کو اجازت دی۔ جیسے ہی یورپی یونین میں نقل و حرکت کی پابندیاں ہٹی ہیں برطانیہ غیر یورپی تارکین وطن کی جانب سے پریشان ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر 1990ء کی دہائی کے وسط میں مغربی یورپی ملکوں نے غیر یورپی ملکوں سے ترک وطن کو مکمل طور پر ختم نہ کرنے کے بجائے کم کرنے کا فیصلہ کیا۔

امریکہ میں امیگریشن کا مسئلہ یورپ کی نسبت دیر سے پیدا ہوا اور اسی طرح کی جذباتی شدت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ امریکہ ہمیشہ تارکین وطن کا ملک رہا ہے' خود کو ایسا ہی تصور کرتا رہا ہے اور تاریخی حوالے سے نئے آنے والوں کو جذب کرنے کے نہایت کامیاب اقدام کر چکا ہے۔ 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی میں امریکہ میں بیروزگاری یورپ کے مقابلے میں قابل لحاظ حد تک کم تھی اور ملازمتوں کے کھونے کا ڈرامہ امیگریشن کے حوالے سے فیصلہ کن عامل نہیں تھا۔ امریکہ میں تارکین وطن کے ذرائع یورپ کے مقابلے میں مختلف ہیں اور لہٰذا کسی ایک بیرونی گروپ کے ذریعے منقلب ہو جانے کا ڈر قومی سطح پر تو کم تھا تاہم مضافات میں زیادہ تھا۔ میزبان ثقافت سے دو بڑے تارک وطن گروپوں کا ثقافتی فرق اور فاصلہ یورپ کے مقابلے میں کم تھا یعنی میکسیکی کیتھولک ہیں اور سپینی بولتے ہیں نیز فلپائنی

کیتھولک ہیں اور انگریزی بولتے ہیں۔

ان عوامل کے باوجود 1965ء کے ایکٹ کے پاس ہونے کے ربع صدی بعد' جس میں ایشیائی اور لاطینی امریکی لوگوں کو بہت زیادہ امیگریشن کی اجازت دی گئی تھی' امریکی عوام کی رائے میں فیصلہ کن تبدیلی آئی ہے۔ 1965ء میں صرف 33 فیصد عوام امیگریشن میں کمی چاہتے تھے' 1977ء میں 42 فیصد' 1986ء میں 49 فیصد اور 1990ء اور 1993ء میں 61 فیصد 1990ء کی دہائی میں انتخابات مستقل طور پر 60 فیصد یا اس سے زیادہ عوامی رائے کو کم امیگریشن کے حق میں دکھا رہے ہیں۔ جبکہ معاشی پریشانیاں اور معاشی حالات امیگریشن کے حوالے سے رجحانات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے اور برے حالات میں تیزی سے بڑھتی ہوئی مخالفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافت' جرائم اور طرز زندگی رائے کی اس تبدیلی میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تبصرہ نگار نے 1994ء میں رائے دی کہ "بہت سے' ممکن ہے بہت زیادہ امریکی اپنی قوم کو یورپیوں کا تشکیل دیا ہوا ملک تصور کرتے ہیں جس کے قوانین انگلستان کا ورثہ ہیں' جس کی زبان انگریزی ہے جس کے ادارے اور عمارات مغربی کلاسیکی اقدار سے متاثر ہیں' جس کے مذہب کی جڑیں یہودیت عیسائیت میں ہیں اور جس کی عظمت پروٹسٹنٹ عملی اخلاقیات سے پیدا ہوئی تھی۔" ان فکرمندیوں کو ظاہر کرتے ہوئے عوام کے نمونے کی آراء کا 55 فیصد کہتا ہے کہ وہ ترک وطن (امیگریشن) کو امریکی ثقافت کیلئے ایک خطرہ تصور کرتا ہے۔ یورپی لوگ ترک وطن (امیگریشن) کے خطرے کو مسلم یا عرب حوالے سے دیکھتے ہیں جبکہ امریکی اسے لاطینی امریکی اور ایشیائی تاہم بنیادی طور پر میکسیکی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ 1990ء میں جب دریافت کیا گیا کہ کن ملکوں سے امریکہ نے بہت زیادہ تارکین وطن کو آمد کی اجازت دی ہوئی ہے تو امریکیوں کا جواب تھا میکسیکو' اس کے بعد بالترتیب کیوبا' مشرقیوں (غیر مخصوص) جنوبی امریکیوں اور لاطینی امریکیوں (غیر مخصوص)' جاپان' ویتنام' چین اور کوریا کا نام آتا ہے۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں امیگریشن کی بڑھتی ہوئی مخالفت نے یورپ کی طرح کا سیاسی ردعمل پیدا کیا۔ امریکی سیاسی نظام کی ساخت ایسی ہے کہ دائیں بازو اور امیگریشن

مخالف پارٹیوں کو ووٹ نہیں دیئے گئے تاہم امیگریشن مخالف تشہیر کار اور مفاداتی گروپ زیادہ یاد کے قابل' زیادہ فعال اور زیادہ باآواز ہو گئے۔ زیادہ ناراضگی 35 لاکھ سے 40 لاکھ غیر قانونی تارکین وطن کے حوالے سے تھی اور سیاست دانوں کو جواب دہ ہونا پڑا' جیسا کہ یورپ میں ہوا تھا۔ اسی طرح زیادہ مضبوط ردعمل ریاست اور مقامی سطحوں پر ہوا جنہیں امیگریشن کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ 1994ء میں نتیجہ یہ نکلا کہ فلوریڈا نے وفاقی حکومت پر مقدمہ کر دیا جس میں چھ ریاستیں مزید شامل ہو گئیں اور دعویٰ کیا گیا کہ غیر قانونی تارکین وطن کی تعلیم' ویلفیئر' قانون کے نفاذ اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کیلئے 884 ملین ڈالر ادا کئے جائیں۔ کیلیفورنیا میں جہاں سب سے بڑی تعداد میں غیر قانونی تارکین وطن ہیں' گورنر پیٹ ولسن نے غیر قانونی تارکین وطن کے بچوں کیلئے پبلک ایجوکیشن کو مسترد کر کے' غیر قانونی تارکین وطن کے امریکہ میں پیدا ہونے والے بچوں کیلئے شہریت کی نفی کر کے اور غیر قانونی تارکین وطن کو ایمرجنسی تحفظ صحت کی ادائیگیاں روک کر عوامی رائے جیت لی۔ نومبر 1994ء میں کیلیفورنیائیوں نے بھرپور اکثریت سے پروپوزیشن 187 منظور کی جس کے تحت غیر قانونی تارکین وطن اور ان کے بچوں کیلئے صحت' تعلیم اور ویلفیئر کے فوائد کو مسترد کیا گیا تھا۔

1994ء میں کلنٹن انتظامیہ نے بھی اپنے پہلے کے اقدامات کو واپس لے لیا' امیگریشن کنٹرول کو سخت تر بنا دیا' سیاسی پناہ کے حوالے سے قوانین کو بھی سخت کر دیا گیا' امیگریشن سروس کو وسیع کر دیا گیا' سرحدی گشت کو بڑھا دیا گیا اور میکسیکن سرحد کے ساتھ ساتھ ٹھوس حد بندیاں قائم کر دی گئیں۔ 1995ء میں کمیشن آف امیگریشن ریفارم' جس کو 1990ء میں کانگریس نے بااختیار بنایا تھا' کو ہدایت دی گئی کہ وہ ہر سال قانونی امیگریشن کو 800,000 سے کم کر کے 550,000 تک لائے' نوجوانوں اور شادی شدہ جوڑوں کو ترجیح دے لیکن موجودہ شہریوں اور رہائشیوں کے دوسرے رشتہ داروں کو اجازت نہیں دے۔ یہ ایک ایسی شق تھی جس نے ایشیائی اور ہسپانوی خاندانوں کو مشتعل کر دیا۔ کمیشن کی بہت سی سفارشات کو قانونی طور پر منظور کیا گیا ہے نیز 1995-96ء میں امیگریشن کو محدود کرنے والے اقدامات کانگریس میں منظوری کے

مرحلے میں تھے۔ 1990ء کی دہائی کے وسط سے امریکہ میں امیگریشن ایک بڑا سیاسی مسئلہ بن گئی ہے اور 1996ء میں پیٹرک بکانن نے تو اپنی صدارتی مہم کے دوران میں امیگریشن کی مخالفت کو ایک مرکزی موضوع بنالیا تھا۔ امریکہ اپنے معاشرے میں غیر مغربی لوگوں کے داخلے میں ٹھوس کمی کرنے کے معاملے میں یورپ کی پیروی کر رہا ہے۔

کیا یورپ اور امریکہ ترک وطن کی لہر کے آگے بند باندھ سکتے ہیں؟ فرانس کو آبادیاتی مایوسی پسندی کے اہم موقف کا تجربہ ہو چکا ہے۔ 1970ء کی دہائی میں ژاں راسپیل کے ناول سے لے کر 1990ء کی دہائی میں ژاں کلاڈ چیزنیز کے علمی تجزیے تک جسے 1991ء میں پیئر لیلوشے نے یوں مختصراً بیان کیا ''تاریخ اور غربت یقینی بناتی ہے کہ فرانس اور یورپ کا مقدر ہے کہ جنوب کے ناکام معاشروں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ یہاں آ کر بسیں۔ یورپ کا ماضی سفید اور یہودیت عیسائیت والا ہے' مستقبل ایسا نہیں ہو گا۔'' تاہم مستقبل تو...... متعین یا طے شدہ نہیں ہے' نہ ہی کوئی مستقبل مستقل ہوا کرتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یورپ اسلامائزڈ (اسلامی) ہو جائے گا یا امریکہ ہسپانائزڈ (ہسپانوی) ہو جائے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا یورپ اور امریکہ منقسم (Cleft) معاشروں میں تبدیل ہو جائے گا جو دو علیحدہ اور بڑی مختلف کمیونٹیوں پر مشتمل ہوں گے' جن کا تعلق دو الگ الگ تہذیبوں سے ہو گا؟ جس کا جوابی طور پر انحصار یورپ اور امریکہ میں غالب مغربی ثقافت میں ان کا جذب ہونا اور تارکین وطن کی تعداد پر ہے۔

عمومی طور پر یورپی معاشرے تارکین وطن کو جذب کرنا نہیں چاہتے یا ایسا کرنے میں بڑی دشواریوں کو حائل پاتے ہیں نیز جس حد تک مسلم تارکین وطن اور ان کے بچے گھل مل جانا چاہتے ہیں غیر واضح ہے لہٰذا مستقل ترک وطن سے ملک مسلم اور عیسائی کمیونٹیوں میں تقسیم ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس نتیجے سے یوں بچا سکتا ہے کہ یورپی حکومتیں اور عوام ایسی امیگریشن کو روکنے کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہوں جس میں امیگریشن مخالف اقدامات کے براہ راست مالی مصارف بھی شامل ہیں' موجودہ امیگرنٹ کمیونٹیوں کو مزید پرے رکھنے کے معاشرتی مصارف اور طویل مدتی مگر پوشیدہ معاشی مصارف جو کہ

مزدوروں کی کمیابی اور شرح پیداوار میں کمی کے سبب سے ہوں گے۔

تاہم مسلم آبادیاتی یلغار کا مسئلہ کمزور ہوتا دکھائی دیتا ہے جیسا کہ شمالی افریقی اور مشرق وسطی کے معاشروں میں پیدائش کی شرح اپنی انتہا کو چھو چکی ہے' جیسا کہ دوسرے کچھ ملکوں میں پہلے ہی ہو چکا ہے' اور اب کم ہونا شروع ہو گئی ہے۔ آبادیاتی دباؤ امیگریشن کو بڑھاتا ہے تو مسلم امیگریشن 2025ء تک بہت ہی کم ہو جائے گی۔ یہ ذیلی صحارائی افریقہ کے معاملے میں سچ نہیں ہے۔ اگر مغربی اور مرکزی افریقہ میں معاشی ترقی واضح ہو گئی اور اس کے تحت سماجی حرکت پذیری رونما ہوئی تو ترک وطن کے محرکات اور استعداد بڑھے گی اور مغرب کو لاحق ''اسلامائزیشن'' کا خطرہ ''افریقنائزیشن'' کے خطرے سے متبدل ہو جائے گا۔ اس خطرہ کے مادی روپ میں ڈھلنے کا انحصار خصوصیت سے اس بات پر ہے کہ افریقی آبادیاں ایڈز (AIDS) اور دوسری وباؤں سے کس حد تک کم ہوتی ہیں نیز جنوبی افریقہ باقی افریقہ سے ترک وطن کرنے والوں کو کس درجہ تک راغب کرتا ہے۔

مسلم یورپ کیلئے مسئلہ پیدا کر رہے ہیں تو میکسیکن امریکہ کیلئے۔ موجودہ رجحانات اور پالیسیوں کو جاری رکھنے کے مفروضے کے تحت دیکھا جائے تو امریکی آبادی اکیسویں صدی کے پہلے نصف میں ڈرامائی طور پر تبدیل ہو کر 50 فیصد سفید اور 25 فیصد ہسپانوی ہو جائے گی۔ جیسا کہ یورپ میں ہوا۔ امیگریشن پالیسی میں تبدیلیوں اور امیگریشن مخالف اقدامات کے موثر نفاذ سے ان خدشات سے بچا جا سکتا ہے۔ بہرحال مسئلہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک ہسپانوی بھی اپنے پیش رو گروپوں کی طرح امریکی معاشرے میں گھل مل نہیں جاتے۔ ایسا کرنے کیلئے دوسری اور تیسری نسل کے ہسپانویوں کو ترغیبات اور دباؤ کے ایک وسیع تناظر کا سامنا ہے۔ دوسری طرف میکسیکن امیگریشن غیر ظاہری طور پر اہم حوالوں سے دوسری امیگریشنوں سے مختلف ہے۔ اول: یورپ یا ایشیا کے ترک وطن کرنے والوں کو سمندر پار کرنا پڑتے ہیں جبکہ میکسیکیوں کو پیدل چل کر یا صرف ایک دریا تیر کر آنا ہوتا ہے۔ اس میں مزید اضافہ ہوا ہے ٹرانسپورٹ اور کمیونی کیشن کی سہولتوں کی وجہ سے' جس نے انہیں اپنی کمیونٹیوں سے قریبی تعلق اور شناخت کے قابل بنا دیا ہے۔ دوم: میکسیکی

تارکین وطن جنوب مغربی امریکہ میں مجتمع ہیں اور یوکاٹن سے کولوراڈو تک پھیلے ہوئے ایک مسلسل میکسیکن معاشرے کا ایک حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ سوم: کچھ شواہد واضح کرتے ہیں کہ میکسیکی تارکین وطن کے اندر دوسرے تارکین وطن گروپوں کے مقابلے میں گھل مل جانے کی مزاحمت زیادہ ہے اور یہ کہ میکسیکی اپنی میکسیکن شناخت کو برقرار رکھنے کے رجحان کے حامل ہیں جیسا کہ 1994ء میں کیلیفورنیا میں پروپوزیشن 187 کے خلاف جدوجہد سے واضح ہے۔ چہارم: انیسویں صدی کے وسط میں امریکہ نے میکسیکو کو شکست دی تو اس سے ملحقہ علاقے کو میکسیکیوں نے آباد کیا تھا۔ میکسیکی معاشی ترقی یقینی طور پر میکسیکی جذبات پیدا کرے گی۔ انیسویں صدی میں امریکہ کا فوجی پھیلاؤ خطرہ ہوسکتا تھا اور اکیسویں صدی میں ممکنہ طور پر میکسیکو میں جوابی طور پر ڈیموگرافک (آبادیاتی) پھیلاؤ رونما ہوسکتا ہے۔

تہذیبوں کے درمیان بدلتے ہوئے توازن طاقت نے مغرب کیلئے زیادہ سے زیادہ مشکل بنا دیا ہے کہ وہ ہتھیاروں کی روک تھام' انسانی حقوق' ترک وطن (امیگریشن) اور دوسرے مسائل کے حوالے سے اپنے اہداف کو حاصل کرے۔ اس صورتحال میں مغرب کو اپنے نقصانات کم کرنے کیلئے اپنے معاشی وسائل کو چابک دستی کے ساتھ استعمال کرکے دوسرے معاشروں سے گاجر اور چھڑی کی حکمت عملی کے تحت نمٹنا ہوگا' اپنے اتحاد کو مضبوط بنانا ہوگا اور اپنی پالیسیوں کو باہم مربوط بنانا ہوگا تاکہ دوسرے معاشروں کیلئے ایک مغربی ملک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنا مشکل ہو جائے نیز غیر مغربی قوموں کے درمیان اختلافات کو بڑھایا اور انہیں استعمال کیا جائے۔ ایک طرف تو مغرب کی ان پالیسیوں پر عمل کرنے کی اہلیت چیلنج دینے والی تہذیبوں کے ساتھ اس کے تصادم کی نوعیت اور شدت ہی طے کرے گی دوسری طرف جس انداز سے وہ جھولتی ہوئی (Swing) تہذیبوں کے ساتھ اپنے مشترکہ مفادات کو فروغ دے سکتی ہے۔

☆☆☆

باب 9

تہذیبوں کی عالمی سیاست

مرکزی ریاستیں اور تقسیمی خط کے تصادم

تہذیبیں انسانی قبیلے ہوتی ہیں اور تہذیبوں کا تصادم عالمی (گلوبل) سطح پر قبائلی جھگڑا ہوتا ہے۔ ابھرتی ہوئی دنیا میں دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستیں اور گروپ کسی تیسری تہذیب کے خلاف اپنے مفادات کو فروغ دینے یا دوسرے مقاصد کے تحت محدود' عارضی' فوجی روابط اور اتحاد قائم کر سکتے ہیں تاہم مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے تعلقات کبھی قریبی نہیں ہوں گے' عموماً سرد اور اکثر معاندانہ رہیں گے۔ مختلف تہذیبوں کے درمیان ماضی سے چلے آرہے تعلقات' مثلاً سرد جنگ کے زمانے کے فوجی اتحاد کمزور ہو جائیں گے یا بالکل ہی معدوم ہو جائیں گے۔ بین التہذیبی ''شراکت داری'' کی امیدیں جیسا کہ کسی زمانے میں روس اور امریکہ کے لیڈر بیان کیا کرتے تھے حقیقت کا روپ اختیار نہیں کریں گی۔ ابھرتے ہوئے بین التہذیبی تعلقات فاصلاتی سے پرتشدد تک رہیں گے۔ اکثر معاملوں میں ان کے درمیان ''سرد امن'' رہے گا جیسا کہ بورس یلسن نے کہا ہے روس اور مغرب کے تعلقات کا مستقبل ہو سکتا ہے۔ دوسرے بین التہذیبی تعلقات ایک ''سرد جنگ'' کی حالت میں رہیں گے۔ اصطلاح گیورا فرائیا ہسپانویوں نے تیرہویں

صدی میں مسلموں کے ساتھ ''دشوار بقائے باہم'' کو واضح کرنے کیلئے وضع کی تھی اور 1990ء میں بہت سے لوگ اسلام اور مغرب کے درمیان دوبارہ ''تہذیبی سرد جنگ'' ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ تہذیبوں کی دنیا میں یہ واحد تعلق نہیں ہوگا جسے اس اصطلاح میں بیان کیا جائے۔ سرد امن' سرد جنگ' تجارتی جنگ' بظاہر جنگ ''مشکل امن' دشوار تعلقات' شدید رقابت' مقابلہ جاتی بقائے باہمی' ہتھیاروں کی دوڑ' یہ سب الفاظ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی اکائیوں کے درمیان تعلقات کا سب سے زیادہ ممکن نسخہ ہیں۔

بین التہذیبی تصادم دو شکلیں اختیار کرے گا: مقامی یا مائیکرو سطح پر ''تقسیمی خط کے تصادمات'' مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ہمسایہ ریاستوں میں رونما ہوں گے یا ایک ریاست کے اندر مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں میں اور ان گروپوں میں جو پرانی ریاست کے کمزور ہونے سے نئی ریاستوں کو تشکیل دینا چاہتے ہیں جیسا کہ سابق سوویت یونین اور یوگوسلاویہ میں ہوا۔ تقسیمی خط کے تصادمات خاص طور پر مسلموں اور غیر مسلموں میں زیادہ ہوں گے۔ ان تصادمات کی وجوہات نیز نوعیت اور حرکیات کو دسویں اور گیارھویں ابواب میں دریافت کیا گیا ہے۔ گلوبل (عالمی) یا بڑی (میکرو) سطح پر مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی بڑی ریاستوں کے درمیان ''مرکزی ریاستی تصادمات'' واقع ہوں گے۔ ان تصادمات کے مسائل بین الاقوامی سیاست کے کلاسیک مسائل ہوں گے۔ جن میں شامل ہیں:

1- عالمی پیش رفتوں کی صورت پذیری اور بین الاقوامی اداروں مثلاً یو این' آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے عالمی اقدامات سے متعلقہ۔

2- فوجی طاقت سے متعلقہ جو کہ ہتھیاروں کی روک تھام اور ہتھیاروں پر کنٹرول نیز ہتھیاروں کی دوڑوں پر ہونے والے اختلافات میں ظاہر ہوں گے۔

3- معاشی طاقت اور ویلفیئر جو تجارت' سرمایہ کاری اور دیگر مسائل پر ہونے والے جھگڑوں میں ظاہر ہوں گے۔

4- افراد' ایک تہذیب کی قیادت لوگوں کو دوسری تہذیب میں رشتے قائم کرنے سے

روکے گی۔ اس کا مقصد لوگوں کو دوسری تہذیب سے ممتاز بنانا ہوگا یا دوسری تہذیبوں کے لوگوں کو اپنے علاقے سے بے دخل کرنا۔

5- اقدار اور ثقافت' جب کوئی ریاست کسی دوسری تہذیب سے تعلق رکھنے والوں پر اپنی اقدار کو نافذ کرنے یا انہیں فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔

6- بعض اوقات علاقہ' جس میں مرکزی ریاستیں تقسیمی خط کے تصادمات میں صف اول (فرنٹ لائن) کی شراکت دار بن جائیں گی۔

بہرحال یہ مسائل پوری انسانی تاریخ کے دوران میں جھگڑوں کا باعث رہے ہیں۔ تاہم جب مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستیں ملوث ہوتی ہیں تو ثقافتی اختلافات جھگڑے کو بڑھا دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مرکزی ریاستیں اپنے تہذیبی رفیقوں پر اعتماد کرنے' تیسری تہذیب کی ریاستوں سے مدد حاصل کرنے' مخالف تہذیبوں میں تقسیم اور انحراف پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں نیز سفارتی' سیاسی' معاشی اور سماجی اقدامات کے امتزاج کو استعمال کرتی ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے پراپیگنڈا مداخلتوں اور جبر سے کام لیتی ہیں تاہم مرکزی ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف براہ راست فوجی طاقت استعمال نہیں کرتیں۔ سوائے ان حالات کے جیسے کہ مشرق وسطی اور برصغیر میں ہیں۔ جہاں پر کہ وہ تہذیبی تقسیمی خط کے ساتھ ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ بصورت دیگر مرکزی ریاستوں کی جنگیں صرف دو حالات کے تحت شروع ہو سکتی ہیں۔ اول: یہ تقسیمی خط کے جھگڑے سے بڑھتے بڑھتے شروع ہو سکتی ہے جو مقامی گروپوں میں ہو رہا ہو اور وہ ان مقامی جنگ جوؤں کی مدد کو آئیں۔ تاہم یہ امکان مخالف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی مرکزی ریاستوں کیلئے بڑی کشش رکھتا ہے کہ وہ تقسیمی خط کے جھگڑے کو یا تو محدود کر دیں یا حل کر دیں۔

دوم: مرکزی ریاستوں کی جنگ تہذیبوں کے مابین عالمی (گلوبل) توازن طاقت میں تبدیلیوں کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ تھیوسی ڈائڈس نے بیان کیا ہے یونانی تہذیب کے اندر ایتھنز کی بڑھتی ہوئی طاقت پیلو پونیشین جنگ کی طرف لے گئی۔ اسی طرح مغربی

تہذیب کی تاریخ عروج پاتی ہوئی اور زوال پاتی ہوئی طاقتوں کے مابین جنگوں کی تاریخ۔ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی مرکزی ریاستوں کے درمیان جھگڑے کو بڑھانے و الے یکساں عوامل کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان تہذیبوں کے اندر ریاستوں کیلئے نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے ارتباط کس انداز کا ہو؟ متوازن یا حاشیہ برادرانہ حاشیہ برادری ایشیائی تہذیبوں کا زیادہ خاصہ ہوسکتی ہے۔ چینی طاقت کا عروج دوسری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کو جنم دے سکتا ہے جن میں امریکہ ہندوستان اور روس شامل ہیں۔ مغربی تاریخ میں کھوئی ہوئی جنگ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان برپا ہوئی تھی اور دونوں معاشروں کی ثقافتی یکسانیت کی وجہ سے برطانوی برتری سے امریکی برتری میں پرامن طور پر مبدل ہوگئی۔ چین اور امریکہ کے مابین اس قسم کی یکسانیت نہ ہونے سے طاقت کے بدلتے ہوئے توازن سے فوجی جھگڑا نہیں ہوگا۔ اسلام کی حرکیات بہت سی چھوٹی تقسیمی خط کی جنگوں کا رواں سرچشمہ ہے۔ چین کا عروج بین التہذیبی بڑی جنگ کا پوشیدہ سرچشمہ ہے۔

اسلام اور مغرب

کچھ مغربی بشمول صدر بل کلنٹن کہتے ہیں کہ مغرب کو اسلام سے کوئی مسائل درپیش نہیں ہیں بلکہ صرف متشدد اسلام پسند گروپوں سے ہے۔ تاریخ کے دوسو سال دوسرے انداز سے وضاحت کرتے ہیں۔ اسلام اور عیسائیت' آرتھوڈوکس اور مغربی ہر دو کے درمیان تعلقات اکثر طوفانی رہے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے کے لیے دوسرا رہا ہے۔ بیسویں صدی کا لبرل ڈیموکریسی اور مارکسی لیننن ازم کے مابین جھگڑا محض ایک عارضی اور سطحی تاریخی مظہر تھا بمقابلہ اسلام اور عیسائیت کے مسلسل اور گہرے تصادماتی تعلقات کے۔ بعض اوقات پرامن بقائے باہم حاوی رہی۔ بہت زیادہ یوں ہوا کہ تعلقات کی نوعیت شدید رقابت کی رہی اور گرم جنگ ہوتی رہی۔ جان ایسپوزیٹو تبصرہ کرتا ہے کہ "تاریخی حرکیات نے ...... اکثر دونوں کمیونٹیوں کو مقابلے میں ہی پایا اور اکثر اقتدار' زمین اور لوگوں کیلئے ہلاکت انگیز جنگوں

میں ۔'' صدیوں تک دونوں مذاہب کی تقدیریں لہروں' وقفوں اور جوابی لہروں کے تسلسل میں عروج اور زوال پاتی رہیں۔

ساتویں صدی کے آغاز اور آٹھویں صدی کے وسط میں عرب اسلامی بیرونی یلغار کے نتیجے میں شمالی افریقہ' آئبیریا' مشرق وسطیٰ' ایران اور شمالی ہندوستان پر مسلم حکومت قائم ہوئی۔ دو صدیوں سے زیادہ عرصے کیلئے اسلام اور عیسائیت کے درمیان تقسیمی خطوط مستحکم ہو گئے۔ پھر گیارہویں صدی کے اواخر میں عیسائیوں نے مغربی بحیرۂ روم اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سسلی اور ٹولیڈو کو فتح کیا۔ 1095ء میں عیسائیت نے صلیبی جنگوں کا آغاز کیا اور ڈیڑھ صدی تک عیسائی فرماں روا ارض مقدس اور متصلہ مشرق قریب میں متصل علاقوں پر عیسائی حکومت قائم کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ 1291ء میں ایکر (Acre) کو گنوا دیا جو ان کا آخری مضبوط گڑھ تھا۔ اسی دوران میں عثمانی ترک منظر پر نمودار ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے بازنطین کو کمزور کیا پھر بلقان کو فتح کر لیا جیسا کہ انہوں نے شمالی افریقہ کو کیا تھا۔ 1453ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کیا نیز 1529ء میں ویانا کا محاصرہ کیا۔ برنارڈ لیواں کہتا ہے ''قریباً ایک ہزار برس تک' سپین میں موروں (مسلمانوں) کی پہلی آمد سے ترکوں کے ویانا کے دوسرے محاصرے تک' یورپ کو اسلام سے مستقل خطرہ درپیش تھا۔'' اسلام وہ واحد تہذیب تھی جس نے مغرب کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا اور ایسا دو مرتبہ ہوا بھی۔

تاہم پندرھویں صدی سے یہ لہر واپس ہونا شروع ہو گئی۔ عیسائیوں نے بتدریج آئبیریا کو دوبارہ حاصل کیا۔ 1492ء میں گریناڈا میں مہم کو مکمل کیا۔ اسی دوران میں بحری جہاز رانی کے شعبے میں یورپی ترقی نے پرتگالیوں اور پھر دوسروں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مسلم قلب ارضی میں داخل ہو سکیں نیز بحر ہند اور اس سے آگے جا سکیں۔ اسی زمانے میں روسیوں نے تاتاریوں کے دو صدیوں پر محیط اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ عثمانیوں نے آخری مرتبہ آگے بڑھ کر حملہ کیا اور 1683ء میں ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں ان کی ناکامی نے ایک طویل پسپائی کا آغاز کر دیا جس میں بلقان کے آرتھوڈوکس لوگوں کی عثمانی حکمرانی سے آزادی کی جدوجہد' ہیپس برگ سلطنت کی توسیع اور روسیوں کی بحر اسود اور کوہ قاف پر ڈرامائی چڑھائی

شامل ہے۔ ایک صدی یا اس کے لگ بھگ "عیسائیت کیلئے آفت" "یورپ کے مرد بیمار" میں تبدیل ہو گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر برطانیہ' فرانس اور اٹلی فاتح ٹھہرے اور سوائے ترک ریپبلک کے باقی ماندہ ساری عثمانی سرزمین پر براہ راست یا بالواسطہ تسلط قائم کر لیا۔ 1920ء تک صرف چار مسلم ملک ترکی' سعودی عرب' ایران اور افغانستان کسی بھی شکل کی غیر مسلم حکمرانی سے آزاد تھے۔

مغربی نو آبادیت کی پسپائی 1920ء کی دہائی میں آہستہ آہستہ شروع ہوئی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد کے حالات کے تحت ڈرامائی طور پر تیز ہو گئی۔ سوویت یونین کے انہدام سے مزید مسلم معاشروں کو آزادی ملی ہے۔ ایک گنتی کے مطابق 1757ء سے 1919ء کے درمیان 92 مسلم علاقوں پر غیر مسلم حکمرانی قائم ہوئی۔ 1995ء تک ان علاقوں میں سے 69 دوبارہ مسلم حکومت کے تحت آ گئے نیز تقریباً 45 آزاد ریاستوں کی کثیر آبادی مسلم تھی۔ ان بدلتے ہوئے رشتوں کی متشددانہ نوعیت اس حقیقت سے عیاں ہے کہ 1820ء سے 1929ء کے درمیان مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی دو ریاستوں میں ہونے والی جنگوں میں سے 50 فیصد جنگیں مسلموں اور عیسائیوں کے درمیان ہوئیں۔

جھگڑے کی حالیہ نوعیت کے اسباب عبوری مظہر میں نہیں ہیں جیسا کہ بارہویں صدی میں عیسائی جذبہ یا بیسویں صدی کی مسلم بنیاد پرستی۔ یہ دونوں مذاہب کی فطرت اور ان کی بنیاد پر استوار تہذیبوں سے پھوٹتے ہیں۔ ایک طرف تو جھگڑا اختلاف کی پیداوار تھا خصوصاً اسلام کا مسلم تصور بطور ایک طرز حیات کے جو مذہب اور سیاست کو جوڑتا اور ان پر حاوی ہے بمقابلہ مغربی عیسائیت کا تصور جس میں خدا کی سلطنت اور سیزر کی سلطنت الگ الگ ہیں۔ تاہم جھگڑا ان کی مماثلتوں سے بھی پھوٹتا ہے۔ دونوں مذاہب وحدانیت پرست ہیں جس میں کثرت پسندی کے برعکس' دوسرے دیوتا آسانی سے گھل مل نہیں سکتے اور جو دنیا کو ثنویت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں' ہم اور وہ کی اصطلاحوں میں۔ دونوں آفاقیت پسند ہیں' دعویٰ دار ہیں کہ ان کا عقیدہ ہی واحد سچا عقیدہ ہے جس سے تمام انسانوں کو وابستہ ہونا ہے۔ دونوں تبلیغی (مشنری) مذہب ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے ماننے والوں کی ذمہ

داری ہے کہ بے عقیدہ لوگوں کو واحد سچے عقیدے کی طرف لائیں۔ اسلام اپنے آغاز ہی سے فتوحات کے ذریعے پھیلا اور جب موقع ہوتا تو عیسائیت بھی ایسا ہی کرتی۔ جہاد اور صلیبی جنگ (کروسیڈ) کے مساوی تصورات نہ صرف ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں بلکہ ان دو عقیدوں کو دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب سے ممتاز بناتے ہیں۔ دائروی اور جامد تصورات کے برعکس اسلام اور عیسائیت' یہودیت کے ساتھ' دوسری تہذیبوں میں رائج تاریخ کے دوری نظریات کے حامل ہیں۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان پرتشدد جھگڑوں کے درجے کا انحصار آبادی میں اضافے یا کمی' معاشی ترقیوں' ٹیکنالوجیکل تبدیلی اور مذہبی وابستگی کی شدت پر رہا ہے۔ ساتویں صدی میں اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ عرب لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی۔ بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں میں ''وسعت اور رفتار'' بے مثال تھی۔ چند صدیوں بعد' صلیبی جنگیں معاشی پیداوار' آبادی کے پھیلاؤ اور گیارہویں صدی کے یورپ میں جس نے نائٹوں اور کاشتکاروں کے لیے بڑی تعداد میں ارض مقدس کی طرف مارچ کرنے کو ممکن بنایا' کی پیداوار تھیں۔ ایک بازنطینی شاہد لکھتا ہے کہ جب پہلا کروسیڈ قسطنطنیہ تک پہنچا تو وہ ایسا لگتا تھا ''سارے کا سارا مغرب' بشمول ایڈریاٹک سمندر سے لے کر ہرکولیس کے ستونوں سے پرے تک پھیلے ہوئے بربروں سمیت تمام قبائل نے عمومی نقل مکانی شروع کر دی ہے اور ایشیا میں اپنے سارے رشتہ داروں سمیت آگے ہی آگے مارچ کرتے چلے آرہے ہیں۔'' نویں صدی میں آبادی کے اضافے سے یورپ میں دوبارہ ابھار پیدا ہوا' تاریخ میں سب سے بڑی نقل مکانی (مائیگریشن) کو جنم دیتے ہوئے جو دوسری سرزمینوں کے ساتھ ساتھ مسلموں کو بھی بہا لے گیا۔

بیسویں صدی کے آخر میں قابل موازنہ عوام کے امتزاج نے اسلام اور عیسائیت کے درمیان جھگڑے کو بڑھایا ہے۔ اول: مسلم آبادی کی بڑھوتری نے بہت بڑی تعداد میں بیروزگاری اور مایوس نوجوانوں کو پیدا کیا ہے جو اسلام پسندوں کے رنگروٹ بنے ہیں جنہوں نے ہمسایہ ملکوں پر دباؤ بڑھایا ہے اور مغرب کو نقل مکانی (مائیگریشن) کر گئے ہیں۔ دوم:

اسلامی احیاء نے مغرب کے مقابلے میں مسلموں کو اپنے جداگانہ کردار پر نئے سرے سے اعتماد بخشا ہے اور اپنی تہذیب اور اقدار کی قدر و قیمت سے آشنا کروایا ہے۔ سوم: مغرب کی اپنی اقدار اور اداروں کو آفاقی بنانے کی کوششوں، اپنی فوجی اور معاشی برتری کو برقرار رکھنے اور مسلم دنیا کے جھگڑوں میں مداخلت سے مسلموں کے اندر مغرب کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی ہے۔ چہارم: کمیونزم کے انہدام نے مغرب اور اسلام کے مشترکہ دشمن کو ختم کر دیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کیلئے بڑا خطرہ بنا چھوڑا ہے۔ تعامل اور تال میل نے بھی ایک ملک میں بسنے والے دوسری تہذیب سے متعلق لوگوں کے حقوق کے حوالے سے اختلافات کو بڑھا دیا ہے۔ مسلم اور عیسائی ہر دو معاشروں میں 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے دوران میں ایک دوسرے کیلئے برداشت اور رواداری میں تیزی سے زوال آیا ہے۔

اسلام اور مغرب میں نئے جھگڑے کی بنیاد طاقت اور ثقافت کے مسئلوں پر رکھی ہوئی ہے۔ کٹو (Kto)؟ کوو (Kovo)؟ کون حکومت کرے گا؟ کون رعایا ہو گا؟ لینن کا بیان کردہ سیاست کا یہ مرکزی مسئلہ اسلام اور مغرب کے درمیان فساد کی جڑ ہے۔ تاہم ایک اور بھی جھگڑا ہے جسے لینن بے معنی اور فضول قرار دیتا ہے اور وہ ہے درست کیا ہے؟ اور غلط کیا ہے؟ کے مختلف جوابات جس کا نتیجہ ہے کون درست ہے؟ اور کون غلط ہے؟ جب تک اسلام اسلام رہتا ہے (جو کہ وہ رہے گا) اور مغرب مغرب رہتا ہے (جو کہ زیادہ مشکوک ہے) ان دونوں عظیم تہذیبوں کے درمیان یہ بنیادی جھگڑا اور طرز حیات مستقبل میں ان کے تعلق کو متعین کریں گے جیسا کہ وہ گزشتہ چودہ صدیوں سے متعین کر چکے ہیں۔ یہ تعلقات چند ٹھوس مسائل و معاملات کی وجہ سے بڑھیں گے۔ انہیں مسائل پر ان کے اختلاف یا جھگڑے کی اساس ہے۔ تاریخی حوالے سے ایک بڑا مسئلہ تو علاقے پر قبضے کا ہے تاہم اب یہ نسبتاً غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔ بیس تقسیمی خطوط کے جھگڑوں میں سے 1990ء کی دہائی کے وسط میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان ہونے والے انیس جھگڑے مسلموں اور عیسائیوں کے درمیان ہوئے تھے۔ گیارہ آرتھوڈوکس عیسائیوں اور سات مغربی عیسائیت کے ماننے والوں کے درمیان افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ہوئے۔ ان

متشددانہ یا غیر ظاہری متشددانہ جھگڑوں میں سے صرف ایک جو کروٹوں اور بوسنیائیوں کے درمیان تھا براہ راست اسلام اور مغرب کے مابین تقسیمی خط کے ساتھ واقع ہوا تھا۔ مغرب کی علاقہ جاتی استعماریت کے اختتام اور معدومیت سے مسلم علاقہ جاتی توسیع نے ایک جغرافیائی تفریق پیدا کی ہے جس میں کہ صرف بلقان میں چند ایک مقامات پر مسلم اور مغربی کمیونٹیاں ایک دوسرے سے براہ راست سرحدی حوالے سے الگ ہیں۔ لہٰذا اسلام اور مغرب کے درمیان جھگڑے علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بین التہذیبی مسائل کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ مثلاً ہتھیاروں پر روک تھام' انسانی حقوق اور جمہوریت' تیل پر قبضہ' ترک وطن (مائیگریشن)' اسلام پسندانہ دہشت گردی اور مغربی مداخلت کاری۔

سرد جنگ کے ابھار کے دنوں میں اس تاریخی دشمنی کی شدت کو دونوں کمیونٹیوں کے ارکان نے وسیع طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر **1991**ء میں بیری بوزان نے بہت سی وجوہات کا مشاہدہ کیا کہ ''اسلام اور مغرب کے درمیان'' معاشرتی سرد جنگ کیوں ہو رہی ہے۔ ''جس میں یورپ پہلی صف میں ہے۔''

یہ پیش رفت کسی حد تک سیکولر بمقابلہ مذہبی اقدار' کسی حد تک اسلام اور عیسائیت کے درمیان تاریخی رقابت' کسی حد تک مغربی طاقت سے حسد' کسی حد تک مشرق وسطیٰ کے مابعد نوآبادیاتی ڈھانچے پر مغربی غلبے پر غصے اور کسی حد تک پچھلی دو صدیوں کے دوران میں اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے کمالات کے درمیان ناگوار و حسد انگیز موازنے کی ذلت اور تلخی سے پیدا ہوئی ہے۔

مزید برآں اس نے نشاندہی کی کہ ''اسلام کے ساتھ معاشرتی سرد جنگ نے ایسے اہم وقت پر یورپی تشخص کو مضبوط کیا جب یورپی یونین کا عمل جاری تھا۔'' لہٰذا ''وہ اسلام کے ساتھ معاشرتی سرد جنگ میں مدد کرنے والی ٹھوس کمیونٹی ہو سکتے ہیں بلکہ اسے بڑھانے والی پالیسیاں اپنائیں گے۔'' برنارڈ لیوس نے جو ایک نمایاں مغربی اسلامی عالم ہیں **1990**ء میں ''مسلم نفرت کی جڑوں'' کا تجزیہ کیا اور نتیجہ نکالا:

''اب یہ واضح ہو جانا چاہئے کہ ہم ایک ایسے موڑ اور تحریک کا سامنا کر

رہے ہیں جو انہیں نمٹانے والی حکومتوں اور مسائل اور پالیسیوں سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ کسی تہذیبوں کے تصادم سے کم نہیں ہے۔ جو شاید غیر منطقی تو ہے تاہم جو ہمارے یہودی عیسائی ورثے' ہمارے سیکولر حال اور دونوں کی عالم گیر توسیع کے قدیمی رقیب کا یقینی طور پر تاریخی ردعمل ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ ہم کو اس رقیب کے خلاف ایک مساوی تاریخی بلکہ مساوی غیر منطقی ردعمل میں غصہ نہیں کرنا چاہئے۔''

اسلامی کمیونٹی کی طرف سے بھی اسی قسم کے تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ 1994ء میں ایک نمایاں مصری صحافی محمد سید احمد نے کہا ''یہودی عیسائی مغربی اخلاقیات اور اسلامی احیاء کی تحریک کے درمیان تصادم بڑھنے کے بے خطا نشانات واضح ہیں۔ اسلامی احیا کی یہ تحریک مغرب میں بحراوقیانوس سے لے کر مشرق میں چین تک پھیلی ہوئی ہے۔'' ایک نمایاں ہندوستانی مسلم نے 1992ء میں پیش گوئی کی کہ مغرب کا ''اگلا تصادم مسلم دنیا سے یقینی طور پر ہونے والا ہے۔ مغرب سے پاکستان تک یہ اسلامی قوموں کی بربادی ہے کہ نئے عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کیلئے جدوجہد شروع ہو چکی ہے۔'' ایک تیونسی قانون دان کے مطابق جدوجہد پہلے ہی سے جاری تھی ''نوآبادیت نے اسلام کی ساری ثقافتی روایات کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ میں کوئی اسلام پسند نہیں' میں نہیں سوچتا کہ مذاہب کے درمیان کوئی تصادم ہو۔ یہ تو تہذیبوں کے درمیان تصادم ہے۔''

1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے دوران میں اسلام کے مجموعی رجحانات مغرب دشمن سمت میں مرکوز رہے ہیں۔ ایک حد تک یہ اسلامی احیاء اور ''غرب زدگی'' یا مسلم معاشروں کی مغرب آلودگی (westoxication) پر ردعمل کا فطری نتیجہ ہے۔ ''اسلام کی دوبارہ قبولیت' اس کی فرقہ وارانہ مخصوص صورت جو کچھ بھی ہو کا مطلب مقامی معاشرے' سیاست اور اخلاق پر یورپی اور امریکی اثر کی تردید ہے۔'' ماضی میں موقع آنے پر مسلم لیڈر اپنے لوگوں کو بتایا کرتے تھے ''ہمیں لازماً مغربیت اپنانی ہوگی۔'' تاہم اگر کوئی مسلم لیڈر ایسا کچھ بیسویں صدی کے آخری ربع میں کہتا تو وہ ایک تنہا شخص ہوتا۔ بہرحال

کسی بھی مسلم لیڈر کے ایسے بیانات ڈھونڈنا مشکل ہے خواہ وہ سیاستدان' افسر' عالم' کاروباری شخص یا صحافی ہو جن میں مغربی اقدار اور اداروں کی تعریف کی گئی ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان اختلافات پر زور دیتے ہیں' اپنی ثقافت کی برتری پر اصرار کرتے ہیں اور مغربی یلغار کے مقابلے میں اپنی ثقافت کے ربط کو مضبوط رکھنے کی بات کرتے ہیں۔ مسلم مغربی طاقت اور اس سے اپنے معاشرے اور عقائد کو لاحق ہونے والے خطرات سے خوفزدہ ہیں' اور مغرب سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ مغربی ثقافتوں کو مادہ پرستانہ' کرپٹ' زوال پذیر اور غیر اخلاقی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔ وہ انہیں ورغلانے والا بھی سمجھتے ہیں لہٰذا سب پر زور دیتے ہیں کہ اپنی طرز حیات پر اس کے اثرات کی مزاحمت کرنا ضروری ہے۔ مسلم مغرب پر اس لئے حملہ نہیں کرتے کہ وہ ایک غیر مکمل یا مکمل مذہب سے جڑے رہنا چاہتے ہیں جو کہ ایک ''کتاب کا مذہب'' بن کر رہ گیا ہے بلکہ مذہب سے بہرحال نہ جڑنے کے لئے مسلم نظروں میں مغربی سیکولر ازم' لا مذہبیت اور لہٰذا بے اخلاقی مغربی عیسائیت سے زیادہ برے شر ہیں جس نے کہ انہیں پیدا کیا ہے۔ سرد جنگ کے دوران میں مغرب اپنے مخالفوں کو'' بے خدا کمیونزم'' کا لقب دیا کرتا تھا۔ مابعد سرد جنگ کے تہذیبوں کے تصادم میں مسلم اپنے مخالفوں کو'' بے خدا مغرب'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔

مغرب کے متکبر و گستاخ' مادہ پرست' جابر' وحشی اور پست ہونے کے تصورات نہ صرف بنیاد پرست اماموں کے ہیں بلکہ ان کے بھی ہیں جنہیں مغرب میں اپنا فطری اتحادی اور امداد کرنے والا تصور کیا جاتا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں مغرب میں مسلم مصنفوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ فاطمہ مرنیسی کی کتاب ''اسلام اور جمہوریت'' کو مغربیوں نے عمومی طور پر سراہا ہے کہ یہ ایک جدید' لبرل' خاتون مسلم کا جرأت مندانہ بیان ہے۔ تاہم اس کتاب میں مغرب کی تصویر بمشکل کم قابل تعریف ہو سکتی ہے۔ مغرب ''عسکری'' ' اور ''سامراجی'' ہے نیز ''نوآبادیاتی دہشت'' کے ذریعے دوسری قوموں کو ''خوفزدہ'' کر چکا ہے۔ (صفحات 3' 9) مغربی ثقافت کا نشان امتیاز انفرادیت پسندی ''ساری مصیبتوں کا سرچشمہ'' ہے۔ (صفحہ 8) مغربی طاقت ہیبت ناک ہے۔ مغرب ''تنہا

فیصلہ کرتا ہے کہ مصنوعی سیارے (سیٹلائٹس) عربوں کو تعلیم دینے کیلئے استعمال ہوں گے یا ان پر بم گرانے کیلئے ...... وہ ہمارے جوہروں کو کچل دیتا ہے اور اپنی درآمدی پیداواروں کے ساتھ ہماری زندگیوں میں گھس جاتا ہے نیز موویز کو ٹیلی ویژن پر دکھا کر ہوا کی لہروں کو اولتا بدلتا ہے...... وہ ایک ایسی طاقت ہے جو ہمیں کچل دیتی ہے۔ وہ ہماری مارکیٹوں کا محاصرہ کرتا ہے اور ہمارے وسائل پر قبضہ کرتا ہے۔ ہم اس طرح اپنی حالت کا تصور کرتے تھے اور خلیجی جنگ نے ہماری سوچ کو یقین میں بدل دیا ہے۔ (صفحات 147-146)

مغرب ''اپنی طاقت فوجی تحقیق کے ذریعے تخلیق کرتا ہے اور پھر ان ترقی پذیر ملکوں کو اپنی اس تحقیق کی پیداوار فروخت کرتا ہے جو اس کے غیر فعال صارف'' ہیں۔ خود کو اس اطاعت سے نکالنے کیلئے اسلام کو لازماً اپنے انجینئر اور سائنسدان تیار کرنا ہوں گے۔ اپنے ہتھیار خود بنانا ہوں گے (آیا نیوکلیائی یا روایتی' اس خاتون نے وضاحت نہیں کی) نیز ''خود کو مغرب پر فوجی انحصار سے آزاد کروانا ہوگا۔'' (صفحات 44-43) دوبارہ کہا جاتا ہے کہ یہ نظریات کسی داڑھی والے' عمامہ پوش آیت اللہ کے نہیں ہیں۔

خواہ ان کی سیاسی اور مذہبی آرا کچھ بھی ہوں مسلم متفق ہیں کہ ان کی ثقافت اور مغربی ثقافت میں بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ جیسا کہ شیخ غنوشی نے کہا ہے ''بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے مغرب کے مقابلے میں اقدار پر استوار ہیں۔'' ایک مصری حکومتی اہلکار نے کہا امریکی ''یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم ان جیسے ہو جائیں۔ وہ ہماری اقدار یا ہماری ثقافت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔'' ایک مصری صحافی متفق ہے کہ ''ہم مختلف ہیں۔ ہمارا ماضی (بیک گراؤنڈ) مختلف ہے' ایک مختلف تاریخ ہے۔ مختلف مستقبل ہمارا حق ہے۔'' عوامی اور دانشورانہ طور پر سنجیدہ مسلم کتابوں میں بار بار بیان کیا جاتا ہے کہ مغرب اسلامی اداروں اور ثقافت کو محکوم بنانے' تحقیر کرنے اور جڑیں کاٹنے کیلئے منصوبے اور سازشیں گھڑتا ہے۔

مغرب کے خلاف ردعمل نہ صرف اسلامی احیا کی مرکزی دانشورانہ تحریروں میں پایا جا سکتا ہے بلکہ مسلم ملکوں کی مغرب کے حوالے سے رجحانات میں تبدیلی سے بھی عیاں ہے۔

البعد نو آبادیاتی دور میں قائم ہونے والی حکومتیں عمومی طور پر اپنے سیاسی اور معاشی تصورات ور پالیسیوں میں مغربی تھیں اور ان کی خارجہ پالیسیاں مغرب دوست تھیں' چند مستثنیات مثلاً الجیریا اور انڈونیشیا کے علاوہ جہاں آزادی قوم پرستانہ انقلاب کے نتیجہ میں آئی تھی تاہم ایک ایک کر کے مغرب دوست حکومتوں نے ایسی حکومتوں کو راہ دے دی جو مغرب سے کم ہم آہنگ تھیں یا واضح طور پر مغرب دشمن تھیں مثلاً عراق' لیبیا' یمن' شام' ایران' سوڈان' لبنان اور افغانستان۔ اسی سمت میں کم ڈرامائی تبدیلیاں دوسری ریاستوں کی نہاد اور اتحاد میں رونما ہوئیں بشمول تیونس' انڈونیشیا اور ملائیشیا۔ امریکہ کے سرد جنگ کے دور کے دو قریب ترین اتحادی ترکی اور پاکستان داخلی طور پر اسلام پسند سیاسی دباؤ میں ہیں اور مغرب کے ساتھ ان کے بندھن تناؤ کا شکار ہو رہے ہیں۔

1995ء میں کویت وہ واحد مسلم ریاست تھی جو پچھلے دس برسوں کے مقابلے میں زیادہ واضح طور پر مغرب دوست تھی۔ مسلم دنیا میں مغرب کے قریبی دوست اب یا تو کویت' سعودی عرب ہیں جو مغرب پر فوجی حوالے سے انحصار کرتی ہیں یا مصر اور الجیریا ہیں جو اس پر معاشی حوالے سے انحصار کرتے ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتیں اس وقت منہدم ہو گئیں جب واضح ہو گیا کہ سوویت یونین ان کو مزید فوجی اور معاشی امداد نہ مہیا کر سکتا ہے اور نہ کرے گا۔ اگر یہ واضح ہو گیا کہ مغرب مزید اپنی طفیلی مسلم حکومتوں کا انتظام نہیں کر سکے گا تو انہیں بھی اسی طرح کے انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بڑھتی ہوئی مسلم مغرب دشمنی مغرب کی اس فکرمندی کے مساوی ہے جو مسلم انتہا پسندی سے لاحق ہونے والے ''اسلامی خطرے'' سے پیدا ہوئی ہے۔ اسلام کو نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ' دہشت گردی اور یورپ میں غیر پسندیدہ تارکین وطن کے سرچشمے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ خدشات عوام اور لیڈر ہر دو میں مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر نومبر 1994ء میں پوچھا گیا کہ کیا ''اسلامی احیا'' مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کیلئے خطرہ ہے تو 35,000 نمونے کے خارجہ پالیسی میں دلچسپی رکھنے والے امریکیوں میں سے 61 فیصد نے کہا ہاں اور صرف 28 فیصد نے کہا نہیں۔ ایک سال پہلے جب پوچھا گیا کہ

کون سا ملک امریکہ کیلئے سب سے زیادہ خطرے کا باعث ہے تو عوام کے ایک عمومی نمونے نے ایران، چین اور عراق کو تین چوٹی کے ملکوں کے طور پر چنا۔ اسی طرح 1994ء میں امریکہ کو درپیش ''سخت خطروں'' کی نشاندہی کرنے کا کہا گیا تو 72 فیصد عوام اور 61 فیصد خارجہ پالیسی لیڈروں نے کہا نیوکلیائی ہتھیاروں کا پھیلاؤ، نیز 69 فیصد عوام اور 33 فیصد لیڈروں نے کہا بین الاقوامی دہشت گردی ------------------ دو مسائل جو وسیع طور پر اسلام سے جڑے ہوئے ہیں۔ مزید برآں 33 فیصد عوام اور 39 فیصد لیڈر اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ کو ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ یورپی لوگوں میں بھی یہی تصورات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر 1991ء کے موسم بہار میں فرانسیسی عوام کے 51 فیصد نے کہا کہ ان کے خیال میں فرانس کو جنوب سے بڑا خطرہ درپیش ہے جبکہ صرف 8 فیصد نے کہا کہ یہ خطرہ مشرق سے لاحق ہے۔ چار ملک جن سے فرانسیسی عوام کو سب سے زیادہ ڈر محسوس ہوتا ہے چاروں مسلم ہیں۔ یعنی عراق 52 فیصد، ایران 35 فیصد، لیبیا 26 فیصد اور الجیریا 22 فیصد۔ مغرب کے سیاسی لیڈروں نے بشمول جرمن چانسلر اور فرانسیسی وزیراعظم اسی طرح کی فکرمندی کا اظہار کیا ہے۔ ناٹو کے سیکرٹری جنرل نے 1995ء میں واضح کیا کہ اسلامی بنیاد پرستی ''کم از کم کمیونزم ہی کی طرح مغرب کیلئے خطرناک'' ہے اور کلنٹن انتظامیہ کے ''ایک بہت سینئر رکن'' کا موقف ہے کہ اسلام مغرب کا گلوبل رقیب ہے۔

مشرق سے کسی فوجی خطرے کے غائب ہو جانے کے بعد ناٹو کی منصوبہ بندی کا رخ زیادہ سے زیادہ جنوب سے درپیش ممکنہ خطروں کی طرح ہوتا جا رہا ہے۔ ایک امریکی فوجی تجزیہ نگار نے 1992ء میں کہا ''جنوبی ٹائر نے'' مرکزی محاذ کی جگہ لے لی ہے اور ''تیزی سے ناٹو کا نیا محاذ اول بن رہا ہے۔'' اس جنوبی خطرے سے نمٹنے کیلئے ناٹو کے جنوبی اراکین ---- اٹلی، فرانس، سپین اور پرتگال نے مشترکہ فوجی منصوبہ بندی اور آپریشن شروع کر دیئے ہیں نیز عین اسی اثنا میں اسلام پرست انتہا پسندوں سے ٹکراؤ کیلئے مغرب کی حکومتوں سے صلاح مشورے شروع کر دیئے ہیں۔ ان خطروں ہی نے امریکہ کیلئے یورپ میں مستقل فوجی موجودگی کا جواز پیدا کر دیا ہے۔ ایک سابق امریکی افسر نے رائے دی ''جبکہ یورپ

میں موجود امریکی افواج بنیاد پرست اسلام کے پیدا کردہ مسائل کا تدارک نہیں ہیں۔ ان افواج نے سارے علاقے میں فوجی منصوبہ بندی پر اپنا طاقتور سایہ ڈال رکھا ہے۔ امریکی اور برطانوی افواج کی خلیجی جنگ میں 91-1990ء میں صف آرائی کو یاد کیجئے۔ اس خطے میں وہ یہی کریں گے'' اور اس کو یہ ضرور اضافہ کرنا چاہئے تھا وہ اسے خوف' غصے و ناخوشی اور نفرت سے یاد کریں۔

مسلموں اور مغربیوں نے ایک دوسرے کے حوالے سے مذکورہ بالا تصورات قائم کرکے اسلام پرستانہ انتہا پسندی کو بڑھایا ہے۔ اس بات پر مشکل ہی سے حیرانی ہوگی کہ 1979ء کے ایرانی انقلاب کے بعد سے مغرب اور اسلام کے درمیان ایک بین التہذیبی ظاہری جنگ جاری ہے۔ یہ تین وجوہات سے ایک ظاہری جنگ ہے۔ اول: سارے کا سارا اسلام سارے کے سارے مغرب سے نہیں لڑ رہا۔ دو بنیاد پرست ریاستیں (ایران' سوڈان) تین غیر بنیاد پرست ریاستیں (عراق' لیبیا' شام) بشمول اسلام پسند تنظیموں کی وسیع تعداد کے جنہیں سعودی عرب جیسے ملکوں سے مالی امداد ملتی ہے امریکہ اور بعض اوقات فرانس' برطانیہ اور دوسری مغربی ریاستوں اور گروپوں جیسے کہ عموماً اسرائیل اور یہودیوں کے خلاف ہی لڑ رہے ہیں۔ دوم: یہ ایک ظاہری جنگ ہے کیونکہ سوائے 91-1990ء کی خلیجی جنگ کے اس کو محدود ذرائع کی مدد سے لڑا جا رہا ہے یعنی دہشت گردی ایک طرف ہے اور دوسری طرف فضائی طاقت' مخفی چالیں اور معاشی پابندیاں ہیں۔ سوم: یہ ایک ظاہری جنگ ہے کیونکہ گو کہ تشدد جاری ہے تاہم یہ مسلسل نہیں ہوتا رہا ہے۔ اس میں ایک فریق کی طرف سے وقفے وقفے سے ہونے والا ایکشن دوسرے فریق کو جواب پر اکساتا ہے تاہم ایک ظاہری جنگ ہوتی تو جنگ ہی ہے۔ جنوری' فروری 1991ء میں ہونے والی مغربی بمباری سے دسیوں ہزاروں عراقی سپاہیوں اور شہریوں کی ہلاکتوں کو خارج بھی کر دیا جائے تو 1979ء سے لے کر اب تک ہر سال ہونے والی ہلاکتیں ہزاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ خلیج کی ''حقیقی'' جنگ میں ہلاک ہونے والے مغربیوں سے زیادہ اس بظاہر جنگ میں ہلاک ہو چکے ہیں۔

مزید یہ کہ دونوں فریقین اس جھگڑے کو جنگ تسلیم کرتے ہیں۔ خمینی نے پہلے ہی قطعی

حتمی انداز میں واضح کر دیا تھا ''ایران' امریکہ کے ساتھ جنگ کر رہا ہے۔'' اور قذافی مغرب کے خلاف باقاعدگی سے مقدس جنگ کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ دوسری مسلم انتہا پسند ریاستوں اور گروپوں کے لیڈر اسی طرح کے الفاظ میں بات کرتے ہیں۔ مغربی سمت سے امریکہ نے سات ملکوں کو ''دہشت گرد ریاستیں'' قرار دے رکھا ہے جن میں سے پانچ مسلم ہیں (ایران' عراق' شام' لیبیا' سوڈان) کیوبا اور شمالی کوریا باقی دوسرے دہشت گرد ملک ہیں۔ نتیجتاً اس سے دونوں ایک دوسرے کے دشمن قرار پا گئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے استعمال میں آنے والے سب سے زیادہ موثر ہتھیار امریکہ اور اس کے دوستوں کے خلاف استعمال کر چکے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ حالت جنگ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ امریکی افسران بار بار ان ریاستوں کو ''ماورائے قانون'' اور ''بدمعاش'' ریاستیں قرار دیتے ہیں' انہیں بین الاقوامی مہذب نظام سے خارج قرار دیتے ہیں اور انہیں کئی فریقی یا یک فریقی جوابی اقدامات کا نشانہ قرار دیتے ہیں۔ امریکی حکومت ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بم حملوں کو ''امریکہ کے خلاف شہری دہشت گردی کی جنگ'' قرار دیتی ہے اور مین ہٹن میں ہونے والے مزید بم حملوں کو ان سازشیوں کی چال قرار دیتی ہے جو امریکہ کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اگر مسلم مغرب پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ کر رہا ہے اور مغرب الزام لگاتا ہے کہ اسلام مغرب کے خلاف جنگ کر رہا ہے تو اس کا نتیجہ یہی نکالا جانا چاہئے کہ کوئی جنگ جیسی شے عمل میں ہے۔

اس ظاہری جنگ میں ہر فریق اپنی طاقتوں اور دوسرے کی کمزوریوں کو بڑھانے میں مصروف ہے۔ فوجی حوالے سے یہ دہشت گردی اور فضائی طاقت کے مابین جنگ ہے۔ سر پھرے اسلامی عسکریت پسند مغرب کے کھلے معاشروں کو استعمال کرتے ہیں اور منتخب اہداف پر کار بم سے حملے کرتے ہیں۔ مغربی فوجی پیشہ ور اسلام کے کھلے آسمانوں کو استعمال کرتے ہیں اور منتخب اہداف پر سمارٹ بم گراتے ہیں۔ اسلام پسند اہم مغربیوں کے قتل کے منصوبے بناتے ہیں۔ امریکہ اسلامی انتہا پسند حکومتوں کے تخت الٹنے کے منصوبے تیار کرتا ہے۔ 1980ء سے 1995ء کے پندرہ برسوں میں امریکی محکمۂ دفاع کے مطابق امریکہ مشرق

وسطیٰ میں سترہ فوجی آپریشنز میں ملوث رہا جو سب کے سب براہ راست مسلموں کے خلاف تھے۔ امریکہ نے اس قسم کا کوئی ملٹری آپریشن کسی دوسری تہذیب کے خلاف کبھی نہیں کیا۔

آج تک دونوں فریقوں نے تشدد کی شدت کو موزوں حد تک کم درجوں میں ہی رکھا ہے۔ نیز تشدد کی سرگرمیوں کو جنگی اقدامات قرار نہیں دیا جو کہ بھرپور جواب کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اکنامسٹ تبصرہ کرتا ہے ''اگر لیبیا اپنے کسی سب میرین کو حکم دے کہ امریکی جہاز کو ڈبو دیا جائے تو امریکہ اسے کسی حکومت کا جنگی اقدام تعبیر کرے گا نہ کہ سب میرین کمانڈر کی حوالگی کا مطالبہ کرے گا۔ اصولی طور پر لیبیا کی سیکرٹ سروس کی طرف سے ایک ہوائی جہاز پر بم حملہ اس سے مختلف نہیں ہے۔'' تاہم اس جنگ کے فریق' سرد جنگ کے دوران میں امریکہ اور سوویت یونین کے ایک دوسرے کے خلاف استعمال کئے گئے حربوں کے مقابلے میں زیادہ پرتشدد حربے استعمال کر رہے ہیں۔ بہت ہی شاذ مستثنیات کے علاوہ کسی بھی سپر پاور نے مقصد کے تحت شہری تو کجا فوجیوں کے متعلقین کو بھی ہلاک نہیں کیا تھا۔ تاہم اس ظاہری جنگ میں ایسا مسلسل ہو رہا ہے۔

امریکی لیڈر الزام دیتے ہیں کہ اس بظاہر جنگ میں ملوث مسلم اقلیت میں ہیں جن کے تشدد کو استعمال کرنے کو معتدل مسلموں کی اکثریت رد کر چکی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ درست ہو لیکن اس کے شواہد دستیاب نہیں ہیں۔ مغرب دشمن تشدد کے خلاف مظاہرے بھی مسلم ملکوں میں مکمل طور پر نہیں ہوئے ہیں۔ مسلم حکومتیں حتیٰ کہ مغرب پر انحصار کرنے والی اور مغرب کی دوست حکومتیں بھی' مغرب کے خلاف ہونے والے دہشت گردی کے اقدامات کی مذمت کے وقت کم ہی زبان کھولتی ہیں۔ دوسری طرف یورپی حکومتیں اور عوام امریکہ کے اپنے مخالف مسلموں کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات کی وسیع پیمانے پر حمایت اور کبھی کبھار ہی تنقید کرتے ہیں جبکہ یہ رویہ سرد جنگ میں سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف امریکی اقدامات کی مخالفت میں اکثر ظاہر ہونے والی مذمت سے بہت کم ہے۔ تہذیبی تصادم میں قبیلہ قبیلے کے شانہ بشانہ کھڑا ہوتا ہے۔

مغرب کیلئے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے۔ یہ تو اسلام ہے' ایک مختلف

تہذیب جس کے لوگ اپنی شناخت کی برتری کے قائل ہیں نیز اپنی طاقت کی کمتری کے خبط کا شکار ہیں۔ اسلام کیلئے سی آئی اے یا امریکی محکمۂ دفاع مسئلہ نہیں ہے یہ تو مغرب ہے' ایک مختلف تہذیب جس کے لوگ اپنی ثقافت کی آفاقیت کے قائل ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کی برتر' اگرچہ زوال پذیر طاقت ان پر ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ اس ثقافت کو ساری دنیا پر محیط کر دیں۔ یہ ہیں وہ بنیادی اجزائے ترکیبی جو اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کی آگ کا ایندھن ہیں۔

ایشیا' چین اور امریکہ

تہذیبوں کا کڑھاؤ

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایشیا' خصوصاً مشرقی ایشیا میں ہونے والی معاشی تبدیلیاں دنیا میں اپنی نوعیت کی اہم ترین ترقیاں ہیں۔ 1990ء کی دہائی سے اس معاشی ترقی نے بہت سے تبصرہ نگاروں کو معاشی یاوہ گوئی میں مبتلا کر دیا جو مشرقی ایشیا اور سارے ایشیا کو ہمیشہ پھیلتے ہوئے تجارتی جال (نیٹ ورک) میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے دیکھتے تھے جو کہ قوموں کے مابین امن اور ہم آہنگی کا ضامن ہوگا۔ یہ رجائیت' امید پرستی اس انتہائی مفروضے پر استوار تھی کہ تجارتی ادلا بدلی امن قائم کرنے والی قوت ہے۔ تاہم معاملہ یوں نہیں تھا۔ معاشی ترقی ملکوں کے اندر اور ملکوں کے درمیان سیاسی عدم استحکام پیدا کرتی ہے' ملکوں اور علاقوں کے درمیان طاقت کا توازن بدلتی ہے۔ معاشی تبادلہ لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ تو قائم کرتا ہے' یہ انہیں متفق نہیں بناتا ہے۔ تاریخی حوالے سے یہ لوگوں کے درمیان اختلافات کی گہری آگہی پیدا کرتا ہے اور دوطرفہ خوف کو بڑھاتا ہے۔ تجارت منافع کے ساتھ ساتھ ملکوں کے درمیان جھگڑوں کو بھی پیدا کرتی ہے۔ اگر ماضی کے تجربے کو پیش نظر رکھا جائے تو ایشیا کی معاشی دھوپ ایک سیاسی سایوں والا ایشیا پیدا کرے گی۔ ایک عدم استحکام اور تصادم والا ایشیا۔

ایشیا کی معاشی ترقی اور ایشیائی معاشروں کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی بین الاقوامی سیاست کو تین طریقوں سے خراب کر رہی ہے۔ اول: معاشی ترقی نے ایشیائی ریاستوں کو اپنی فوجی استعداد بڑھانے' ان ملکوں کے مابین مستقبل کے تعلقات میں غیر یقینیت بڑھانے کے قابل بنایا ہے نیز سرد جنگ کے زمانے میں دب جانے والے مسائل اور رقابتوں کو نئے سرے سے ابھار دیا ہے جس کی وجہ سے علاقے میں تصادم اور عدم استحکام کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ دوم: معاشی ترقی نے مغرب اور ایشیائی معاشروں کے درمیان جھگڑوں کی شدت کو بڑھا دیا ہے' بنیادی طور پر امریکہ کے ساتھ۔ نیز ایشیائی معاشروں کی ان کشمکشوں میں غالب آنے کی اہلیت کو مضبوط بنا دیا ہے۔ سوم: ایشیا کی عظیم طاقت کی معاشی ترقی نے چین کے اثر کو علاقے میں بڑھا دیا ہے اور چین اسی سبب سے مشرقی ایشیا پر اپنی روایتی اجارہ داری کا دوبارہ اثبات کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ دوسری قوموں کو مجبور کر رہا ہے کہ یا تو وہ اس کی ''بینڈ ویگن'' میں سوار ہو کر اس کے حاشیہ بردار بنیں اور اس پیش رفت میں خود کو ہم آہنگ کریں یا ''توازن'' قائم کریں اور چینی اثر کو روکنے کی کوشش کریں۔

کئی صدیوں کے دوران میں بین الاقوامی تعلقات میں مغربی بالادستی جو کہ بڑی مغربی طاقتوں کے درمیان طاقت کا کھیل شمار ہوتی ہے پہلے تو روس کی 18 ویں صدی میں اور بعد ازاں بیسویں صدی میں جاپان کی شرکت سے بڑھ گئی تھی۔ یورپ اس عظیم طاقت کے تصادم اور تعاون کا اکھاڑا تھا حتیٰ کہ سرد جنگ کے زمانے میں سپر پاوروں کے جھگڑے کا بڑا خط یورپ کے دل سے گزرتا تھا۔ جہاں تک بین الاقوامی تعلقات کا تعلق ہے جو سرد جنگ میں شمار میں آتے تھے تو دنیا کے پاس ایک ابتدائی میدان ہے۔ یہ میدان ایشیا اور خاص طور پر مشرقی ایشیا ہے۔ ایشیا تہذیبوں کا کڑھاؤ ہے۔ صرف مشرقی ایشیا میں چھ تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے معاشرے ہیں--- جاپانی' چینی' آرتھوڈوکس' بدھ' مسلم اور مغربی نیز جنوبی ایشیا میں ہندوؤں کا اضافہ ہے۔ چار تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں جاپان' چین' روس اور امریکہ مشرقی ایشیا کے سٹیج کے بڑے اداکار ہے' جنوبی ایشیا میں ہندوستان کا اضافہ ہے' انڈونیشیا ایک ابھرتی ہوئی مسلم طاقت ہے۔ مزید یہ کہ مشرقی ایشیا میں بڑھتی ہوئی

معاشی قوت رکھنے والی درمیانے درجے کی بہت سی طاقتیں ہیں مثلاً جنوبی کوریا' تائیوان اور ملائیشیا بشمول ایک چھپی ہوئی مضبوطی رکھنے والا ویتنام۔ نتیجہ ہے بین الاقوامی تعلقات کا ایک انتہائی پیچیدہ پیٹرن جس کا موازنہ بہت سے حوالوں سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں موجود بین الاقوامی تعلقات کے پیٹرن سے ہو سکتا ہے اور جو کئی فریقی صورتحالات کو تشکیل دینے والے غیر یقینی پن اور سیالیت سے بھرا ہوا ہے۔

مشرقی ایشیا کی کثیر طاقتی' کثیر التہذیبی ساخت اسے مغربی یورپ سے ممتاز کرتی ہے اور معاشی اور سیاسی اختلاف اس فرق کو بڑھاتے ہیں۔ مغربی یورپ کے سارے ملک مستحکم جمہوریتیں ہیں' منڈی کی معیشت رکھتے ہیں اور معاشی ترقی کے عروج پر ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے وسط میں مشرقی ایشیا میں ایک مستحکم جمہوریت' کئی نئی اور غیر مستحکم جمہوریتیں' دنیا میں بچنے والی پانچ کمیونسٹ آمریتوں میں سے چار' بشمول فوجی حکومتیں' شخصی آمریتیں اور ایک جماعت کے غلبے والے آمرانہ ویتنام اور جنوبی کوریا تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ منڈی کی معیشت قائم ہونے اور معاشی کھلے پن کا ایک عمومی رجحان موجود ہے لیکن ساری صورتحال جنوبی کوریا کی کمانڈ معیشت کے تحت چل رہی ہے جو کہ حکومتی کنٹرول والی اور پرائیویٹ انٹرپرائز سے لے کر ہانگ کانگ کی آزاد تجارت والی معیشت کے آمیزے پر مشتمل ہے۔

یہ بات الگ ہے کہ چین علاقے میں وقتاً فوقتاً نظم و ضبط قائم کر دیتا ہے۔ مشرقی ایشیا میں ایک بین الاقوامی معاشرہ (اصطلاح کے برطانوی مفہوم میں) موجود نہیں ہے جیسا کہ مغربی یورپ میں ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر تک یورپ بین الاقوامی اداروں کے مضبوط جال کے ذریعے آپس میں منسلک ہو چکا تھا یعنی یورپی یونین' ناٹو' مغربی یورپی یونین' کونسل آف یورپ' آرگنائزیشن آف سکیورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ اور دیگر۔ مشرقی ایشیا میں آسیان (ASEAN) کے علاوہ موازنے کیلئے کچھ بھی نہیں' اور اس میں بھی بڑی طاقتیں شامل نہیں ہیں' عمومی طور پر سلامتی کے معاملوں میں کنارہ کش رہتی ہے اور معاشی اتحاد کی انتہائی ابتدائی صورتوں کی طرف صرف ایک آغاز ہے۔ 1990ء کی دہائی میں زیادہ وسیع

تنظیم ایپک (APEC) جس میں زیادہ تر بحر الکاہل کے ساحلی ملک شامل تھے وجود میں آئی لیکن یہ آسیان ہی کی طرح کی کمزور چوپال (Talking Shop) ہے۔ کوئی اور بڑا کثیر فریقی ادارہ یا تنظیم بڑی ایشیائی طاقتوں کو باہم مربوط کرنے کیلئے موجود نہیں ہے۔

مشرقی ایشیا میں ریاستوں کے درمیان تصادم کے بیج مغربی یورپ کے برعکس زیادہ ہیں۔ خطرے کے دو علاقے تو واضح طور پر شناخت ہو چکے ہیں یعنی دو کوریا اور دو چین۔ تاہم یہ سرد جنگ کی باقیات ہیں۔ نظریاتی اختلافات اہمیت کھو رہے ہیں اور 1995ء میں دونوں چینیوں کے درمیان تعلقات میں اہم وسعت آئی ہے نیز دونوں کوریاؤں میں پروان چڑھنا شروع ہو گئی ہے۔ اس بات کا امکان تو موجود ہے کہ کوریائی کوریائیوں سے لڑیں لیکن کم ہے جبکہ چینیوں کی چینیوں سے لڑائی کے امکانات بہت زیادہ ہیں لیکن اس وقت تک محدود ہیں جب تک تائیوان اپنی چینی شناخت چھوڑ کر باقاعدہ طور پر ایک آزاد جمہوریہ تائیوان قائم نہیں کرتا۔ ایک چینی دستاویز میں ایک جنرل کہتا ہے "خاندان کے افراد کے درمیان لڑائی کی حدیں ہوا کرتی ہیں۔" اگرچہ دو کوریاؤں یا دو چینیوں کے درمیان تشدد کا امکان برقرار ہے۔ تاہم ثقافتی اشتراکات اس امکان کو وقت گزرنے کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔

مشرقی ایشیا میں تصادمات سرد جنگ کا ورثہ ہیں اور پرانی رقابتوں اور نئے معاشی رشتوں کو منعکس کرنے والے تصادمات بڑھ رہے ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں مشرقی ایشیا کی سلامتی کے حوالے سے تجزیے مشرقی ایشیا کو "ایک خطرناک ہمسایہ" قرار دیتے تھے۔ رقابت کیلئے پختہ "بہت سی سرد جنگوں" کا علاقہ "مستقبل کو واپس آتا ہوا" جس میں جنگ اور عدم استحکام کا غلبہ ہوگا۔ مغربی یورپ کے برعکس، مشرقی ایشیا میں 1990ء کی دہائی میں علاقائی جھگڑے حل نہیں ہوئے جن میں سب سے زیادہ اہم روس اور جاپان کے درمیان جنوبی جزیروں پر جھگڑا نیز چین، ویتنام، فلپائن اور جنوبی چینی سمندر پر دوسری مشرقی ایشیائی ریاستوں کے درمیان پوشیدہ جھگڑے کا امکان۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف روس اور ہندوستان کے درمیان سرحدی اختلافات 1990ء کی دہائی کے دوران میں کم ہوئے لیکن دوبارہ سطح پر آسکتے تھے جیسا کہ چین، منگولیا پر دعویٰ کر سکتا تھا۔ منڈ اناؤ، مشرقی تیمور، تبت،

جنوبی تھائی لینڈ اور مشرقی میانمار میں علیحدگی کی تحریکیں، جن میں بیشتر کو بیرونی امداد حاصل ہے، موجود ہیں۔ مزید برآں جبکہ 1990ء کی دہائی کے دوران میں مشرقی ایشیا میں بین الریاستی امن موجود تھا، گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں بڑی جنگیں کوریا اور ویتنام کے درمیان ہوئیں نیز ایشیا کی مرکزی طاقت چین امریکیوں سے لڑا بشمول قریباً اپنے سارے ہمسایوں کوریائیوں، ویتنامیوں، قوم پرست چینیوں، ہندوستانیوں، تبتیوں اور روسیوں کے۔ 1993ء میں چینی فوج کے ایک تجزیے میں آٹھ گرم مقامات کی نشاندہی کی گئی جہاں سے چین کی فوجی سلامتی کو خطرات درپیش تھے نیز چین کے مرکزی فوجی کمیشن نے نتیجہ نکالا کہ عمومی طور پر مشرقی ایشیا کا سلامتی کا منظر ''بہت دھندلا'' تھا۔ صدیوں کے بعد مغربی یورپ پر امن ہے اور جنگ کے متعلق سوچ بھی موجود نہیں ہے۔ مشرقی ایشیا میں ایسا نہیں ہے اور جیسا کہ ارون فرائیڈ برگ نے رائے دی ہے کہ یورپ کا ماضی ایشیا کا مستقبل ہو سکتا ہے۔

1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے دوران میں معاشی حرکیات، علاقائی جھگڑوں اور سیاسی غیر یقینیوں نے مشرقی ایشیائی فوجی بجٹوں میں نمایاں اضافے کو انگیخت کیا ہے۔ اپنی نئی دولت کو اور بہت سی مثالوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ آبادی کو استعمال کرتے ہوئے مشرقی ایشیائی حکومتیں اپنی بڑی سازوسامان سے کم لیس ''کسان'' فوجوں کو چھوٹی، زیادہ پیشہ ور، تکنیکی طور پر جدید فوجی طاقتوں سے بدل رہی ہیں۔ مشرقی ایشیا میں امریکی وعدے کے حوالے سے بڑھتے ہوئے شک نے ملکوں کو فوجی خود انحصاری پر اکسایا ہے جبکہ مشرقی ایشیائی ریاستیں یورپ، امریکہ اور سابق سوویت یونین سے مسلسل بھاری مقدار میں ہتھیار درآمد کر رہی ہیں۔ انہوں نے ٹیکنالوجی کی درآمد کو ترجیح دی ہے جو کہ انہیں اس اہل بنا دے گی کہ وہ جدید ہوائی جہاز، میزائل اور الیکٹرانک آلات خود بنا سکیں۔ جاپان اور چینی ریاستیں...... چین، تائیوان، سنگاپور اور جنوبی کوریا جدید ہتھیاروں کی صنعتیں تیزی سے قائم کر رہے ہیں۔ مشرقی ایشیا کے جغرافیے کے تناظر میں ان کا زور فوجی بڑھوتری اور بحری استعدادوں کو بڑھانے پر رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ قومیں جو پہلے ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے فوجی حوالے سے اہل نہیں تھیں وہ اب تیزی سے اس اہل ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ فوجی

نیاریاں شفاف نہیں ہیں لہٰذا زیادہ شکوک اور غیر یقینی پن پیدا کر رہی ہیں۔ بدلتے ہوئے طاقت کے رشتوں کی صورتحال میں ہر حکومت ضروری اور منطقی طور پر حیرانی سے سوچتی ہے۔ ''اب سے دس برسوں میں کون میرا دشمن ہوگا اور کون' اگر کوئی ہو تو' میرا دوست ہوگا۔''

ایشیائی امریکی سرد جنگیں

1980ء کی دہائی کے آخر اور 1990ء کی دہائی کے شروع میں امریکہ اور ایشیائی ملکوں کے درمیان ماسوائے ویتنام تعلقات تیزی سے معاندانہ ہو گئے ہیں نیز ان جھگڑوں میں امریکہ کی غلبہ پانے کی صلاحیت کو زوال آیا ہے۔ یہ رجحانات مشرقی ایشیا کی بڑی طاقتوں کے حوالے سے خاص طور پر نمایاں ہوئے ہیں نیز امریکہ کے چین اور جاپان کے ساتھ تعلقات مساوی راہوں پر گامزن ہیں۔ ایک طرف تو امریکی اور دوسری طرف چینی اور جاپان ان ملکوں کے درمیان چھڑتی ہوئی سرد جنگوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ یہ رجحانات بش انتظامیہ کے دور میں شروع ہوئے اور کلنٹن انتظامیہ کے دور میں مضبوط ہو گئے۔ 1990ء کی دہائی سے دونوں بڑی ایشیائی طاقتوں کے ساتھ امریکی تعلقات بہت اچھے بھی کہے جائیں تو ''تنے ہوئے'' کہے جا سکتے ہیں نیز بظاہر ان کے کم ہونے کے امکانات قلیل ہیں۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں جاپانی امریکی تعلقات میں بہت سے مسائل کے حوالے سے تعلقات کی نوعیت مناقشانہ ہو گئی۔ ان مسئلوں میں شامل تھے خلیج کی جنگ میں جاپان کا کردار' جاپان میں امریکہ کی فوجی موجودگی' چین اور دوسرے ملکوں کے حوالے سے امریکہ کی انسانی حقوق کی پالیسیوں کے سلسلہ میں جاپان کی شرکت اور سب سے زیادہ اہم مسئلہ تھا معاشی تعلقات خصوصاً تجارت۔ تجارت کے حوالے سے جنگیں معمول بن چکی ہیں۔ امریکی افسران خصوصاً کلنٹن انتظامیہ کے افسران جاپان سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں طلب کر رہے تھے۔ جاپانی افسران ان کی بھرپور مزاحمت کر رہے ہیں۔ جاپان اور امریکہ کا ہر تجارتی جھگڑا پہلے کی نسبت زیادہ تھا اور اس کا حل کیا جانا بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ

مشکل تھا۔ مثال کے طور پر مارچ 1994ء میں صدر کلنٹن نے ایک ایسے حکم نامے پر دستخط کئے جو انہیں جاپان پر سخت تجارتی پابندیاں لگانے کا اختیار دیتا تھا جس پر نہ صرف جاپان بلکہ گیٹ (GATT) جو کہ دنیا کی مرکزی تجارتی تنظیم ہے کے سربراہ نے بھی احتجاج کیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد جاپان نے امریکہ کی پالیسیوں پر حملہ کرتے ہوئے اس کا جواب دیا اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد امریکہ نے جاپان پر باضابطہ الزام لگایا کہ وہ امریکی کمپنیوں کو سرکاری ٹھیکے دینے میں امتیازی رویے اپنا رہا ہے۔ 1995ء کے موسم بہار میں کلنٹن انتظامیہ نے دھمکی دی کہ وہ جاپان کی لگژری کاروں پر سو فیصد ٹیرف لگا دے گا۔ یہ واضح رہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی جنگ جاری ہے جو 1990ء کی دہائی کے وسط سے اس نقطے پر پہنچ گئی کہ اعلیٰ جاپانی سیاسی شخصیات نے جاپان میں امریکہ کی فوجی موجودگی پر سوال کرنے شروع کر دیئے۔

ان برسوں کے دوران دونوں ملکوں کے عوام میں ایک دوسرے کے خلاف رائے پیدا ہوئی۔ 1985ء میں 87 فیصد امریکی عوام نے کہا کہ وہ جاپان کے حوالے سے عمومی طور پر دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ 1990ء میں یہ تناسب 67 فیصد ہو گیا اور 1993ء میں بمشکل 50 فیصد امریکی جاپان کے حامی تھے اور قریباً دو تہائی نے کہا کہ وہ جاپانی مصنوعات خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ 1985ء میں 73 فیصد جاپانیوں نے امریکی جاپانی تعلقات کو دوستانہ قرار دیا تھا۔ 1993ء میں 64 فیصد نے انہیں غیر دوستانہ قرار دیا۔ 1991ء کا سال عوامی رائے میں اہم تبدیلی کے حوالے سے اہم ہے۔ اس برس دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو سوویت یونین سمجھنا شروع کر دیا۔ پہلی مرتبہ امریکیوں نے سوویت یونین کی جگہ جاپان کو امریکی سلامتی کیلئے ایک خطرہ سمجھنا شروع کیا اور پہلی مرتبہ جاپانیوں نے امریکہ کو سوویت یونین کی طرح جاپان کی سلامتی کیلئے خطرہ سمجھنا شروع کر دیا۔

عوامی رویوں میں تبدیلی کا موازنہ اشرافیہ کی سوچ میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ امریکہ میں عالموں، مدبروں اور سیاسی نظر ثانی پسندوں کا ایک اہم گروپ ابھرا جس نے دونوں ملکوں کے ثقافتی اور ساختیاتی فرق پر زور دیا نیز جاپان کے ساتھ معاشی معاملات پر سخت اصولوں

کے تحت برتاؤ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ میڈیا' غیر افسانوی کتب و رسائل اور عوامی (پاپولر) ناولوں میں جاپان کا امیج زیادہ غیر پسندیدہ ہو گیا۔ اسی طرح جاپان میں سیاستدانوں کی ایک نئی نسل نمودار ہوئی ہے جس نے دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں اور بعد میں امریکی قوت کا تجربہ نہیں کیا ہے۔ انہیں جاپان کی معاشی کامیابیوں پر بے حد فخر ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے برعکس امریکی مطالبات کی مزاحمت پر آمادہ ہیں۔ یہ جاپانی مزاحمتی' امریکی نظر ثانی پسندوں کے ثانی ہیں نیز دونوں ملکوں میں جاپان امریکی تعلقات کے حوالے سے مسئلوں پر سخت گیر موقف اپنانے والوں کو ووٹر زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

1980ء کی دہائی کے اواخر اور 1990ء کی دہائی کے شروع میں چین کے ساتھ بھی امریکہ کے تعلقات زیادہ بگڑ گئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعوں کے متعلق ڈینگ ژیاؤ پنگ نے ستمبر 1991ء میں کہا: انہوں نے ''ایک نئی سرد جنگ'' شروع کر دی ہے اور یہ جملہ چینی پریس میں مسلسل دہرایا گیا۔ اگست 1995ء میں حکومتی اخباری ایجنسی نے اعلان کیا کہ ''چین امریکہ تعلقات 1979ء میں دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد سب سے نچلے درجے پر پہنچ گئے ہیں۔'' چینی افسران باقاعدگی سے چینی معاملات میں مبینہ مداخلت کی مذمت کرتے رہتے ہیں۔ 1992ء کی چینی حکومت کی ایک اندرونی دستاویز میں کہا گیا ہے ''ہم کو واضح کر دینا ہو گا کہ امریکہ واحد سپر پاور بننے کے بعد سے ایک نئی اجارہ داری اور قوت کی سیاست (پاور پالیٹکس) کیلئے سفاکی کے ساتھ اقدامات کر رہا ہے نیز اس کی طاقت بھی نسبتاً زوال پذیر ہے اور اس کی کچھ کر سکنے کی بھی ایک حد ہے۔'' اگست 1995ء میں صدر جیانگ ژی من نے کہا ''مغربی طاقتیں سازش سے ایک لمحہ کیلئے بھی باز نہیں آتیں۔'' 1995ء سے چینی لیڈروں اور سکالروں میں ایک وسیع اشتراک خیال موجود ہے کہ امریکہ ''چین کو علاقائی طور پر تقسیم کرنے' سیاسی طور پر تبدیل کرنے' سٹریٹیجک حوالے سے محدود کرنے اور معاشی طور پر نقصان پہنچانے کی'' کوشش کر رہا ہے۔

ان سب الزامات کے ثبوت موجود ہیں۔ امریکہ نے تائیوان کے صدر لی کو امریکہ

بلایا ہے۔ تائیوان کو 150 ایف 16 بیچے ہیں' تبت کو ایک مقبوضہ خودمختار علاقہ قرار دیا ہے' انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے چین کی مذمت کی ہے۔ بیجنگ میں اولمپک 2000ء کو رد کر دیا ہے' ویتنام کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لے آیا ہے' چین پر ایران کو کیمیائی ہتھیاروں کے اجزاء برآمد کرنے کا الزام لگایا ہے' پاکستان کو میزائل آلات بیچنے کے الزام میں چین پر تجارتی پابندیاں لگائی ہیں اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں چین کی شمولیت میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے چین کو مزید معاشی پابندیوں کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر بداعتمادی کا الزام لگا رہے ہیں۔ امریکیوں کے مطابق چین میزائل برآمدات' دانشی جائیداد کے حقوق (انٹیلکچوئل پراپرٹی رائٹس) اور قیدیوں سے مشقت لینے کے حوالے سے ہونے والی مفاہمت (انڈرسٹینڈنگ) کی خلاف ورزی کر رہا ہے جبکہ چینیوں کے مطابق امریکہ صدر لی کے امریکہ کے دورے کے حوالے سے معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے نیز اس نے تائیوان کو ترقی یافتہ لڑاکا ہوائی جہاز فروخت کیے ہیں۔

چین کے اندر امریکہ کے حوالے سے معاندانہ سوچ رکھنے والا ایک سب سے اہم گروپ فوج ہے جو بظاہر حکومت پر دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ امریکہ کے بارے میں سخت موقف اپنائے۔ جون 1993ء میں سو چینی جنرلوں نے مبینہ طور پر ینگ کو خط بھیجا جس میں امریکہ کے حوالے سے حکومت کی ''مجہول'' پالیسی اور چین کو ''بلیک میل'' کرنے سے امریکہ کو روکنے میں ناکامی کی شکایت کی گئی تھی۔ اسی برس کے موسم خزاں میں ایک خفیہ چینی حکومتی دستاویز میں امریکہ کے ساتھ چینی فوج کے جھگڑے کی وجوہات کو واضح کیا گیا جو یہ تھیں ''چین اور امریکہ اپنے مختلف نظریات' معاشرتی نظاموں اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے اختلافات رکھتے ہیں جس کی وجہ سے چین امریکہ تعلقات کو بہتر بنانا بنیادی طور پر ناممکن ہو گا۔'' جب سے امریکیوں کو یہ یقین ہوا ہے کہ مشرقی ایشیا ''عالمی معیشت کا دل بن جائے گا...... امریکہ مشرقی ایشیا میں کوئی مضبوط مخالفت مول نہیں لے سکتا۔'' 1990ء کی دہائی کے وسط سے چینی افسران اور اداروں (ایجنسیوں) نے امریکہ کو دشمن قوت کے طور پر پیش کرنا معمول بنا لیا ہے۔

چین اور امریکہ کے درمیان بڑھتی ہوئی مخالفت کا ایک سبب داخلی سیاست بھی ہے جیسا کہ جاپان کے معاملے میں معلوم امریکی رائے تقسیم شدہ تھی۔ ہیئت مقتدرہ (اسٹیبلشمنٹ) کی کئی شخصیات چین کے ساتھ تعمیری اشتراک و تعاون قائم کرنے' معاشی رشتوں کو وسعت دینے اور قوموں کی نام نہاد برادری میں چین کو شامل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ دوسرے چین کی طرف سے امریکی مفادات کو درپیش ممکنہ خطرات پر زور دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ چین کی طرف مفاہمانہ پیش رفت سے منفی نتائج پیدا ہوں گے اور محدود رکھنے کی سخت پالیسی پر زور دیتے ہیں۔ 1993ء میں امریکی عوام نے امریکہ کیلئے سب سے زیادہ خطرناک ممالک میں ایران کے بعد چین کا نام لیا۔ امریکی سیاست اکثر علامتی اشارے پیدا کرتی ہے مثلاً لی کا کورنیل کا دورہ اور کلنٹن کی دلائی لامہ سے ملاقات جس نے چینیوں کو غصہ دلا دیا جبکہ اسی دوران امریکی حکومت معاشی مفادات کی خاطر انسانی حقوق کے حوالے سے تشویش کی قربانی دے کر سب سے زیادہ پسندیدہ قوم (ایم ایف این) برتاؤ میں وسعت پیدا کر رہی تھی۔ ادھر چینی حکومت کو چینی قوم پرستی کو فروغ دینے کیلئے ایک نئے دشمن کی ضرورت ہے نیز اقتدار و قوت کے قانونی جواز کیلئے ایک نیا دشمن مطلوب ہے۔ قوت کی جدوجہد طول پکڑتی ہے تو فوج کا سیاسی اثر و نفوذ بڑھ جاتا ہے۔ مابعد ڈینگ اقتدار و قوت کیلئے صدر جیانگ اور دوسرے مقابل چینی مفادات کے فروغ میں سستی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

ایک دہائی کے دوران میں امریکہ کے تعلقات جاپان اور چین دونوں کے ساتھ خراب ہوئے ہیں۔ ایشیائی امریکی تعلقات میں یہ تبدیلی وسیع تھی اور اتنے بہت سے مختلف مسائل پر محیط تھی کہ ایسا معلوم نہیں پڑتا تھا کہ یہ آٹو پارٹس اور کیمروں کی فروخت کی وجہ سے تھی یا فوجی بنیادوں پر۔ مزید یہ کہ یہ بات امریکہ کے قومی مفادات کے خلاف تھی کہ بیک وقت دونوں بڑی ایشیائی طاقتوں کے ساتھ امریکہ کے تعلقات معاندانہ ہو جائیں۔ سفارتکاری اور [illegible] پالیٹکس کے ابتدائی اصولوں کا تقاضا ہے کہ امریکہ کو چاہئے کہ وہ ایک طاقت کو دوسری کا مخالف بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ایک کے ساتھ تعلقات تو اچھے بنائے اگر دوسرے کے ساتھ تعلقات معاندانہ ہو گئے ہیں۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ ایشیائی امریکی تعلقات میں

جھگڑے اور عداوت کو فروغ دینے والے بہت سے وسیع عوامل کارفرما ہیں اور انفرادی مسائل کے سلجھانے کو مشکل بنا رہے ہیں۔ اس عمومی مظہر کی وجوہات عمومی ہیں:

اول: ایشیائی معاشروں اور امریکہ کے مابین وسیع ابلاغ' تجارت' سرمایہ کاری اور ایک دوسرے کے متعلق آگہی کی صورت میں بڑھے ہوئے تعامل نے مسائل کو بڑھایا ہے اور جھگڑے کو بڑھانے کی وجوہات کو جنم دیا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے تعامل نے ہر معاشرے کے افعال اور اقدار و عقائد کو دوسرے سے لاحق خطرے کا احساس پیدا کیا ہے جو کہ ایک فاصلے سے غیر نقصان دہ دکھائی پڑتے ہیں۔ دوم: 1950ء کی دہائی میں سوویت خطرے نے امریکہ جاپان باہمی سلامتی کے معاہدے کی راہ کشادہ کی تھی۔ 1970ء کی دہائی میں سوویت قوت کے فروغ نے امریکہ اور چین کے درمیان 1979ء میں سفارتی تعلقات کے قیام کی راہیں کشادہ کیں نیز اس مشترک خطرے کے بے اثر بنانے کے مشترک مفاد کے فروغ کیلئے عارضی تعاون کا سلسلہ جاری ہوا۔ سرد جنگ کے خاتمے سے امریکہ اور ایشیائی طاقتوں کا یہ مشترک مفاد ختم ہو کر رہ گیا اور اپنی جگہ کچھ بھی نہیں چھوڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن دوسرے مسئلوں پر واضح عداوت موجود تھی ابھر کر سامنے آ گئے۔ سوم: مشرقی ایشیائی ملکوں کی معاشی ترقی نے امریکہ اور ان کے درمیان قوت کے مجموعی توازن کو بدل کر رکھ ڈالا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایشیائی اپنی اقدار اور اداروں کی فوقیت اور مغربی ثقافت پر اپنی ثقافتوں کی برتری پر زیادہ سے زیادہ پکے ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف امریکی خصوصاً سرد جنگ میں اپنی فتح کے بعد سے یوں ظاہر کر رہے ہیں گویا ان کی اقدار اور ادارے آفاقیت کے حامل ہیں اور یہ کہ اب بھی ایشیائی معاشروں کی خارجی اور داخلی پالیسیوں کو تشکیل دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اس بدلتی ہوئی عالمی فضا نے امریکی اور ایشیائی تہذیبوں کے درمیان اساسی ثقافتی اختلافات کو ابھارا ہے۔ وسیع ترین سطح پر بہت سے ایشیائی معاشروں پر کنفیوشسی قومی مزاج کا تسلط ہے جو مقتدرہ' آمریت' فرد کے حقوق اور مفادات کے غصب' اجتماعی ہم آہنگی کی اہمیت' تصادم سے گریز' شرما حضوری (فیس سیونگ) اور عمومی طور پر معاشرے پر ریاست

اور معاشرے کی فرد پر برتری کی اقدار پر زور دیتا ہے۔ مزید یہ کہ ایشیائیوں میں یہ سوچ موجود ہے کہ اپنے معاشروں کو صدیوں اور ہزاریوں کے تناظر میں دیکھا جائے اور طویل المیعاد فائدہ کو ترجیح دی جائے۔ یہ رجحانات بنیادی طور پر امریکہ کے آزادی' برابری' جمہوریت اور انفرادیت پسندی کے اعتقادات کے الٹ ہیں نیز امریکہ کے حکومت پر عدم اعتماد' مقتدرہ کی مخالفت' نگرانی اور توازن کو فروغ دینے' مقابلے کی حوصلہ افزائی' انسانی حقوق کے احترام اور ماضی کو بھلانے' مستقبل کو نظرانداز کرنے اور فوری مفادات کو بڑھانے پر توجہ دینے کے رجحان کے برعکس ہیں۔ تصادم کی وجوہات بنیادی طور پر معاشرے اور ثقافت میں اختلافات ہیں۔

انہی اختلافات نے امریکہ اور بڑی ایشیائی قوتوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے خاص نتائج پیدا کئے ہیں۔ سفارتکاروں نے امریکہ اور جاپان کے مابین معاشی مسئلوں خصوصاً جاپان کی تجارت میں اضافے اور امریکی مصنوعات اور سرمایہ کاری میں رکاوٹ پیدا کرنے کے حوالے سے جنم لینے والے تنازعوں کو حل کرنے کی بہت کوششیں کی ہیں۔ جاپان امریکی مذاکرات اور سرد جنگ کے دوران ہونے والے مذاکرات میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں ملکوں میں تنازعے کی خصوصی وجہ معاشی ہے۔ جاپان دوسرے بڑے صنعتی ملکوں کے مقابلے میں کئی فیصد زیادہ تیار شدہ مصنوعات برآمد کرتا ہے۔ بڑے صنعتی ملکوں میں صرف جاپان ہی 1990ء کی دہائی کے دوران میں فاضل بجٹ لاتا رہا۔

مجموعی طور پر جاپانی معیشت مغربی معیشت دانوں کے آفاقی اصولوں کے مطابق نہیں چلتی۔ 1980ء کی دہائی میں مغربی معیشت دانوں کا یہ تجربہ ناکام ہوگیا کہ ڈالر کی قدر میں کمی سے جاپان کی تجارت میں اضافے میں کمی آجائے گی۔ یہ اضافہ ان تدابیر کے باوجود بڑھا ہے۔ ادھر امریکہ کا یورپ کے مقابلے میں تجارتی خسارہ بھی بڑھا ہے۔

1990ء کی دہائی سے امریکی اور جاپانی معیشت دانوں نے دونوں معاشی نظاموں کے بنیادی اختلافات کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک محتاط مطالعہ میں نتیجہ نکالا گیا ہے کہ جاپان کا تیار شدہ مصنوعات بہت کم مقدار میں درآمد کرنا "معیاری معاشی عوامل کے تحت

سمجھنا مشکل ہے۔'' ایک اور معیشت دان تجزیہ کرتا ہے کہ'' جاپانی معیشت مغربی منطق کی پیروی نہیں کرتی۔ جاپانیوں نے اس قسم کی معیشت وضع کی ہے کہ جو مغربی تجزیہ نگاروں کی پیش گوئی کی صلاحیت کو محدود کر دیتی ہے۔''

جاپانی معیشت کا اختصاص کیا ہے؟ بڑے صنعتی ملکوں کے درمیان جاپان کی معیشت اس لئے منفرد ہے کہ جاپانی معاشرہ منفرد طور پر غیر مغربی ہے۔ جاپانی معاشرہ اور ثقافت مغربی خصوصاً امریکی معاشرے اور ثقافت سے مختلف ہے۔ جاپان اور امریکہ کے مابین معاشی تنازعوں کے حل کا دارومدار دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے معاشرے اور ثقافت میں بنیادی تبدیلی آنے پر ہے۔ ایسی تبدیلیاں ناممکن نہیں ہیں۔ معاشرے اور ثقافتیں لازماً تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ یہ تبدیلی بڑے حادثے سے بھی رونما ہوسکتی ہے جیسے جنگ عالم گیر دوم نے دوسب سے بڑی فوجی قوت والے ملکوں کو بھیگی بلی بنا کر رکھ دیا۔ تاہم ایسا ناممکن ہے کہ جاپان یا امریکہ میں سے کوئی ایک دوسرے پر معاشی ہیروشیما مسلط کر دے۔ معاشی ترقی بھی کسی ملک کے سماجی ڈھانچے اور ثقافت کو گہرائی تک تبدیل کرسکتی ہے جیسا کہ سپین میں **1950**ء کی دہائی سے **1970**ء کی دہائی کے دوران میں رونما ہوا ہے اور شاید معاشی ثروت جاپان کو امریکہ کی طرح زیادہ صارفیت بنیاد معاشرہ بنا دے۔ **1980**ء کی دہائی میں جاپان اور امریکہ کے لوگوں میں یہ سوچ موجود تھی کہ دونوں ملکوں کو ایک سا ہونا چاہئے۔ یہ سوچ ناکام ہوگئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ معاشی اختلافات کی جڑیں دونوں معاشروں کی ثقافتوں میں ہیں۔

امریکہ اور ایشیا کے درمیان تنازعات کی وجوہات ثقافتی اختلافات میں ہیں' ان تنازعوں کا نتیجہ بدلتے ہوئے ایشیائی امریکی قوت کے تعلقات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ چند جھگڑوں میں امریکہ کی فتح کے باوجود پلڑا ایشیا کا بھاری ہے۔ امریکہ ایشیائی حکومتوں سے توقع کرتا ہے کہ وہ اسے عالمی برادری کا لیڈر تسلیم کریں اور اپنے معاشروں میں مغربی اصول اور اقدار رائج کریں جبکہ اس کے برعکس اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ ونسٹن لارڈ کے بقول ایشیائی ''اپنی کامیابیوں پر زیادہ سے زیادہ فخر کر رہے ہیں'' اور برابری کے برتاؤ

کی توقع کرتے ہیں۔ ایشیائی طاقتیں بہت سے معاملوں میں امریکہ کی نفی کر رہی ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے دوران میں امریکہ کی ایشیا سے متعلق پالیسیوں میں بدلے ہوئے توازن طاقت کے مطابق بتدریج تبدیلیاں آئی ہیں۔

ایشیا اور امریکہ کے درمیان ان ثقافتی تضادات اور بدلے ہوئے طاقت کے توازن کی وجہ سے ایشیائی معاشرے امریکہ سے تنازعات میں ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے' ایشیا اور امریکہ کے درمیان بڑھتے ہوئے تعامل (انٹرایکشن) اور امریکی طاقت میں زوال کی وجہ سے امریکہ اور جاپان نیز دوسرے ایشیائی معاشروں کے مابین تصادم سطح پر آگیا ہے اور موخر الذکر کو امریکی دباؤ کی مزاحمت کا اہل بنا دیا ہے۔ چین کے عروج نے امریکہ کیلئے بنیادی چیلنج پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ کے چین سے تنازعات جاپان کی نسبت زیادہ ہیں۔ ان میں معاشی مسائل' انسانی حقوق' تبت' تائیوان' جنوبی چینی سمندر اور ہتھیاروں کا پھیلاؤ شامل ہیں۔ کسی بھی بڑے پالیسی معاملے میں امریکہ اور چین کے مابین اشتراک موجود نہیں ہے۔ جاپان ہی کی طرح ان تنازعات کی جڑیں بھی دونوں معاشروں کی مختلف ثقافتوں میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ تاہم دونوں ملکوں کے مابین اختلاف کی وجہ یہ بھی ہے کہ چین امریکہ کو عالمی طور پر طاقت ماننے کو تیار نہیں۔ امریکہ ایشیا میں چین کی اجارہ داری یا برتری کو ماننے پر آمادہ نہیں۔ دو سو برسوں سے امریکہ یورپ میں کسی بھرپور طور پر غالب طاقت کے ظہور کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قریباً کوئی ایک سو برس سے چین کی طرف ''کھلے دروازے'' کی پالیسی کی شروعات کے ساتھ ہی امریکہ ایسی ہی کوششیں مشرقی ایشیا میں بھی کر رہا ہے۔ ان اہداف کے حصول کیلئے اس نے دو عالمی جنگیں اور شاہی جرمنی' نازی جرمنی' شاہی جاپان' سوویت یونین اور کمیونسٹ چین کے خلاف ایک سرد جنگ لڑی ہے۔

چین کی تاریخ' ثقافت' روایات' سائز' معاشی حرکیات اور شخصی تصور اس کو مشرقی ایشیا میں اجارہ دار بننے پر اکساتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس کی تیز ترین معاشی ترقی کا۔ گزشتہ دو ہزار برسوں سے چین مشرقی ایشیا میں غالب طاقت رہا ہے۔ چینی اس تاریخی کردار کو دوبارہ ادا کرنے کی

طرف زیادہ سوچ رہے ہیں اور مغرب کے تسلط اور ذلت سے نکلنے کی فکر کر رہے ہیں۔

1980ء کی دہائی کے اواخر سے چین نے اپنے بڑھتے ہوئے معاشی وسائل کو فوجی قوت اور سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے پر لگانا شروع کر دیا تھا۔ اگر اس کی معاشی ترقی جاری رہی تو تبدیلی کا یہ عمل بڑے تنازعات کو جنم دے گا۔ چین اپنے گزشتہ برسوں کے فوجی مصارف کے مقابلے میں رفتہ رفتہ زیادہ خرچ کر رہا ہے۔ چین مشرقی ایشیا میں ایک غالب قوت بننے کے راستے پر گامزن ہے۔ تجزیہ نگار چین کے عروج کو ولہیلمین جرمنی کے عروج سے مشابہہ قرار دے رہے ہیں۔ صدر لی کوان یو کا کہنا ہے کہ دنیا کو چین کی وجہ سے آئندہ تیس یا چالیس برسوں میں نیا توازن ڈھونڈنا ہوگا۔ چین انسانی تاریخ میں سب سے بڑا کھلاڑی ہے۔ اگر چین کی معاشی ترقی جاری رہی جو کہ ممکن دکھائی دیتی ہے اور اگر ایک عشرے تک مزید چین آنے والے وقتوں میں اپنا اتحاد برقرار رکھتا ہے جو کہ ممکن دکھائی دیتا ہے تو مشرقی ایشیائی ملک اور دنیا کو انسانی تاریخ کے اس سب سے بڑے کھلاڑی کے بڑھتے ہوئے اثباتی کردار کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

واضح طور پر بات کی جائے تو بیان کیا جاتا ہے کہ کسی نئی طاقت کے خلاف ریاستیں ایک یا دو طریقوں کے ملاپ کے ساتھ ردعمل کا اظہار کرتی ہیں۔ تنہا یا دوسری ریاستوں کے ساتھ اتحاد بنا کر ہی کوئی ریاست ابھرتی ہوئی طاقت کے خلاف توازن قائم کر کے اپنی سلامتی کو یقینی بناتی ہے۔ وہ اسے محدود کرتی ہے یا ضروری ہو تو اسے شکست دینے کیلئے جنگ شروع کر دیتی ہے یا پھر دوسرا راستہ یہ ہوتا ہے کہ ابھرتی ہوئی طاقت کی حاشیہ برداری شروع کر دی جاتی ہے۔

اگر چین مشرقی ایشیا میں غالب قوت کے طور پر ابھرا تو ریاستیں کیسے ردعمل کا اظہار کریں گی؟ بلاشبہ جوابات بہت وسیع ہوں گے۔ امریکہ چین کو اپنا بڑا دشمن قرار دے چکا ہے۔ لہٰذا چین کے خلاف توازن قائم کرنے والا طریقہ اپنایا جائے گا نہ کہ حاشیہ برداری والا۔

کیا چین کے ساتھ امریکہ جنگ کرنا ضروری سمجھے گا؟ امریکہ ایشیا میں اپنی فوجی موجودگی بڑھائے گا' جاپان سے فوجی معاہدے کرے گا اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے ساتھ

بھی قریبی فوجی تعلقات قائم کرے گا۔

غالب امکان یہی ہے کہ امریکہ جاپان کو چین کے مقابلے میں ابھارے گا۔ ادھر چین کا ورلڈ ویو یہ ہے کہ آسمان میں دو سورج اور زمین پر دو بادشاہ نہیں ہوا کرتے ہیں۔ ایشیائی ملک اس کی اس برتری کو ماننے کا فطری رجحان رکھتے ہیں۔ بقول مائیکل اوکسن برگ ''ایشیائی لیڈر فکر مند ہیں کہ توازن قوت چین کے حق میں تبدیل ہو رہا ہے اور وہ مستقبل میں بیجنگ کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے اور چین کے خلاف امریکہ کی صلیبی جنگ میں اس کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔''

چین کو محدود کرنے یا اس کے ساتھ توازن قائم کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں امریکہ اور جاپان کے درمیان فوجی اتحاد ضرور قائم ہوگا۔

تہذیبیں اور مرکزی ریاستیں: ابھرتی ہوئی صف بندیاں

سرد جنگ کے برعکس مابعد سرد جنگ' کثیر قطبی (ملٹی پولر)' کثیر التہذیبی دنیا میں کوئی واضح برتر شگاف موجود نہیں ہے تاہم جب تک مسلم آبادیاتی اور ایشیائی معاشی لہریں جاری رہتی ہیں تو کسی دوسرے شگاف سے زیادہ یہ امر مغرب اور چیلنجر تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی سیاست کا مرکز ہوگا۔ مسلم ملکوں کی حکومتیں تو مغرب کے ساتھ دوستانہ رویہ اپناتی نظر نہیں آتیں اور مغربی معاشروں اور اسلامی گروپوں میں بعض اوقات کم شدید اور بعض اوقات زیادہ نہایت شدید تشدد رونما ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف امریکہ اور چین' جاپان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے درمیان تعلقات تصادم کی زد میں رہیں گے اور اگر امریکہ نے چین کی ابھرتی ہوئی اجارہ دار حیثیت کو للکارا تو ایک بڑی جنگ بھی رونما ہوسکتی ہے۔

ان حالات میں کنفیوشسی اسلامی رشتہ مضبوط اور گہرا ہوگا۔ ان تعلقات کا محور مسلم اور چینی معاشروں کا انسانی حقوق' ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور دوسرے معاملات پر مغرب کی مخالفت ہوگا۔ اس حوالے سے پاکستان' ایران اور چین کے تعلقات مرکزی اہمیت رکھتے ہیں جو 1990ء کی دہائی میں بہت بڑھے ہیں۔ تاہم اسلامی اور کنفیوشسی اتحاد کے

معاملے میں چین خاموش ہے۔

دیگر تہذیبوں اور امریکہ کے تعلقات مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ جنوبی تہذیبوں یعنی لاطینی امریکہ اور افریقہ میں مرکزی ریاست نہیں ہے۔ یہ مغرب پر انحصار کرتی ہیں اور معاشی و فوجی حوالے سے کمزور ہیں۔ لاطینی امریکہ ثقافتی حوالے سے مغرب سے قریب ہے۔ 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے دوران میں ان کے سیاسی اور معاشی نظام مغرب سے مماثل ہو گئے ہیں۔ دو لاطینی امریکی ریاستوں نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے حصول کی کوششیں ترک کر دی ہیں۔ پروٹسٹنٹ ازم بڑھ رہا ہے جس کے بعد کیتھولک پروٹسٹنٹ اور مغربی تعلق مضبوط ہو گا۔ لاطینی امریکہ اور مغرب (یعنی امریکہ) کے درمیان متنازعہ معاملات ہیں: امیگریشن، منشیات، منشیات سے منسلک دہشت گردی اور معاشی اتحاد۔

مغرب کے افریقہ سے رشتے اس لئے متنازع نہیں ہیں کہ افریقہ بہت کمزور ہے تاہم چند اہم مسائل موجود ہیں مثلاً جنوبی افریقہ نے برازیل اور ارجنٹائن کے برعکس اپنا نیوکلیائی پروگرام ترک نہیں کیا۔

افریقہ اور لاطینی امریکہ کی تہذیبیں مغرب کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہیں۔ تاہم تین ''جھولتی ہوئی'' تہذیبوں کے معاملے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مرکزی ریاستیں عالمی معاملات میں اہم اداکار ہیں۔ جاپان کے ساتھ امریکہ کے سلامتی کے معاہدے کمزور پڑ رہے ہیں۔ جاپان کا رخ چین کی طرف ہو رہا ہے۔

سرد جنگ کے دوران چین نے سوویت یونین اور امریکہ کے خلاف ''چین کارڈ'' کھیلا۔ اب مابعد سرد جنگ دنیا میں روس ''ایشیاء کارڈ'' رکھتا ہے۔ روس چین اتحاد مغرب کے خلاف وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر روس مغرب کا ساتھ دے تو کنفیوشسی اسلامی تعلق کو خطرہ لاحق ہو گا اور چین اپنے شمال سے حملے کے سرد جنگ والے خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔

تاہم سرد جنگ کے فوری بعد کے زمانے میں چین روس تعلقات تعاون پر مبنی رہے ہیں۔ بڑے جھگڑے حل کئے جا چکے ہیں۔ دونوں طرف سے فوجوں کو سرحدوں پر سے کم کر

دیا گیا ہے۔ ہر دو نے ایک دوسرے کو نیوکلیائی میزائلوں کے نشانے سے ہٹا دیا ہے اور ان کے وزرائے خارجہ نے اسلامی بنیاد پرستی سے لڑنے میں ایک دوسرے کے مشترک مقصد کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ان رشتوں کے دورہ کا انحصار دو باتوں پر ہے: اول تو روس کا مغرب کے ساتھ تعلق اطمینان بخش ہو دوم چین کی مشرقی ایشیا میں ابھرتی ہوئی اجارہ داری روس کیلئے معاشی' آبادیاتی اور فوجی حوالے سے نقصان دہ ہے۔

اسلام کے ساتھ روس کے تعلقات ترکوں کے خلاف صدیوں پر محیط جنگوں سے عیاں ہیں۔ نیز شمالی کوہ قاف کے لوگوں اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے جنگوں میں واضح ہیں۔ روس بلقان میں ترک اثر ونفوذ کو محدود کرنے کیلئے آرتھوڈوکس سربیا اور یونان سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ وہ وسطی ایشیائی جمہوریاؤں میں اپنا سیاسی' معاشی اور فوجی اثر و رسوخ برقرار رکھنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ روس کیلئے کیسپئن کے تیل اور گیس کے ذخائر اہمیت رکھتے ہیں نیز انہیں مغرب اور مشرقی ایشیا تک پہنچانے والے روٹس۔ روس چیچنیا کے مسلم لوگوں کے خلاف ایک جنگ لڑ چکا ہے۔ ان وجوہات کے تحت وسط ایشیا میں اسلامی خطرے کو روکنے کیلئے روس چین اتحاد زیادہ متوقع ہے۔ سرد جنگ کے دوران میں تیسری جھولتی ہوئی مرکزی ریاست بھارت سوویت یونین کا اتحادی تھا اور اس نے چین کے خلاف ایک جنگ لڑی تھی جبکہ پاکستان کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں۔ مغرب کے ساتھ اس کے تعلقات فاصلوں پر استوار تھے۔ مابعد سرد جنگ دور میں پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات کشمیر' نیوکلیائی ہتھیاروں اور برصغیر میں مجموعی فوجی توازن کے حوالے سے متنازع ہیں۔ کیونکہ پاکستان دوسرے اسلامی ملکوں کی حمایت حاصل کرنے کا اہل ہے اس لئے بھارت کے ان ملکوں کے ساتھ تعلقات پیچیدہ ہیں۔ اس مشکل کا سامنا کرنے کیلئے بھارت فرداً فرداً مسلم ملکوں سے ماضی کی طرح تعلقات بنا رہا ہے تاکہ اس طرح وہ ان کو پاکستان سے دور کر دے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد چین اپنے پڑوسیوں سے تعلقات بہتر بنا رہا ہے۔ بھارت کے ساتھ بھی اس کے تعلقات میں وسعت آئی ہے اور دونوں میں تناؤ کم ہوا ہے۔ تاہم چین ایشیا میں برتری کے واسطے پاکستان کے ساتھ اپنے قریبی مراسم کو برقرار رکھے گا۔ پاکستان کی

نیوکلیائی قوت کو مضبوط بنائے گا۔ ایک تجزیہ نگار نے کہا ہے کہ "دونوں ملک خود کو بڑی تہذیبوں کا مرکز تصور کرتے ہیں۔ بھارت نہ صرف کثیر قطبی دنیا میں ایک آزاد مرکز قوت کے طور پر ابھرنے کی کوشش کرے گا بلکہ چینی قوت اور اثر و رسوخ کا مقابل بننے کی کوشش بھی کرے گا۔"

چین پاکستان اتحاد سے مقابلہ کرنے کیلئے جو کہ کنفیوشسی اسلامی اتحاد نہیں ہے۔ بھارت کو روس کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔ 1990ء کی دہائی میں بھارت نے روس سے ہر قسم کا اسلحہ حاصل کیا۔ اس بنا پر امریکہ نے اس پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ امریکہ انسانی حقوق، ہتھیاروں کے پھیلاؤ، کشمیر اور معاشی لبرلائزیشن کے مسئلوں پر بھارت کا مخالف ہے۔ تاہم پاکستان سے امریکہ کے تعلقات میں سرد مہری اور چین کو محدود کرنے کے مشترک مقصد کے تحت امریکہ اور بھارت قریب آئیں گے۔ جنوبی ایشیا میں بھارت کی بڑھتی ہوئی طاقت امریکی مفادات کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے مابین تعلقات پیچیدہ ہوتے ہیں اور ضرور تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ کسی ایک تہذیب کی بہت سی ریاستیں دوسری تہذیب کے ملکوں سے تعلقات قائم کرنے کے حوالے سے مرکزی ریاست کی پیروی کریں گی تاہم ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا اور واضح طور پر کسی ایک تہذیب کے سارے ملک دوسری تہذیب کے سارے ملکوں سے یکساں تعلقات نہیں رکھتے۔ مختلف تہذیبوں کے ملکوں میں باہمی تعاون کسی تیسری تہذیب سے ایک مشترک دشمن کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ تصادم تہذیبوں کے اندر بھی خصوصاً اسلام میں واضح طور پر ابھر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ تقسیمی خطوط کے ساتھ ساتھ واقع ملکوں کے تعلقات انہی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے تعلقات سے خاص طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے کی نسبتاً سادہ دو قطبیت (بائی پولیرٹی) کی جگہ کثیر قطبی (ملٹی پولر) کثیر التہذیبی دنیا کے بہت زیادہ پیچیدہ تعلقات وجود میں آ رہے ہیں۔

............☆☆☆............

باب 10

عبوری جنگوں سے تقسیمی خط کی جنگوں تک

عبوری جنگیں: افغانستان اور خلیج

ایک ممتاز مراکشی سکالر مہدی المند جرا نے جب خلیج کی جنگ لڑی جا رہی تھی تو کہا تھا کہ "یہ ایک تہذیبی جنگ کا آغاز ہے۔" درحقیقت وہ دوسری (جنگ) تھی۔ پہلی 1979-89ء میں ہونے والی سوویت افغان جنگ تھی۔ دونوں جنگیں ایک ملک کی دوسرے ملک پر یلغار سے شروع ہوئی تھیں لیکن تہذیبی جنگوں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہ عبوری جنگوں کا دور تھا جو نسلی تنازعوں سے بھرا پڑا تھا اور تقسیمی خط کی جنگیں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔

افغان جنگ سوویت یونین کی اس کوشش سے شروع ہوئی کہ ایک طفیلی حکومت (سیٹلائٹ رجیم) کو قائم رکھے۔ یہ اس وقت ایک سرد جنگ میں تبدیل ہوگئی جب امریکہ نے سوویت فوجوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے افغانوں کو منظم کیا' پیسے فراہم کیے اور ہتھیار مہیا کیے۔ امریکیوں کیلئے سوویت یونین کی شکست کمیونسٹ حکومتوں کے خلاف ریگن حکمت عملی کی فتح تھی کہ ان حکومتوں کی مسلح مزاحمت کی جائے نیز ویتنام میں امریکی ذلت کا بدلہ تھی۔ یہ ایک ایسی شکست بھی تھی جو پورے سوویت معاشرے اور اس کی سیاسی اسٹیبلشمنٹ میں پھیل گئی نیز اس نے سوویت امپائر کے ٹوٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ امریکیوں اور مغربیوں

کیلئے افغانستان عمومی طور پر آخری فیصلہ کن فتح تھی' سرد جنگ کا واٹر لو۔

تاہم ان کیلئے جو سوویتوں سے لڑے افغان جنگ کچھ اور تھی ایک مغربی سکالر کا تبصرہ ہے کہ یہ ''کسی خارجی طاقت کے خلاف پہلی کامیاب مزاحمت'' تھی۔ جو نہ تو قوم پرستی پر نہ سوشلسٹ اصولوں پر استوار تھی'' بلکہ اس کے بجائے اسلامی اصولوں پر استوار تھی' جنہوں نے اسے جہاد قرار دیا اور اسی وجہ سے اسلامی خود اعتمادی اور طاقت کو فروغ ملا۔ اسلامی دنیا پر اس کا اثر ویسا ہی ہوا جیسا کہ 1905ء میں جاپان کی روسیوں پر فتح سے مشرقی دنیا پر ہوا تھا۔ مغرب جس کو آزاد دنیا کی فتح کے طور پر دیکھتا ہے اس کو مسلمان اسلام کیلئے فتح کے طور پر دیکھتے ہیں۔

امریکی ڈالر اور میزائل سوویتوں کی شکست کیلئے ناگزیر تھے تاہم اسلام کی مجموعی جدوجہد بھی ناگزیر تھی جس میں بہت سی حکومتیں اور گروپ ایک دوسرے سے مقابلہ کی حالت میں تھے کہ سوویتوں کو شکست دے کر اپنے اپنے مفادات حاصل کریں۔ جنگ کے لیے مسلم مالی امداد سب سے پہلے سعودی عرب نے مہیا کی۔ 1984ء سے 1986ء کے دوران میں سعودیوں نے 525 ملین ڈالر مزاحمت کیلئے فراہم کئے۔ 1989ء میں 715 ملین ڈالر کا 61فیصد فراہم کرنے پر رضامند ہوئے یعنی 436 ملین ڈالر جبکہ باقی کی رقم امریکہ نے فراہم کی۔ 1993ء میں انہوں نے افغان حکومت کو 193 ملین ڈالر دیئے۔ جنگ کے دوران میں ان کی مہیا کردہ کل رقم امریکہ کے خرچ کئے ہوئے تین سے 3.3 بلین ڈالر سے زیادہ نہیں تو مساوی ضرور رہی ہے۔ جنگ کے دوران 25000 رضا کاروں نے دوسرے اسلامی خصوصاً عرب ملکوں سے آ کر حصہ لیا۔ اردن میں زیادہ تر بھرتی ہونے والے ان رضا کاروں کو پاکستان کی انٹر سروسز انٹیلی جنس نے تربیت دی۔ پاکستان نے مزاحمت کیلئے ناگزیر غیر ملکی بیس (ٹھکانا) اور مواصلاتی اور دیگر امداد فراہم کیں۔ اس نے زیادہ بنیاد پرست اسلام پسند گروپوں کو 75 فیصد فنڈ مہیا کئے جس میں 50 فیصد سب سے زیادہ انتہا پسند سنی بنیاد پرست فرقے کو دیئے گئے جس کی رہنمائی گلبدین حکمت یار کے پاس تھی۔ جنگ کے عرب شرکاء اگرچہ سوویتوں سے لڑ رہے تھے تاہم وہ مغرب کے زبردست مخالف

تھے اور مغربی انسانی بنیادوں پر امداد دینے والی ایجنسیوں کو غیر اخلاقی اور اسلام سے منحرف قرار دیتے تھے۔ آخر کار سوویتوں کو تین عوامل کی وجہ سے شکست ہوئی: امریکی ٹیکنالوجی' سعودی دولت اور مسلم آبادی اور جوش۔

جنگ نے اسلام پسند تنظیموں کا اتحاد اپنے پیچھے چھوڑا جو ہر غیر مسلم طاقت کے خلاف اسلام کی اشاعت چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ورثے میں چھوڑے ماہر تجزیہ نگار' جنگجو' کیمپ' تربیتی میدان' لاجسٹک سہولیات' وسیع اسلام گیر تنظیموں اور اشخاص کا جال (نیٹ ورک)' فوجی سازوسامان کی بہت بڑی مقدار جس میں 300 سے 500 سٹنگر میزائل شامل تھے اور سب سے زیادہ اہم طاقت اور خود اعتمادی کا احساس جو نئی فتوحات کا خواہاں تھا۔ ایک امریکی افسر نے 1994ء میں کہا کہ افغان رضا کاروں کے جہاد کی سیاسی اور مذہبی توثیقی دستاویزات معصوم ہیں۔ انہوں نے دنیا کی دو سپر پاوروں میں سے ایک کو شکست دی ہے اور اب وہ دوسری پر کام کر رہے ہیں۔

افغان جنگ ایک تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ ہر جگہ کے مسلمانوں نے اس کو ایسا ہی سمجھا اور سوویت یونین کے خلاف فوج کشی کی۔ خلیج کی جنگ تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ مغرب ایک مسلم تنازعے میں فوجی حوالے سے آشامل ہوا۔ مغربیوں نے اس شمولیت کی زبردست تائید کی اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس کو اپنے خلاف جنگ کے طور پر دیکھا اور وہ اپنی سوچ کے مطابق مغربی استعماریت کے خلاف لشکر آرا ہو گئے۔

عرب اور مسلمان حکومتیں جنگ کے حوالے سے پہلے تو بٹی ہوئی تھیں۔ صدام حسین نے سرحدوں کو توڑا تھا اور اگست 1990ء میں عرب لیگ نے اکثریت کے ساتھ اس کی مذمت کی تھی۔ مصر اور شام بڑی تعداد میں پاکستان اور مراکش اور بنگلہ دیش تھوڑی تعداد میں امریکہ کے بنائے ہوئے عراق مخالف اتحاد میں فوجی بھیجنے پر راضی ہوئے۔ ترکی نے عراق سے بحیرہ روم کو جانے والی اپنے ملک سے گزرنے والی پائپ لائن کو بند کر دیا اور اتحاد کو اپنے ہوائی ٹھکانے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ ان اقدامات کے جواب میں ترکی نے یورپ میں شمولیت کے دعوے کو مضبوط بنالیا۔ پاکستان اور مراکش نے سعودی عرب کے ساتھ اپنے

قریبی تعلقات کی نئے سرے سے توثیق کی۔ مصر نے قرضے معاف کروائے اور شام نے لبنان حاصل کر لیا۔ اس کے برعکس ایران' اردن' لیبیا' ماریطانیہ' یمن' سوڈان اور تیونس کی حکومتوں اور تنظیموں مثلاً پی ایل او' حماس اور ایف آئی ایس نے سعودی عرب سے مالی امداد حاصل کرنے کے باوجود عراق کی حمایت کی اور مغربی مداخلت کی مذمت کی۔ دوسری مسلمان حکومتوں مثلاً انڈونیشیا نے مصالحتی پوزیشن اختیار کی یا کوئی بھی پوزیشن لینے سے گریز برتی۔

جہاں مسلمان حکومتیں پہلے پہل منقسم تھیں وہاں عرب اور مسلمان رائے عامہ پہلے دن سے مغرب کے زبردست خلاف تھی۔ ایک امریکی مبصر نے کویت پر حملے کے تین ہفتے بعد یمن' شام' مصر' اردن اور سعودی عرب کا دورہ کرنے کے بعد کہا ''عرب دنیا امریکہ کے خلاف غصے سے کھول رہی ہے۔'' مراکش سے چین تک لاکھوں مسلمان صدام حسین کے پیچھے صف آرا ہو گئے اور اسے ''ایک مسلمان ہیرو قرار دینے لگے۔'' جمہوریت کا پیراڈوکس ''اس تنازعے کا سب سے بڑا پیراڈوکس تھا''۔ ان عرب ملکوں میں جہاں سیاست زیادہ کشادہ اور اظہار کی آزادی پر کم پابندیاں ہیں صدام حسین کی حمایت سب سے زیادہ ''پرجوش اور وسیع'' تھی۔ مراکش' پاکستان' اردن' انڈونیشیا اور دوسرے ملکوں میں بہت بڑے بڑے مظاہرے مغرب کے خلاف ہوئے اور شاہ حسین' بینظیر بھٹو اور سہارتو جیسے سیاسی لیڈروں کو مغرب کے مہرے قرار دیا گیا۔ شام میں بھی اتحاد کی مخالفت سطح پر آئی جہاں ''شہریوں کی اکثریت نے خلیج میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کی مخالفت کی۔'' ہندوستان کی سوملین مسلم آبادی کے 75 فیصد نے امریکہ پر جنگ کا الزام لگایا اور انڈونیشیا کے 171 ملین مسلمان ''قریباً آفاقی طور پر'' خلیج میں امریکی فوجی ایکشن کے مخالف تھے۔ عرب دانشور بھی اس فیشن کے تحت صف آرا تھے اور انہوں نے صدام کی سفاکی کے سیاسی جواز تراشے اور مغرب کی مداخلت کی مذمت کی۔

عرب اور دوسرے مسلمان عمومی طور پر متفق تھے کہ صدام حسین خونی آمر ہو سکتا ہے لیکن ایف ڈی آر کی سوچ کے مطابق ''وہ ہمارا خونی آمر ہے۔'' ان کی سوچ کے مطابق حملہ خاندانی جھگڑا تھا اور یہ خاندان کے اندر ہی حل ہو سکتا تھا اور جنہوں نے بین الاقوامی

انصاف کی عظیم تھیوری کے تحت مداخلت کی ہے ان کے اپنے خود غرضانہ مفادات تھے اور یہ مداخلت عربوں کی مغرب کے آگے اطاعت کو برقرار رکھنے کیلئے ہوئی تھی۔ ایک مطالعہ بتاتا ہے کہ عرب دانشور ''عراقی حکومت سے نفرت کرتے ہیں اور اس کی سفاکی کی مذمت کرتے ہیں لیکن عرب دنیا کے سب سے بڑے دشمن مغرب کے خلاف مزاحمت کا مرکز فراہم کرنے پر اس کی ستائش کرتے ہیں۔'' وہ عرب دنیا کو مغرب کی مخالفت میں دیکھتے ہیں۔ ایک فلسطینی پروفیسر نے کہا ''صدام نے جو کیا وہ غلط ہے لیکن ہم مغربی فوجی مداخلت کے خلاف عراق کی صف بندی کی مذمت نہیں کر سکتے۔'' مغرب میں اور ہر مقام پر موجود مسلموں نے سعودی عرب میں غیر مسلم فوجیوں کی موجودگی کی مذمت کی اور انہیں مقدس مقامات کی ''بے حرمتی'' کا مرتکب قرار دیا۔ مختصر الفاظ میں غالب تصور یہ تھا کہ صدام نے حملہ کر کے غلطی کی، مغرب نے مداخلت کر کے اس سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا صدام مغرب سے جنگ میں حق پر ہے اور ہم اس کی حمایت کرنے میں حق پر ہیں۔ تقسیمی خط کی دوسری جنگوں کے ابتدائی شرکاء کی طرح صدام حسین نے اپنی سابقہ سیکولر فکر کی جگہ وسیع تر مقصد (کاز) کو دے دی جو کہ تھا: اسلام۔

مسلمانوں کیلئے جنگ جلد ہی تہذیبوں کے درمیان جنگ بن گئی جس میں اسلام کی حرمت خطرے کی زد میں تھی۔ اسلام پسند بنیاد پرست گروپوں نے جو کہ مصر، شام، اردن، پاکستان، ملائیشیا، انڈونیشیا، سوڈان اور ہر کہیں سے تعلق رکھتے تھے اس کو ''صلیبیوں اور صہیونیوں'' کے اتحاد کی چھیڑی ہوئی ''اسلام اور اس کی تہذیب'' کے خلاف جنگ قرار دیا اور ''عراقیوں کے خلاف فوجی اور معاشی جارحیت'' کی صورت میں عراق کی پشت پناہی کا دعویٰ کیا۔ 1990ء کے موسم خزاں میں مکہ کے اسلامی کالج کے ڈین ظفر الحوالی کی ایک ٹیپ سارے سعودی عرب میں پھیل گئی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ ''دنیا کی عراق کے خلاف جنگ نہیں، یہ تو مغرب کی اسلام کے خلاف جنگ ہے۔'' اسی طرح اردن کے شاہ حسین نے کہا ''یہ جنگ صرف عراق کے خلاف نہیں بلکہ سارے عرب اور سارے مسلمانوں کے خلاف تھی۔''

جنگ کی مسلم تعریف کہ مغرب بمقابلہ اسلام ہے کی وجہ سے مسلم دنیا کے اندرونی

جھگڑے یا کم ہو گئے یا ملتوی ہو گئے۔ مغرب اور اسلام کے درمیان بڑے اختلاف کے سامنے مسلمانوں کے باہمی پرانے اختلافات چھوٹے پڑ گئے اور کم اہم ہو گئے۔ جنگ کے دوران میں مسلم حکومتوں اور گروپوں نے مسلسل خود کو مغرب سے فاصلہ پر لانا جاری رکھا۔ افغان پیش رو کی طرح خلیج کی جنگ نے بھی ان مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا جو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے درپے ہوا کرتے تھے یعنی عرب سیکولرسٹ، عرب قوم پرست اور بنیاد پرست۔ اردن حکومت اور فلسطینی، پی ایل او اور حماس، ایران اور عراق، حزب اختلاف کی جماعتیں اور حکومتیں عمومی طور پر جیسا کہ ظفر الحوالی نے کہا "یہ بعثی ہمارے چند گھنٹوں کے دشمن ہیں جبکہ روم روز حشر تک ہمارا دشمن ہے۔" جنگ نے ایران اور عراق کے درمیان مصالحت کے عمل کو دوبارہ شروع کر دیا۔ ایران کے شیعہ لیڈروں نے مغربی مداخلت کی مذمت کی اور مغرب کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ایرانی حکومت نے اپنے سابق دشمن کے خلاف اقدامات کرنے سے خود کو دور رکھا اور جنگ کے بعد دونوں حکومتوں کے مابین تعلقات میں بتدریج بہتری آ رہی ہے۔ ایک خارجی دشمن ملک کے اندرونی تنازعوں کو کم کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جنوری 1991ء میں پاکستان بیان کیا جاتا ہے کہ "مغرب مخالف بحث میں بہہ گیا جس نے ملک کو متحد کر دیا" پاکستان کبھی اتنا متحد نہیں رہا تھا۔ جنوبی صوبے سندھ میں جہاں مقامی سندھیوں اور ہندوستان ۔ سے ترک وطن کر کے آنے والوں کے درمیان قتل و غارت کا سلسلہ پانچ برسوں سے جاری تھا دونوں فریقوں کے لوگ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے امریکیوں کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے۔ بہت زیادہ روایت پسند قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد میں عورتیں تک گلیوں میں نکل آئیں اور ایسی جگہوں پر لوگ اکٹھے ہو گئے جہاں سوائے جمعہ کی نماز کے لوگ اکٹھے نہیں ہوا کرتے۔

فوجی کوشش کو غیر مغربی، غیر اسلامی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حمایت بھی کم کم حاصل ہوئی۔ 1991ء میں 53 فیصد جاپانیوں نے جنگ کے خلاف ووٹ دیا جبکہ 25 فیصد نے حمایت کی۔ خلیج کی جنگ جو عراق اور کویت کے مابین تھی اسلام اور مغرب کی جنگ بن گئی اور بہت سے غیر مغربیوں نے اسے مغرب کی مشرق کے خلاف جنگ قرار

دیا۔ ''ایک سفید آدمی کی جنگ' ایک نئے استعمار کا ابھار۔''

جنگ کے بعد کویتیوں کے علاوہ عربوں کی رائے خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ہوگئی۔ کویت کی آزادی نے صدام حسین کی مخالفت کا جواز ختم کر دیا ہے اور خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی کا جواز بھی کم ہوگیا ہے۔ لہٰذا مصر جیسے ملکوں میں عراق کے حوالے سے سوچ ہمدردانہ ہوتی جا رہی ہے۔ خلیج کی جنگ سرد جنگ کے بعد تہذیبوں کے درمیان وسائل کی پہلی جنگ تھی۔ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر جن کی مالک سعودی یا امارات حکومتیں اپنی سلامتی اور آزادی کیلئے مغرب کی دست نگر ہیں اس خطرے کی زد میں تھیں کہ ان پر کسی مغرب مخالف حکومت کا قبضہ نہ ہو جائے جو مغرب کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی اہل اور خواہش مند ہو۔ مغرب صدام حسین کو تو حکومت سے نہیں ہٹا سکا تاہم اس نے خلیج کی ریاستوں کی سلامتی کے حوالے سے مغرب پر انحصار کو ڈرامائی انداز میں منوا لیا ہے نیز زمانۂ امن میں خلیج کے اندر اپنی وسیع فوجی موجودگی منظور کروا لی ہے۔ جنگ سے پہلے عراق' ایران' خلیج تعاون کونسل اور امریکہ خلیج پر اثر ورسوخ کیلئے باہم متصادم تھے۔ جنگ کے بعد خلیج فارس ایک امریکی جھیل بن گئی ہے۔

تقسیمی خط کی جنگوں کی خصوصیات

قبیلوں' نسلی گروپوں' مذہبی برادریوں اور قوموں کے مابین جنگیں ہر عہد اور ہر تہذیب میں غالب رہی ہیں کیونکہ ان کی جڑیں لوگوں کے تشخص میں ہوتی ہیں۔ ان جھگڑوں کی نوعیت مخصوص ہوا کرتی ہے اس لئے ان میں شریک نہ ہونے والوں کی کوئی وسیع نظریاتی یا سیاسی حوالے سے دلچسپی نہیں ہوتی اگرچہ باہر کے گروپوں میں انسانی حوالے سے فکرمندی ضرور ابھار سکتے ہیں۔ جہاں تشخص کے بنیادی مسائل معرض خطر میں ہوں وہاں ان کی نوعیت نہایت خونی اور سفاکانہ ہو سکتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ طویل ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے معاہدوں کی وجہ سے ان میں تعطل پیدا ہو۔ تاہم معاہدے ٹوٹ کر جھگڑے دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں۔ تشخص کی کسی سول وار میں ایک فریق کی مکمل فیصلہ کن فوجی فتح نسل کشی کو جنم دیتی ہے۔

تقسیمی خط کے جھگڑے فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں جو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں یا ریاستوں کے مابین ہوتے ہیں۔ تقسیمی خط کی جنگیں ایسے جھگڑے ہوتی ہیں جو پرتشدد ہو گئے ہوں۔ ایسی جنگیں ریاستوں کے درمیان، غیر حکومتی گروپوں کے درمیان اور ریاستوں اور غیر حکومتی گروپوں کے درمیان رونما ہو سکتی ہیں۔ ریاستوں کے اندر تقسیمی خط کے جھگڑے جغرافیائی اعتبار سے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں میں ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہ گروپ جس پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہوتا عموماً آزادی کیلئے لڑتا ہے اور اس سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوتا۔ ریاست کے اندر تقسیمی خط کے جھگڑے ایسے گروپوں کے درمیان بھی ہو سکتے ہیں جو جغرافیائی حوالے سے ملے جلے ہوں۔ ایسی صورت میں مستقل تناؤ کا شکار تعلقات وقتاً فوقتاً تشدد کی نذر ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم نیز ملائیشیا میں چینی اور مسلم، یا مکمل پیمانے پر لڑائی بھی چھڑ سکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت کہ جب نئی ریاستیں اور ان کی سرحدیں متعین کی جا رہی ہوں اور لوگوں کو طاقت کے ذریعے علیحدہ رکھنے کی سفاکانہ کوششیں سامنے آ سکتی ہیں۔

تقسیمی خط کے جھگڑے بعض اوقات لوگوں پر کنٹرول پانے کی جدوجہد کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم زیادہ تر علاقے پر کنٹرول کا مسئلہ وجہ بنتا ہے۔ کم از کم ایک فریق کا مقصد علاقے کی فتح اور دوسرے لوگوں سے آزادی ہوتا ہے۔ اس کیلئے وہ لوگوں کو باہر دھکیلتا ہے، قتل کرتا ہے یا دونوں اقدامات کرتا ہے، اسے "نسلی صفائی" کہا جاتا ہے۔ یہ جھگڑے پرتشدد اور سفاکانہ ہو سکتے ہیں۔ ان میں دونوں فریق قتل و غارت، دہشت گردی، زنا اور تشدد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مذکورہ علاقہ کسی ایک یا دونوں فریقوں کیلئے تاریخ اور تشخص کی علامت ہوتا ہے۔ مقدس زمین جس پر ان کا حق بلاشرکت غیرے ہوتا ہے مثلاً مغربی کنارہ، کشمیر، نگورنو کاراباخ، دریناوادی، کوسوو۔

عمومی طور پر تقسیمی خط کی جنگیں فرقہ وارانہ جنگوں کی تمام خصوصیات کی حامل نہیں ہوتی ہیں۔ وہ طول پائے ہوئے جھگڑے ہوتے ہیں۔ جب وہ ریاستوں کے اندر ہوں تو وہ ریاستوں کے درمیان جھگڑوں کی نسبت اوسطاً چھ گنا زیادہ طویل ہوتے ہیں کیونکہ ان میں

گروپ کی قوت اور تشخص جیسے بنیادی مسائل کارفرما ہوتے ہیں لہٰذا مذاکرات کے ذریعے یا مفاہمت سے ان کا حل کیا جانا دشوار ہوتا ہے۔ جب معاہدات ہو جاتے ہیں تو ہر فریق ان کی تحریم نہیں کرتا اور اکثر انہیں توڑ دیا جاتا ہے۔ تقسیمی خط کی جنگیں بار بار برپا ہونے والی جنگیں ہوتی ہیں جو بعض اوقات بھڑک کر وسیع پیمانے پر تشدد کا روپ اختیار کر لیتی ہیں اور کبھی دھیمی پڑ جاتی ہیں مگر دوبارہ بھڑک اٹھنے کیلئے' فرقہ وارانہ تشخص اور نفرت کے شعلے شاذونادر ہی مکمل طور پر بجھتے ہیں اور وہ بھی نسل کشی ہی سے۔ تقسیمی خط کی جنگیں' دوسری فرقہ وارانہ جنگوں کی طرح اپنے طول پکڑ جانے والی خصوصیت کی بنا پر بڑے پیمانے پر اموات اور نقل مکانی کا باعث بنتی ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز تک تقسیمی خط کی جنگوں میں اموات کے اندازے کچھ یوں ہیں فلپائن میں 50,000' سری لنکا میں 50,000 سے 100,000' کشمیر میں 20,000' سوڈان میں 50,000 سے 1.5 ملین' تاجکستان میں 100,000' کروشیا میں 50,000' بوسنیا میں 50,000 سے 200,000' چیچنیا میں 30,000 سے 50,000' تبت میں 100,000' مشرقی تیمور میں 200,000 اسی طرح ان جھگڑوں نے بہت بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کو بھی جنم دیا ہے۔

بہت سی معاصر جنگیں خونی جھگڑوں کی طویل تاریخ کا تازہ ترین مرحلہ ہیں اور بیسویں صدی کے اواخر کا تشدد اس کے مستقبل میں اختتام کی راہ میں مزاحم ہے۔ مثال کے طور پر سوڈان میں لڑائی 1956ء میں شروع ہوئی تھی اور 1972ء تک جاری رہی تاہم 1983ء میں ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ تامل بغاوت سری لنکا میں 1983ء میں شروع ہوئی تھی۔ امن مذاکرات نے 1991ء میں اس کو روک دیا لیکن 1994ء میں یہ دوبارہ شروع ہو گئی تب 1995ء میں ایک سیز فائر معاہدے کے تحت پھر رک گئی۔ تاہم چار ماہ بعد ہی باغی ٹائیگروں نے معاہدے کو توڑ دیا اور امن مذاکرات سے منہ موڑ لیا اور جنگ ایک بار پھر زیادہ شدید تشدد کے ساتھ شروع ہو گئی۔ فلپائن میں مورو بغاوت 1970ء کی دہائی کے شروع میں پھوٹی تھی اور 1976ء میں ایک معاہدے کے تحت مِنڈاناؤ کے کچھ علاقوں کو خودمختاری (اٹانومی) دیئے جانے کے بعد دھیمی پڑ گئی تاہم 1993ء میں تشدد دوبارہ مسلسل

شروع ہو گیا اور بڑھتا ہی جا رہا ہے کیونکہ باغی امن کوششوں کو ناکام بنا رہے ہیں۔ روس اور چیچنیا کے لیڈر جولائی 1995ء میں ایک غیر فوجی بنانے کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے تاکہ وہ تشدد رک سکے جو گزشتہ دسمبر میں شروع ہوا تھا۔ جنگ دھیمی پڑ گئی تاہم اس وقت دوبارہ چھڑ گئی جب روسی افراد یا روس کے حامی لیڈروں پر چیچنیوں نے حملے کئے۔ روس نے جواب دیا۔ چیچنیوں نے جنوری 1996ء میں داغستان پر چڑھائی کر دی اور روس نے بھی 1996ء کے شروع میں بڑے پیمانے پر حملہ کیا۔

جہاں تقسیمی خط کی جنگیں طویل دورانیے پر محیط ہوتی ہیں۔ ان میں تشدد بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور دوسری فرقہ وارانہ جنگوں سے نظریاتی مماثلت رکھتی ہیں۔ وہاں یہ دو حوالوں سے ان سے مختلف ہوتی ہیں۔ اول: فرقہ وارانہ جنگ نسلی' مذہبی یا لسانی گروپوں میں ہو سکتی ہیں۔ تاہم مذہب جب سے تہذیبوں کا مرکزی تعینی وصف بنا ہے تقسیمی خط کی جنگیں قریباً ہمیشہ ہی مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان ہوئی ہیں۔ کچھ تجزیہ نگار اس عامل کی اہمیت کو فوقیت نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر وہ بوسنیا میں سربوں اور مسلموں کی مشترک نسل اور زبان' ماضی کی پر امن بقائے باہم اور وسیع باہمی شادیوں کی مثال دیتے ہیں اور فرائڈ کے ''چھوٹے فرقوں کی نرگسیت'' کے نظریے کے حوالے سے مذہبی عامل کو رد کرتے ہیں۔ تاہم یہ نقطہ نظر سیکولر ودور کی نظر کی کمزوری (مائیوپیا) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہزار برس واضح کرتے ہیں کہ مذہب کوئی ''چھوٹا فرق'' نہیں ہے بلکہ وہ سب سے زیادہ گہرا فرق ہے جو کہ لوگوں کے درمیان وجود رکھتا ہے۔ تقسیمی خط کی جنگوں کا تسلسل' شدت اور تشدد مختلف خداؤں پر ایمان کی وجہ سے بہت ہی زیادہ ہو سکتا ہے۔

دوم: دوسری فرقہ وارانہ جنگیں مخصوص نوعیت کی حامل ہوتی ہیں لہٰذا ان میں پھیل کر دوسرے لوگوں کی شمولیت کا امکان نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تقسیمی خط کی جنگیں ان گروپوں میں رونما ہوتی ہیں جو بڑی ثقافتی اکائیوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ عمومی فرقہ وارانہ جھگڑوں میں گروپ الف گروپ ب سے لڑتا ہے اور گروپ ج' د اور ہ کو اس وقت تک اس میں شامل ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا جب تک گروپ الف یا ب ان کے مفادات پر حملہ نہ کر دے۔ اس کے

برعکس کسی تقسیمی خط کی جنگ میں گروپ الف 1 گروپ ب 1 سے لڑتا ہے تو ہر گروپ اپنے تہذیبی رشتہ دار گروپوں الف 2' الف 3 اور الف 4 اور ب 2' ب 3' اور ب 4 سے بھرپور امداد کا خواہاں اور جنگ کو وسعت دینے کیلئے کوشاں ہوتا ہے اور مذکورہ گروپ بھی لڑنے والوں سے ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہیں۔ جدید دنیا میں ٹرانسپورٹیشن اور کمیونیکیشن کی وسعت نے ان تعلقات کے قیام کو آسان بنا دیا ہے اور نتیجتاً تقسیمی خط کے جھگڑوں کی بین الاقوامیت کو بھی۔ ہجرت (مائیگریشن) نے تیسری تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ کمیونیکیشن نے جنگ لڑنے والے فریقوں کیلئے مدد کیلئے اپیل کو نیز اپنے رشتے دار گروپوں سے ان فریقوں کی قسمتوں سے جلد سیکھنے کو آسان تر بنا دیا ہے۔ دنیا کے عمومی سکڑاؤ نے رشتے دار گروپوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ لڑنے والوں کو اخلاقی' سفارتی' مالی اور مادی امداد فراہم کر سکیں اور ایسا کرنا زیادہ دشوار نہیں رہا۔ بین الاقوامی نیٹ ورک ایسی امداد مہیا کرنے کیلئے قائم ہو گئے ہیں اور امداد فریقوں کو مضبوط بناتی ہے اور جھگڑوں کو لمبا کرتی ہے۔ ایچ ڈی ایس گرین وے کے الفاظ میں یہ رشتے دار ملک کا جرثومہ بیسویں صدی کے اواخر کی تقسیمی خط کی جنگوں کا مرکزی وصف ہے۔ حتیٰ کہ مختلف تہذیبوں کے لوگوں کے درمیان تھوڑا سا تشدد بھی ایسے نتائج پیدا کرتا ہے جو بین التہذیبی تشدد نہیں کر سکتا۔ جب 1995ء میں کراچی میں سنی بندوق برداروں نے ایک مسجد میں اٹھارہ شیعہ نمازیوں کو قتل کیا تو ان کی وجہ سے سارے شہر کا امن برباد ہو گیا اور پاکستان کیلئے تو مصیبت کھڑی ہو گئی۔ جب ٹھیک ایک سال پہلے ایک یہودی آبادکار نے ہیبرون میں پیٹریارک کی غار میں عبادت کرنے والے 29 مسلمانوں کو قتل کیا تھا تو اس سے مشرق وسطیٰ کا امن عمل معطل ہو کر رہ گیا تھا اور دنیا کیلئے مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔

تصادم: اسلام کی خوں خوار سرحدیں

فرقہ وارانہ جھگڑے اور تقسیمی خط کی جنگیں تاریخ کا مواد ہیں اور ایک گنتی کے مطابق سرد جنگ کے دوران میں کوئی 32 جھگڑے رونما ہوئے جن میں درج ذیل تقسیمی خط کی جنگیں شامل ہیں: عرب اور اسرائیلی' ہندوستانی اور پاکستانی' سوڈانی مسلم اور عیسائی' سری

لنکن بدھ اور تامل اور لبنانی شیعہ اور میرونسٹ۔ 1940ء کی دہائی اور 1950ء کی دہائی کے دوران میں ہونے والی تمام سول جنگوں کا قریباً نصف تشخص کی جنگیں تھیں بلکہ آنے والی دہائیوں میں قریباً تہائی سول وار جنگیں تشخص کی جنگیں تھیں نیز 1950ء کی دہائی کے شروع سے 1980ء کی دہائی کے آخر تک کے دوران میں نسلی گروپوں کی بغاوتوں کی شدت تین گنا بڑھ گئی۔ تاہم سپر پاوروں کی حد سے بڑھتی ہوئی رقابت کے باوجود ان جھگڑوں نے سوائے چند اہم مستثنیات کے ان کی کم توجہ حاصل کی اور انہیں سرد جنگ کی منشور ہی سے دیکھا گیا۔ جیسے ہی سرد جنگ ختم ہوئی فرقہ وارانہ جھگڑے زیادہ نمایاں ہو گئے اور پہلے کی نسبت زیادہ زور آور بھی۔

یہ نسلی جھگڑے اور تقسیمی خط کی جنگیں دنیا کی تہذیبوں میں برابر نہیں پھیلی ہوئیں۔ بڑی تقسیمی خط کی لڑائیاں سربوں اور کروٹوں کے مابین سابق یوگوسلاویہ میں اور سری لنکا میں بدھوں اور ہندوؤں کے درمیان لڑی گئیں یا پھر چند دوسری جگہوں پر غیر مسلم گروپوں میں کم تشدد والے جھگڑے رونما ہوئے۔ تاہم بہت زیادہ تعداد میں تقسیمی خط کے جھگڑے اس سرحد کے ساتھ ساتھ رونما ہوئے جو یوریشیا اور افریقہ کے درمیان سے گزرتی ہے اور مسلموں اور غیر مسلموں کو علیحدہ علیحدہ کرتی ہے۔ جہاں دنیا کی سیاست کی بڑی (میکرو) یا عالمی (گلوبل) سطح پر ہونے والا تہذیبوں کا تصادم (کلیش آف سویلائزیشنز) مغرب اور باقی کے درمیان ہے وہاں چھوٹی (مائیکرو) یا مقامی (لوکل) سطح پر یہ اسلام اور دوسروں کے درمیان ہے۔

مقامی مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان شدید مخاصمت اور پر تشدد جھگڑے غالب ہیں۔ بوسنیا میں مسلموں نے آرتھوڈوکس سربوں کے ساتھ ایک خونیں اور تباہ کن جنگ لڑی ہے اور کیتھولک کروٹوں کے ساتھ بھی تشدد میں ملوث رہے ہیں۔ کوسوو میں البانوی مسلم سربوں کی حکمرانی کو ناخوشی سے قبول کر رہے ہیں اور اپنی زیرزمین متوازی حکومت بنا رہے ہیں۔ دونوں گروپوں کے درمیان تشدد کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ البانوی اور یونانی حکومتیں ایک دوسرے کے ملکوں میں موجود اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے آنکھوں میں

آنکھیں ڈالے ہوئے ہیں۔ ترک اور یونانی تاریخی حوالے سے ایک دوسرے کے گریبان پکڑے ہوئے ہیں۔ قبرص پر ترکوں اور آرتھوڈوکس یونانیوں کے درمیان سفاکانہ حالات قائم ہیں۔ کاکیشیا میں ترکی اور آرمینیا تاریخی دشمن ہیں اور آذری اور آرمینیائی نگورنو کاراباخ پر قبضے کیلئے لڑ رہے ہیں۔ شمالی کاکیشیا میں دو سو صدیوں سے چیچن، انگش اور دوسرے مسلم لوگ روس سے آزادی کیلئے اکثر و بیشتر لڑتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خونی جدوجہد روس اور چیچنیا میں 1994ء میں شروع ہوئی۔ انگش اور آرتھوڈوکس اور سیشنز کے درمیان بھی لڑائی ہو رہی ہے۔ وولگا کے طاس میں مسلم تاتاری ماضی میں روسیوں سے لڑ چکے ہیں اور 1990ء کی دہائی کے شروع میں روسیوں سے محدود خودمختاری کے معاہدے میں مشکل سے کامیاب ہوئے ہیں۔

روس نے پوری انیسویں صدی کے دوران میں وسط ایشیا کے مسلموں پر بتدریج غلبہ پایا تھا۔ 1980ء کی دہائی کے دوران میں افغانوں اور روسیوں نے ایک بڑی جنگ لڑی اور روسیوں کی پسپائی کے بعد اس کا تسلسل تاجکستان میں جاری ہے جہاں روسی فوجیں موجودہ حکومت کو اسلام پسند ابھار کو دبانے میں مدد دے رہی ہیں۔ زن جیانگ میں اویغور اور دوسرے مسلم گروپ چینیت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اور سابق سوویت جمہوریاؤں میں اپنے نسلی اور مذہبی رشتہ داروں سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ برصغیر میں پاکستان اور ہندوستان تین جنگیں لڑ چکے ہیں۔ ایک مسلم ابھار کشمیر میں ہندوؤں سے نبرد آزما ہے۔ مسلم امیگرنٹ آسام میں قبائلی لوگوں سے لڑ رہے ہیں نیز سارے ہندوستان میں مسلموں اور ہندوؤں کے درمیان وقتاً فوقتاً خونی فسادات اور تشدد کی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں ان فسادات کو دونوں مذہبی برادریوں کے اندر بنیاد پرستانہ تحریکوں سے فروغ ملا ہے۔ بنگلہ دیش میں بدھ احتجاج کر رہے ہیں کہ اکثریتی مسلم ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں جبکہ میانمار میں مسلم احتجاج کرتے ہیں کہ بدھ اکثریت ان کے ساتھ امتیاز برتتی ہے۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا میں مسلم وقتاً فوقتاً چینیوں کے خلاف ہنگامے کر کے ان کی معاشی برتری پر احتجاج کرتے ہیں۔ جنوبی تھائی لینڈ میں ایک مسلم ابھار بدھ حکومت کے خلاف وقفوں

وقفوں سے جاری ہے جبکہ جنوبی فلپائن میں مسلم ایک کیتھولک ملک اور حکومت سے آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں کیتھولک مشرقی تیمور مسلم حکومت کے تسلط کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کا جھگڑا یہودیوں کے وطن کے قیام سے شروع ہوا تھا۔ اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان چار جنگیں ہو چکی ہیں اور فلسطینی اسرائیلی حکمرانی کے خلاف انتفاضہ شروع کئے ہوئے ہیں۔ لبنان میں میرونائٹ عیسائی شیعوں اور دوسرے مسلموں کے خلاف ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ چکے ہیں۔ ایتھوپیا میں آرتھوڈوکس آمارا تاریخی طور پر مسلم نسلی گروپوں پر تسلط قائم کئے ہوئے ہیں اور مسلم اروموؤں کی طرف سے ابھار کا سامنا کر رہے ہیں۔ افریقہ بھر میں شمال کے عرب اور مسلموں اور جنوب کے عیسائی سیاہ فاموں کے درمیان مختلف انواع کے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خونی عیسائی مسلم جنگ سوڈان میں ہوئی ہے۔ جو کئی عشروں سے جاری تھی اور جس میں سینکڑوں ہزاروں ہلاکتیں ہوئیں۔ نائیجیریا کی سیاست پر شمال کے مسلموں اور جنوب کے عیسائی قبیلوں کے درمیان جھگڑے کا غلبہ ہے۔ یہاں مسلسل فسادات اور ہنگامے ہوتے رہتے ہیں اور ایک بڑی جنگ لڑی جا چکی ہے۔ چاڈ' کینیا اور تنزانیہ میں بھی ایسی ہی مسلم عیسائی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔

ان سب مقامات پر مسلموں اور دوسری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں ...... کیتھولکوں' پروٹسٹنٹوں' آرتھوڈوکس' ہندوؤں' چینیوں' بدھوں' یہودیوں...... کے درمیان تعلقات کی نوعیت عموماً معاندانہ رہی ہے جو 1990ء کے دوران میں تشدد آمیز ہو گئے۔ اگر کوئی غور کرے تو پتا چلتا ہے جہاں جہاں اسلام کی سرحدیں ہیں وہاں وہاں مسلموں نے اپنے ہمسایوں کیلئے مصیبتیں کھڑی کی ہوئی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے آیا بیسویں صدی کے اواخر کا یہ مسلم اور غیر مسلم جھگڑے کا پیٹرن دوسری تہذیبوں کے گروپوں کے باہمی تعلقات پر بھی صادق آتا ہے؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ مسلم دنیا کی آبادی کا قریباً پانچواں حصہ ہیں لیکن وہ 1990ء کی دہائی کے دوران میں کسی دوسری تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مقابلے

میں کہیں زیادہ تعداد میں گروپوں کے مابین جھگڑوں میں ملوث رہے۔ ثبوت بے شمار ہیں:

1- ٹیڈ رابرٹ گر (TED ROBERT GURR) کے تجزیے کے مطابق 1993-94ء میں نسلی سیاسی بنیادوں پر ہونے والے 50 جھگڑوں میں سے 26 میں مسلم شریک تھے۔ ان میں 20 جھگڑے مختلف تہذیبوں کے گروپوں کے مابین ہوئے تھے 15 مسلمانوں اور غیر مسلموں کے۔ مختصراً بین التہذیبی جھگڑوں میں مسلم غیر مسلموں کی نسبت تین گنا زیادہ شامل تھے۔ اسلام کے اندرونی جھگڑے کسی دوسری تہذیب کے مقابلے میں تعداد میں بہت زیادہ ہیں بشمول افریقہ کے قبائلی جھگڑوں کے۔ اسلام کے برعکس مغرب صرف دو بین التہذیبی اور دو درون تہذیبی جھگڑوں میں ملوث ہوا۔ جن جھگڑوں میں مسلم شامل ہوتے ہیں ان میں بہت زیادہ ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ گر نے اندازہ لگایا ہے کہ جن چھ جنگوں میں دو یا دو لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے ان میں سے تین (سوڈان' بوسنیا' مشرقی تیمور) مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوئیں۔ دو (صومالیہ' عراق' کرد) مسلموں کے درمیان ہوئیں اور صرف ایک (انگولا) میں صرف غیر مسلم ملوث تھے۔

2- نیو یارک ٹائمز نے 48 مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں 1993ء میں 59 نسلی جھگڑے رونما ہوئے۔ ان مقامات میں سے نصف میں مسلم مسلموں یا غیر مسلموں سے تصادم کر رہے ہیں۔ 59 جھگڑوں میں سے 31 جھگڑے مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے مابین ہوئے اور گر کے ڈیٹا کے مساوی' ان بین التہذیبی جھگڑوں کا دو تہائی (21) مسلموں اور دوسروں کے درمیان ہوئے۔

3- ایک اور تجزیے میں رتھ لیگر سیوارڈ نے 1992ء میں 29 جنگوں کو شمار کیا (ایسے جھگڑے جن میں سال بھر میں 1000 یا اس سے زیادہ ہلاکتیں ہوئی ہوں) بارہ بین التہذیبی جھگڑوں میں سے نو مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوئے اور مسلم ایک بار پھر کسی بھی دوسری تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لڑے۔

تین مختلف ڈیٹا بندی کا نتیجہ یکساں نکلا ہے۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں مسلم غیر

مسلموں کے مقابلے میں زیادہ گروپوں کے مابین تشدد میں ملوث تھے اور بین التہذیبی جنگوں کے تین ربعوں میں سے دو تہائی مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان لڑی گئیں۔ اسلام کی سرحدیں خوں خوار ہیں اور اس کا داخل بھی ایسا ہی ہے۔

تشدد کی طرف مسلم رجحان کا اندازہ مسلم معاشروں کی عسکریت کے درجے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے دوران میں مسلم ملکوں میں فوجیوں کی تعداد (ایک ہزار افراد کے لحاظ سے فوجی جوان) اور فوجی مصارف (ملک کی دولت کے حوالے سے) دنیا کے دوسرے ملکوں کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ عیسائی ملک اس کے برعکس دوسرے ملکوں کے مقابلے میں فوجیوں کی کم تعداد رکھتے ہیں اور ان کے فوجی مصارف بھی کم ہیں۔ مسلم ملکوں کا اوسط فوجی تناسب اور فوجی مصارف کا تناسب عیسائی ملکوں سے دگنا ہے۔ جیمز پین نتیجہ اخذ کرتا ہے "اسلام اور عسکریت پسندی میں تعلق بالکل واضح ہے۔"

وجوہات: تاریخ' آبادی' سیاست

بیسویں صدی کے اواخر میں ہونے والی تقسیمی خط کی جنگوں اور ایسے جھگڑوں میں مسلموں کے مرکزی کردار کی وجوہات کیا ہیں؟ اول: ان جنگوں کی جڑیں تاریخ میں ہیں۔ ماضی میں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے درمیان تقسیمی خط کے جھگڑے زیرزمین ہوتے تھے اور اب ماضی کی یادوں میں موجود ہیں جو دونوں فریقوں میں عدم تحفظ اور خوف کو جنم دیتی ہیں۔ برصغیر میں مسلم اور ہندو' شمالی کاکیشیا میں روسی اور کاکیشیائی' ٹرانس کاکیشیا میں آرمینیائی اور ترک' فلسطین میں عرب اور یہودی' بلقان میں کیتھولک' مسلم اور آرتھوڈوکس' بلقان سے وسط ایشیا تک روسی اور ترک' سنہالی اور تامل سری لنکا میں' افریقہ بھر میں عرب اور سیاہ فام' یہ سب تعلقات صدیوں سے بقائے باہم کے حوالے سے عدم اعتماد اور سفاکانہ تشدد سے بھرے پڑے ہیں۔ جھگڑے کی ایک تاریخی وجہ موجود ہوتی ہے اور جو لوگ جھگڑنا چاہتے ہیں انہیں اس کیلئے جواز مہیا کرتی ہے۔ ان تعلقات میں تاریخ زندہ ہے اور دہشت زدہ کر دیتی ہے۔

تاہم بار بار کے قتل عام کی تاریخ بیسویں صدی کے اواخر میں تشدد کے دوبارہ پھوٹ پڑنے کی وضاحت نہیں کرتی۔ بہرحال جیسا کہ کئی لوگوں نے نشاندہی کی ہے یوگوسلاویہ میں سرب' کروٹ اور مسلم صدیوں سے پرامن طور پر رہ رہے تھے۔ ایسے ہی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان۔ سوویت یونین میں بہت سے نسلی اور مذہبی گروپ باہمی طور پر رہتے رہے' سوائے چند قابل ذکر مستثنیات کے جن کیلئے سوویت حکومت ذمہ دار تھی۔ تامل اور سنہالی بھی ایک ایسے جزیرے میں جسے گرم جنت کہا جاتا ہے بالکل متحد ہو کر رہتے رہے ہیں۔ تاریخ نے ان نسبتاً پرامن تعلقات کو وقت کے ٹھوس دورانیوں تک اثر و نفوذ پانے سے نہیں روکا لہٰذا تاریخ بذات خود امن کے ٹوٹنے کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں لازماً دوسرے عوامل نے بھی یورش کی ہے۔

آبادی کے توازن میں تبدیلی ایسا ہی ایک عامل ہے۔ کسی ایک گروپ کی تعداد میں اضافہ دوسرے گروپوں پر سیاسی' معاشی اور سماجی دباؤ ڈالتا ہے اور مزاحمتی ردعمل پیدا کرتا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ آبادیاتی حوالے سے کم حرکیاتی گروپ پر فوجی دباؤ پیدا کرتا ہے۔ لبنان میں 1970ء کی دہائی کے شروع میں تیس سالہ قدیم آئینی نظام کے انہدام کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میرونائٹ عیسائیوں کے مقابلے میں شیعوں کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گیری فلر نے واضح کیا ہے کہ سری لنکا میں 1970ء میں سنہالی قوم پرست ابھار اور 1980ء کی دہائی کے اواخر میں تامل ابھار ٹھیک انہیں برسوں میں رونما ہوا جب ان دونوں گروپوں میں پندرہ سے چوبیس سالہ نوجوانوں کی تعداد اس گروپ کی کل آبادی کے بیس فیصد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ سری لنکا میں رہنے والے ایک امریکی سفارتکار نے تبصرہ کیا کہ سنہالی باغی واقعتاً سب کے سب چوبیس سال سے کم عمر کے ہوتے تھے اور بیان کیا گیا ہے کہ تامل ٹائیگر ''اپنی بچوں کی فوج پر اعتماد کے حوالے سے منفرد'' تھے اور انہوں نے اس میں گیارہ برس کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھرتی کیا تھا۔ لڑائی میں مرنے والوں کی اکثریت ٹین ایجرز کی تھی ان میں سے چند ہی اٹھارہ سال سے زیادہ کے ہوتے تھے۔ اکنامسٹ نے تبصرہ کیا کہ ''ٹائیگر ایک انڈر ایج جنگ'' لڑ رہے ہیں۔ اسی طرح روسیوں اور مسلم لوگوں

کے درمیان تقسیمی خط کی جنگوں میں آبادی میں اضافے میں اختلافات نے بڑھاوا دیا۔ 1990ء کی دہائی کے شروع میں روسی فیڈریشن میں عورتوں کے حاملہ ہونے کا تناسب 1.5 تھا جبکہ سابق سوویت مسلم وسط ایشیائی جمہوریاؤں میں عورتوں کے حاملہ ہونے کا تناسب 4.4 تھا اور آبادی میں صافی اضافہ (خام شرح پیدائش منفی خام شرح اموات) 1980ء کی دہائی کے اواخر میں روس سے 5 سے 6 گنا زیادہ تھا۔ 1980ء کی دہائی میں چیچن 26 فیصد بڑھے اور چیچنیا روس کا ایک سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ تھا۔ اس کی بلند شرح پیدائش نے پناہ گزین اور جنگجو پیدا کیے۔ اسی طرح کشمیر میں بلند شرح پیدائش اور پاکستان سے نقل مکانی نے ہندوستانی حکمرانی کے خلاف مزاحمت کو دوبارہ ابھارا۔

بیسویں صدی کے اواخر میں آبادی کے توازن میں تبدیلی اور نوجوانوں کی تعداد کا 20 فیصد یا اس سے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بہت سے بین التہذیبی جھگڑے رونما ہوئے۔ تاہم یہ سب جھگڑوں کی وجہ نہیں بنے تھے۔ مثال کے طور پر سربوں اور کروٹوں کے درمیان لڑائی آبادی کی وجہ سے نہیں ہوئی اور اس معاملے میں صرف تاریخ کا کردار نمایاں ہے۔ یہ دونوں لوگ اس وقت تک امن سے رہتے رہے تھے جب تک کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران کروٹوں نے سربوں کا قتل عام نہیں کیا تھا۔ یہاں اور بعض دوسری جگہوں پر سیاست جھگڑے کا باعث ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد آسٹرو ہنگرین' عثمانی اور روسی شہنشاہیوں کے انہدام نے آنے والے لوگوں اور ریاستوں میں نسلی اور تہذیبی جھگڑے پیدا کیے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی' فرانسیسی اور ڈچ سلطنتوں کے انہدام نے ایسے ہی نتائج پیدا کیے۔ سوویت یونین اور یوگوسلاویہ میں کمیونسٹ نظام کے زوال سے سرد جنگ کے اختتام پر ایسے ہی نتائج پیدا ہوئے۔ لوگوں کی شناخت بطور کمیونسٹ' سوویت شہری یا یوگوسلاوی کے ختم ہوگئی اور وہ مایوسی کے عالم میں نئی شناختیں ڈھونڈنے لگے۔ یہ شناختیں انہیں پرانے نسلی اور مذہبی حوالوں میں ملیں۔ خداؤں سے محروم مجبور مگر پرامن نظام والی ریاستوں میں مختلف خداؤں کو ماننے والے پرتشدد لوگوں نے غلبہ پالیا۔

بیسویں صدی کے اختتام پر یہ سوال ہنوز برقرار ہے کہ مسلم دوسری تہذیبوں سے تعلق

رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں کیوں اتنے زیادہ بین التہذیبی جھگڑوں میں ملوث ہیں؟ کیا معاملہ ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے؟ ماضی میں تو عیسائیوں نے اپنے بھائی عیسائیوں کو قتل کیا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی بہت بڑے پیمانے پر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ ساری تاریخ کے دوران میں تہذیبوں میں تشدد کے رجحانات کا جائزہ لینے کیلئے تو بہت وسیع تحقیق کی ضرورت ہے جو یہاں تو ممکن نہیں ہے۔ تاہم جو کچھ ممکن العمل ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ مسلم گروہی تشدد کی ممکنہ وجوہات کی شناخت کی جائے۔ اس کی چھ وجوہات ہیں: تین وجوہات صرف مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان تشدد اور تین دونوں اور درون اسلام تشدد کی وضاحت کرتی ہیں تین صرف مسلموں کے معاصر رجحان کی وضاحت کرتی ہیں جبکہ تین دیگر تاریخی مسلم رجحان کی وضاحت کرتی ہے' اگر یہ موجود ہے۔ تاہم اگر تاریخی رجحان موجود نہیں تو معاصر مسلم گروہی تشدد کی وجوہات کا بھی تعین نہیں ہو سکتا۔

اول: کہا جاتا ہے کہ اسلام اپنی ابتدا ہی سے تلوار کا مذہب رہا ہے اور یہ فوجی اقدامات کی ستائش کرتا ہے۔ اسلام ''لڑاکا بدو قبیلوں'' میں پیدا ہوا اور یہ ''پرتشدد آغاز ہی اسلام کی جڑوں پر مہر ہے۔ محمدؐ بذات خود ایک سخت جنگجو اور ماہر فوجی کمان دار مانا جاتا ہے۔'' (کوئی بھی عیسیٰؑ یا بدھ کے حوالے سے ایسا نہیں کہہ سکتا) دلیل دی جاتی ہے کہ اسلامی فلسفہ کافروں کے خلاف جنگ کا حکم دیتا ہے اور جب اسلام کی ابتدائی توسیع کا سلسلہ رکا تو مسلم گروپ فلسفے کے بالکل خلاف' آپس ہی میں لڑنے مرنے لگے۔ جہاد کی نسبت ''فتنہ'' یعنی داخلی جھگڑے بڑھنے لگے۔ قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کی ممانعت کہیں کہیں ہے اور عدم تشدد کا تصور مسلم فلسفے اور عمل میں معدوم ہے۔

دوم: عرب سے آغاز کے بعد اسلام سارے شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر علاقوں میں پھیل گیا اور بعد میں وسطی ایشیا' برصغیر اور بلقان تک۔ اس کی وجہ سے مسلموں کو مختلف لوگوں کے ساتھ میل جول کا موقع ملا۔ بلقان کی عثمانی فتوحات کے دوران میں اکثر شہری جنوبی سلاو مسلم ہو گئے جبکہ دیہاتی نہ ہوئے اور یوں مسلم بوسنیائیوں اور آرتھوڈوکس سربوں میں امتیاز رونما ہوا۔ روسی سلطنت کی بحیرۂ اسود' کاکیشیا اور وسطی ایشیا پر حکومت سے مسلم

لوگوں میں مزاحمت پیدا ہوئی جو صدیوں سے جاری ہے۔ مغرب کے تعاون سے یہودی مادر وطن کا قیام عرب اسرائیلی جھگڑے کا باعث بنا۔

سوم: ایک سیاستدان کے مطابق مسلم غیر مسلم تشدد کا سبب مسلم معاشروں کا غیر مسلموں کو اقلیت کے طور پر جذب کرنے سے انکار ہے۔ اسی طرح غیر مسلم معاشرہ مسلموں کو جذب نہیں کرتا ہے۔ عیسائیت کے مقابلے میں اسلام زیادہ غیر لچک دار مذہب ہے۔ یہ مذہب اور سیاست کو ایک تصور کرتا ہے اور دارالسلام اور دارالحرب میں واضح تقسیم کرتا ہے۔ نتیجتاً کنفیوشسی' بدھ' ہندو' مغربی عیسائی اور آرتھوڈوکس عیسائی مسلمانوں کے ساتھ رہنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

عسکریت' جذب نہ کرنا اور غیر مسلم گروپوں کے ساتھ اجنبیت اسلام کے تاریخ بھر میں اوصاف رہے ہیں اور مسلم جھگڑنے کے رجحان کی وضاحت کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں کسی مرکزی ریاست کا فقدان ان کے جھگڑے کے رجحان کی وضاحت کرتا ہے۔ اسلام اس لئے دنیا میں عدم استحکام کا منبع ہے کہ اس کا کوئی غالب مرکز نہیں ہے۔ سعودی عرب' ایران' پاکستان' ترکی اور انڈونیشیا جیسی ریاستیں اسلام کا لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے آپس میں مقابلے بازی میں مبتلا تو ہیں لیکن کوئی بھی اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ داخلی جھگڑوں ہی کو سلجھا سکے اور نہ ہی کسی کے پاس اتنی سکت ہے کہ وہ اسلام کے حوالے سے مسلموں اور غیر مسلموں کے جھگڑوں میں ثالث کا کردار ادا کر سکے۔ آخری بات جو سب سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ مسلم معاشروں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ ان میں اکثر بیروزگار ہیں جن کی عمریں 15 سے 30 سال کے درمیان ہیں۔ یہی لوگ عدم استحکام اور تشدد کا سب سے بڑا سرچشمہ ہیں۔ خواہ دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہوں تاہم تنہا یہی عامل 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی میں مسلم تشدد کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اس نسل کی عمر میں اضافہ اور مسلم معاشروں کی معاشی ترقی مسلم تشدد کے رجحانات میں نمایاں کمی کر دے گی اور اس کے نتیجے میں تقسیمی خط کی جنگوں کا تسلسل اور شدت دم توڑ دیں گے۔

☆☆☆

باب 11

تقسیمی خط کی جنگوں کی حرکیات

تشخص: تہذیبی شعور کا طلوع

تقسیمی خط کی جنگیں شدت' پھیلاؤ' محدودیت' مداخلت اور کبھی کبھار صلح کے مراحل سے گزرا کرتی ہیں۔ یہ عمل (پروسیز) سلسلہ وار شروع ہوتے ہیں لیکن یہ بے ترتیب بھی ہو سکتے ہیں اور بار بار رونما بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی طرح تقسیمی خط کی جنگیں بھی ایک بار شروع ہو جائیں تو پھر عمل اور ردعمل کے سلسلے کے تحت چلتی رہتی ہیں۔ وہ شناختیں جو پہلے تو ہمہ پہلو اور عارضی ہوتی ہیں سخت اور مرتکز ہو جاتی ہیں۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کو درست طور پر ''تشخص کی جنگوں'' کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے تشدد بڑھتا ہے' ابتدائی نوعیت کے مسائل زیادہ سنجیدہ اور سنگین ہو کر ''ہمارا'' بمقابلہ ''ان کا'' میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور گروپ کا ربط اور وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ سیاسی لیڈر نسلی اور مذہبی وفاداریوں کے بارے میں زیادہ اپلییں کرنے لگتے ہیں نیز دوسری شناختوں کے مقابلے میں تہذیبی شعور مضبوط ہونے لگتا ہے۔ ایک ''نفرت کی حرکیات'' جنم لیتی ہے جو بین الاقوامی تعلقات میں ''سلامتی کے خدشے'' کے مماثل ہوتی ہے جس میں دوطرفہ خوف' بے

اعتباری اور نفرت ایک دوسرے کی آگ کیلئے ایندھن کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ دونوں فریق خیر اور شر کی قوتوں کو ڈرامائی انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور آخر کار اس تفریق کو زندگی اور موت کے درمیان تفریق کا درجہ دے دیتے ہیں۔

جیسے جیسے انقلاب رونما ہوتے ہیں اعتدال پسند گروڈین اور مینشویک کی جگہ جیکبی اور بالشویک ریڈیکل آجاتے ہیں۔ تقسیمی خط کی جنگوں میں بھی ایسا ہی عمل وقوع میں آتا ہے۔ اعتدال پسند آزادی کے بدلے خودمختاری جیسے محدود اہداف کو مذاکرات کے ذریعے حاصل نہیں کرپاتے ہیں' جو کہ ابتداء میں قریباً ناکام ہی ہوا کرتے ہیں اور ان کی جگہ ایسے ریڈیکل سامنے آجاتے ہیں جو تشدد کے ذریعے زیادہ انتہائی اہداف حاصل کرنے کیلئے کمربستہ اور سربکف ہوتے ہیں۔ مورو فلپائنی جھگڑے میں بڑے باغی گروپ مورو نیشنل لبریشن فرنٹ کی جگہ ایک زیادہ انتہا پسندانہ موقف کے حامل مورو اسلامک لبریشن فرنٹ نے لے لی اور پھر ابو سیاف نے جو کہ اب بھی سب سے زیادہ انتہا پر ہے اور جس نے دوسرے گروپوں کے فلپائنی حکومت سے مذاکرات کے بعد سیز فائر کو قبول نہیں کیا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں عیسائی بغاوت شروع ہوگئی جو ایک نئے گروپ جنوبی سوڈانی تحریک آزادی نے شروع کی تھی۔ یہ گروپ سادہ خودمختاری کے بجائے آزادی کی مانگ کرتا تھا۔ اسرائیلیوں اور عربوں میں جاری جھگڑے میں جونہی مرکزی دھارے کی فلسطین لبریشن آرگنائزیشن اسرائیل حکومت سے مذاکرات کی طرف بڑھی فلسطینیوں سے وفا کے نام پر مسلم برادری کی حماس نے اس کو چیلنج کر دیا۔ جیسے ہی 1992-1993ء میں روسیوں کے ساتھ چیچنوں کا جھگڑا بڑھا تو دوائیف حکومت پر چیچن قوم پرستوں کے انتہائی ریڈیکل دھڑے کا غلبہ ہوگیا جو ماسکو کے ساتھ کسی بھی قسم کی مصالحت کا مخالف تھا جبکہ زیادہ معتدل قوتوں کو حزب اختلاف میں دھکیل دیا گیا۔ تاجکستان میں بھی اس سے ملتی جلتی تبدیلی رونما ہوئی'' جونہی 1992ء کے دوران میں جھگڑا بڑھا تو تاجک نیشنلسٹ ڈیموکریٹک گروپ کی جگہ بتدریج اسلام پسند گروپوں نے موثر حیثیت حاصل کرنا شروع کر دی جو دیہی غریبوں اور شہری نوجوانوں کو زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب تھے۔ اسلام پسند پیغام نوجوان لیڈروں کے ابھرنے کے ساتھ ہی زیادہ ریڈیکل ہو

گیا جس نے روایتی اور زیادہ عملیت پسند ملائیت کو چیلنج کیا۔" ایک تاجک لیڈر نے کہا "میں سفارتکاری کی ڈکشنری بند کر رہا ہوں۔ میں میدان جنگ کی زبان بولنے کا آغاز کر رہا ہوں' جو میری مادر وطن میں روسیوں کی پیدا کردہ صورت حالات کے حوالے سے موزوں ترین زبان ہے۔" بوسنیا میں مسلم پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن کے اندر حارث سلاجیک کی سربراہی میں کام کرنے والے زیادہ اعتدال پسند اور ملٹی کلچرل دھڑے کی جگہ عالی جاہ عزت بیگووچ کے زیادہ انتہائی قوم پرست دھڑے نے اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔"

انتہا پسندوں کی فتح لازمی طور پر مستقل نہیں ہوا کرتی ہے۔ انتہا پسندانہ تشدد تقسیمی خط کی جنگ کے خاتمے کیلئے اعتدال پسندانہ مصالحت سے زیادہ موثر نہیں ہوا کرتا ہے۔ جونہی اموات اور تباہی و بربادی بڑھتی ہے اعتدال پسند دونوں فریقوں میں دوبارہ نمودار ہونے لگتے ہیں اور جاری عمل کی "بے شعوریت / پاگل پن" کو دوبارہ واضح کرتے ہیں اور مذاکرات کے ذریعے اس کو ختم کرنے کی ایک اور کوشش کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔

جنگ کے دوران میں مشترکہ شناختیں ختم ہو جاتی ہیں اور جھگڑے سے متعلق شناخت / تشخص غالب آ جاتا ہے۔ تشخص ہمیشہ مذہب سے متعین ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور پر مذہب ان "بے خدا" قوتوں کے خلاف جدوجہد کیلئے سب سے زیادہ یقینی اور امدادی جواز فراہم کرتا ہے جو بہت زیادہ خطرہ سمجھی جا رہی ہوتی ہیں۔ عملی طور پر یہ وسیع ترین مذہبی یا تہذیبی برادری ہی ہوا کرتی ہے جس کو جھگڑے میں امداد کے واسطے مقامی گروپ بلاوا دے سکتا ہے۔ اگر دو افریقی قبیلوں کے درمیان مقامی جنگ ہو رہی ہو تو ایک گروپ خود کو مسلم اور دوسرا عیسائی قرار دے سکتا ہے۔ اول الذکر گروپ سعودی دولت' افغان "مجاہدین" اور ایرانی ہتھیاروں اور فوجی مشیروں کی امداد کا خواہاں ہو سکتا ہے۔ جب تک کوئی گروپ بوسنیائی مسلموں کی طرح خود کو نسل کشی کا نشانہ ثابت نہ کرے اسے مغربی ہمدردی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسے صرف اپنے تہذیبی رشتہ دار سے ہی مدد کی توقع ہو سکتی ہے اور بوسنیائی مسلموں کے علاوہ بھی یہی بات درست ہے۔ تقسیمی خط کی جنگیں تعریف کی رو سے وسیع روابط رکھنے والے مقامی گروپوں کی مقامی جنگیں ہوتی ہیں۔ جو اپنے شرکاء میں تہذیبی شناختوں کو ترویج دیتی ہیں۔

تہذیبی شناختوں کی مضبوطی مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے تقسیمی خط کی جنگ کے شرکاء میں پیدا ہوتی ہیں تاہم یہ مسلموں میں زیادہ غالب ہیں۔ ایک تقسیمی خط کی جنگ کی جڑیں ہوسکتا ہے کہ خاندان' برادری یا قبیلے کے جھگڑوں میں ہوں لیکن مسلم دنیا میں شناختیں یو (U) کی شکل کی ہوتی ہیں جونہی کشمکش بڑھتی ہے تو مسلم شرکاء اپنی شناخت کو تیزی سے وسعت دینا شروع کر دیتے ہیں اور سارے اسلام سے اپیل کرنے لگتے ہیں جیسا کہ صدام حسین جیسے بنیاد پرستی کے مخالف سیکولرسٹ تک کے معاملے میں ہوا۔ اسی طرح آذربائیجانی حکومت ''اسلامی کارڈ کھیل رہی ہے۔'' تاجکستان میں ایک داخلی تاجکستانی علاقائی جھگڑے کے طور پر شروع ہوئی جنگ میں باغی اپنے کاز کو اسلامی کاز قرار دینے لگے ہیں۔ انیسویں صدی میں شمالی کاکیشیا کے لوگوں اور روسیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں مسلم لیڈر شامل نے خود کو اسلام پسند قرار دیا اور درجنوں نسلی اور لسانی گروپوں کو اسلام کے نام پر اکٹھا کر لیا۔ 1990ء کی دہائی میں دودائیف نے 1980ء کی دہائی میں کاکیشیا میں اپنائی گئی حکمت عملی کو مستعار لیا۔ اس کو اسلام پسند حلقوں اور پارٹیوں نے حمایت فراہم کی اور اس نے قرآن پر اپنے عہدے کا حلف اٹھایا (یہاں تک کے یلسن نے بھی آرتھوڈوکس باپ سے دعا لی) نیز 1994ء میں تجویز کیا کہ چیچنیا ایک اسلامی ملک ہوگا جسے شریعت کے تحت چلایا جائے گا۔ چیچن فوجی سبز سکارف باندھتے ہیں جس پر چیچن زبان میں مقدس جنگ کا مترادف لفظ ''گوازۃ'' لکھا ہوتا ہے۔ جب وہ جنگ کیلئے نکلتے ہیں تو ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگاتے ہیں۔ اسی طرح کشمیری مسلموں نے مسلم' ہندو اور بدھ کی علاقائی شناخت یا ایک ہندوستانی سیکولرسٹ کے بجائے ایک تیسری شناخت کو اپنایا ہے جو ''کشمیر میں ابھرتی ہوئی مسلم قوم پرستی اور بین الاقوامی اسلامی بنیاد پرستانہ اقدار کو منعکس کرتی ہے' جس کی وجہ سے کشمیری مسلموں میں اسلامی پاکستان اور اسلامی دنیا دونوں کا حصہ ہونے کا احساس پیدا ہوا ہے۔'' 1989ء میں ہندوستان کے خلاف شروع ہونے والی تحریک کو اصل میں ایک ''اضافی طور پر سیکولر'' تنظیم نے شروع کیا تھا جس کو پاکستانی حکومت کی مدد حاصل تھی۔ پھر پاکستانی حمایت ان اسلام پسند گروپوں کو منتقل ہوگئی جو غالب آگئے تھے۔ ان گروپوں میں ''سخت گیر باغی'' شامل

ہیں جو نتائج سے بے پروا ہو کر اپنے ''جہاد'' کو جاری رکھنے پر ڈٹے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ ایک اور مبصر کا کہنا ہے کہ ''قوم پرستانہ احساسات مذہبی اختلافات کی وجہ سے بہت بڑھ جاتے ہیں' اسلامی عسکریت کے عالمی (گلوبل) ابھار نے کشمیری باغیوں کو جرأت عطا کی ہے اور کشمیر کی ہندو مسلم اعتدال پسندی کو بہا لے گیا ہے۔''

تہذیبی شناختوں کا ایک ڈرامائی ابھار بوسنیا میں واقع ہوا ہے' خصوصاً اس کی مسلم برادری میں۔ بوسنیا میں فرقہ وارانہ شناختیں تاریخی طور پر مضبوط نہیں رہی ہیں۔ سرب' کروٹ اور مسلم عیسائیوں کے طور پر امن کے ساتھ رہتے رہے ہیں۔ گروپوں کے درمیان شادیاں عام تھیں' مذہبی شناختیں کمزور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ مسلم وہ بوسنیائی تھے جو مسجد نہیں جاتے تھے۔ کروٹس وہ بوسنیائی تھے جو کیتھڈرل نہیں جاتے تھے اور سرب ایسے بوسنیائی تھے جو آرتھوڈوکس چرچ نہیں جاتے تھے۔ تاہم جب ایک دفعہ وسیع یوگوسلاو تشخص بکھر گیا تو ان عام مذہبی شناختوں کو نئی معنویت حاصل ہو گئی اور جب ایک دفعہ جنگ شروع ہو گئی تو انہوں نے اس میں شدت پیدا کی۔ بہت سے فرقوں پر مشتمل نظام ختم ہو کر رہ گیا اور ہر گروپ اپنے آپ کو اپنی وسیع ثقافتی برادری سے شناخت کروانے لگا نیز اپنے آپ کو مذہبی اصطلاحوں میں متعارف کروانے لگا۔ بوسنیائی سرب انتہا پسند قوم پرست سربوں میں تبدیل ہو گئے اور خود کو عظیم تر سربیا' سربیائی آرتھوڈوکس چرچ اور زیادہ وسیع آرتھوڈوکس برادری سے شناخت کروانے لگے۔ بوسنیائی کروٹ جو سب سے زیادہ پرجوش اور سرگرم کروشیائی قوم پرست تھے' خود کو کروشیا کا شہری کہلوانے لگے تھے اور اپنے کیتھولک ازم پر مصر تھے اور کروشیا کے کروٹوں کے ساتھ ساتھ ان کا تشخص کیتھولک مغرب کے ساتھ بھی تھا۔

مسلموں میں تہذیبی شعور کہیں زیادہ نمایاں تھا۔ جنگ کے دوران تک بھی بوسنیائی مسلم بہت زیادہ سیکولر ظاہر ہوتے تھے۔ خود کو یورپی کے طور پر پیش کرتے تھے اور ملٹی کلچرل بوسنیائی معاشرے اور ریاست کے مضبوط حامی تھے۔ تاہم یہ رویہ تب تبدیل ہونا شروع ہوا جب یوگوسلاویہ ٹوٹا۔ کروٹوں اور سربوں کی طرح 1990ء کے انتخابات میں مسلموں نے ملٹی کمیونل پارٹیوں کو مسترد کر دیا اور مسلم پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن (ایس ڈی اے) کو

بھر پور ووٹ دیئے جس کی قیادت عزت بیگووچ کر رہے تھے۔ وہ ایک کٹر مسلم ہیں اور کمیونسٹ حکومت نے انہیں ان کے اسلامی تحرک کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور 1970ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اسلامی اعلامیہ'' میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''اسلام دوسرے مذاہب سے مماثل نہیں ہے۔ مذہب اسلام اور غیر اسلامی معاشرتی اور سیاسی اداروں میں کوئی امن اور بقائے باہم ممکن نہیں ہے۔'' جب اسلامی تحریک کافی مضبوط ہوئی ہے تو ضرور اقتدار حاصل کرے گی اور ایک اسلامی جمہوریہ بنائے گی۔ اس نئی ریاست میں یہ خاص طور پر اہم ہے کہ تعلیم اور میڈیا'' ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے جن کے اسلامی اخلاق اور دانش ورانہ اتھارٹی غیر متنازعہ ہو۔''

جونہی بوسنیا آزاد ہوا عزت بیگووچ نے ایک کثیر نسلی ریاست کو تشکیل دیا جس میں تھوڑی اکثریت کے باوجود مسلم غالب گروپ تھے۔ تاہم اس نے جنگ سے پیدا ہونے والے اپنے ملک کی اسلامائزیشن میں مزاحمت نہیں کی۔ اس کے ''اسلامی اعلامیہ'' والے رویے نے غیر مسلموں میں خوف پیدا کیا۔ جونہی جنگ شروع ہوئی بوسنیائی سربوں اور کروٹوں نے بوسنیائی حکومت کے زیر قبضہ علاقوں سے نکلنا شروع کر دیا اور جو بچ گئے انہیں ان کی پسندیدہ ملازمتوں اور سماجی اداروں میں شرکت سے خارج کر دیا گیا۔ ''اسلام کو مسلم قومی برادری میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی اور...... ایک مضبوط مسلم قومی تشخص سیاست اور مذہب کا ایک جزو بن گیا۔'' بوسنیائی کثیر الثقافتی قوم پرستی کی جگہ مسلم قوم پرستی میڈیا میں روز افزوں ظاہر ہونے لگی۔ مذہبی تعلیمات سکولوں میں پھیل گئیں اور نئی نصابی کتابیں عثمانی حکومت کے کارناموں کے ذکر سے بھر گئیں۔ بوسنیائی زبان کو سربو کروشیائی زبان سے مختلف قرار دیا جانے لگا اور اس میں زیادہ سے زیادہ ترکی اور عربی الفاظ شامل ہونے لگے۔ حکومتی افسران مشترکہ شادیوں اور ''جارح'' یا سربیائی موسیقی کی نشریات کو ہدف تنقید بنانے لگے۔ حکومت مذہب اسلام کی حوصلہ افزائی کرنے لگی اور مسلموں کو ملازمتوں اور ترقیوں میں ترجیح دینے لگی۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ بوسنیائی فوج اسلامی ہو گئی اور 1995ء میں اس میں مسلموں کی تعداد کل تعداد کا 95 فیصد ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ فوجی یونٹ اپنی

شناخت اسلام سے کروانے لگے۔ اسلامی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے اور اسلامی علامات استعمال کرنے لگے۔ ایلیٹ یونٹ تو کہیں زیادہ اسلامی اور تعداد میں زیادہ ہو گئے۔ اس رجحان کی وجہ سے بوسنیائی پریذیڈنسی کے پانچ ارکان (جن میں دو کروٹ اور دو سرب تھے) نے عزت بیگووچ سے احتجاج کیا نیز 1995ء میں اسی رجحان کی وجہ سے حارث سلاجیک نے وزارت عظمٰی سے استعفٰی دے دیا۔

مجموعی طور پر ایک اور مبصر نے تبصرہ کیا:

مسلم قوم پرستی بہت شدید ہو گئی ہے۔ اب یہ دوسرے قومی احساسات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہے۔ یہ جائیداد ہے اور سیاسی نئی غالب مسلم قوم کا سیاسی ہتھیار...... اس نئی مسلم قوم پرستی کا نتیجہ قومی یکسانیت پیدا کرنے کی تحریک کی صورت میں نکلا ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی مسلم قومی مفادات کے تعین میں غلبہ پانے لگی ہے۔

جنگ اور نسلی صفائی کی پیدا کردہ مذہبی تشخص کی شدت' اس کے لیڈروں کی ترجیح اور دوسری مسلم ریاستوں کی حمایت اور دباؤ نے آہستہ آہستہ مگر واضح طور پر بوسنیا کو بلقان کے سوئٹزرلینڈ سے تبدیل کر کے بلقان کا ایران بنا دیا ہے۔

تقسیمی خط کی جنگوں میں ہر فریق نہ صرف اپنی تہذیبی شناخت بلکہ دوسرے فریق کی تہذیبی شناخت پر بھی زور دیتا ہے۔ اپنی مقامی جنگ میں وہ اپنے آپ کو یوں دیکھتا ہے گویا وہ کسی مقامی نسلی گروپ سے نہیں بلکہ دوسری تہذیب سے لڑ رہا ہے۔ لہٰذا خطرہ ایک بڑی تہذیب کی طرف سے بڑھ جاتا ہے اور شکست نہ صرف اس کیلئے نتائج لاتی ہے بلکہ اس کی ساری تہذیب کیلئے بھی۔ لہٰذا اس کی اپنی تہذیب کیلئے فوری ضرورت جھگڑے میں اس کی پشت پناہی کرنا ہوتی ہے۔ مقامی جنگ کو مذہبوں کی جنگ کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ ایک تہذیب کا تصادم قرار دے دیا جاتا ہے۔ نوع انسان کے بڑے طبقوں کیلئے "نتائج" سے معمور سمجھا جانے لگتا ہے۔ جس طرح 1990ء کی دہائی کے شروع میں روسی قومی تشخص میں آرتھوڈوکس مذہب اور آرتھوڈوکس چرچ کو مرکزی اہمیت دی جانے لگی "جس نے دوسرے روسی عناصر' جن میں اسلام سب سے زیادہ اہم ہے' کو فنا کر کے رکھ دیا۔" روسیوں نے اس بات کو اپنے مفاد میں جانا کہ

تاجکستان اور چیچنیا کے ساتھ جنگ کو قبیلوں اور مذہبوں میں جنگ قرار دے، جو کہ صدیوں پرانے آرتھوڈوکسی اور اسلام کے تصادم کا حصہ ہیں۔ ساتھ ہی اس کے مخالفین بھی اب اسلامی بنیاد پرستی اور جہاد سے وابستہ ہو گئے اور اسلام آباد، تہران، ریاض اور انقرہ کیلئے پراکسی جنگ لڑنے لگے۔

سابق یوگوسلاویہ میں کروٹوں نے خود کو آرتھوڈوکسی اور اسلام کے مغرب کے خلاف دھاوے کے آگے ایک ڈھال تصور کیا۔ سربوں نے اپنے دشمنوں کو صرف بوسنیائی کروٹ یا مسلم ہی قرار نہیں دیا بلکہ "ویٹیکن" اور "اسلامی بنیاد پرست" اور "بدنام ترک" قرار دیا جو عیسائیت کیلئے صدیوں سے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک مغربی سفارتکار نے بوسنیائی سرب لیڈر کے متعلق کہا کہ "کاراز جیک اس جنگ کو یورپ میں استعماریت کے خلاف جنگ تصور کرتا ہے۔ وہ یورپ میں عثمانی ترک سلطنت کے آخری نشانات کو بھی مٹا دینے کی بات کرتا ہے۔" جوابی طور پر بوسنیائی مسلم خود کو نسل کشی کا نشانہ قرار دیتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر مغرب کی نظر اندازی کا ہدف قرار دیتے ہیں اور لہٰذا مسلم دنیا کی امداد کے حق دار۔ یوگوسلاو جنگوں کے سارے فریق اور بیرونی مبصرین بھی انہیں مذہبی یا نسلی مذہبی جنگیں سمجھتے ہیں۔ میشا گلینی نے واضح کیا ہے کہ جھگڑا "مذہبی کشمکش کی خصوصیات سے مشابہت حاصل کر رہا ہے جس میں یورپ کے تین بڑے عقیدے تشخصی کردار ادا کر رہے ہیں...... رومن کیتھولک، مشرقی آرتھوڈوکسی اور اسلام۔

تقسیمی خط کی جنگوں کو تہذیبی تصادم تصور کرنے سے سرد جنگ کے دوران موجود ڈومینو تھیوری کو بھی نئی زندگی ملی ہے۔ تاہم اب یہ تہذیبوں کی بڑی ریاستیں ہیں جو کسی مقامی جھگڑے میں شکست سے بچنے کی ضرورت کو دیکھتی ہیں جو تباہی کے ایسے تسلسل کو شروع کر سکتی ہے جو مکمل بربادی کا باعث بن سکتا ہے۔ کشمیر پر ہندوستانی حکومت کے سخت موقف کا سبب بھی یہ خوف ہے کہ کشمیر میں اس کی شکست سے دوسری نسلی اور مذہبی اقلیتوں میں آزادی کی امنگ پیدا ہو گی اور آخرکار ہندوستان ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ اگر روس تاجکستان میں سیاسی تشدد بند نہیں کرتا تو وزیر خارجہ کوزی روف نے انتباہ کیا کہ یہ کرغزستان اور ازبکستان میں پھیل سکتا ہے۔ اس سے روسی فیڈریشن کی مسلم جمہوریاؤں میں علیحدگی کی

تحریکیں بڑھ سکتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ریڈ سکوائر میں آخرکار اسلامی بنیاد پرستی چھا جائے گی۔ لہٰذا ایلسن کے مطابق افغان تاجیک سرحد روس کے یورپیوں کی سرحد ہے۔ اسی طرح سابق یوگوسلاویہ میں ایک مسلم ریاست کے قیام سے مسلم تارکین وطن اور بنیاد پرستی کو پھیلنے کیلئے مرکز مل جائے گا۔ کروٹوں کی سرحد یورپ کی سرحد ہے۔

جیسے ہی تقسیمی خط کی جنگ میں شدت آتی ہے ہر فریق اپنے مخالف کو شیطان قرار دینے لگتا ہے۔ وہ اسے حیوان قرار دے کر اس کی ہلاکت کو جائز ٹھہراتا ہے۔ چیچن گوریلوں کے حوالے سے یلسن نے کہا تھا "پاگل کتوں کو ہلاک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ان بدنسل لوگوں کو قتل کر دینا چاہیے ...... اور ہم انہیں قتل کریں گے۔" ایسی ہی بات **1991**ء میں مشرقی تیمور کے لوگوں کے قتل عام کے حوالے سے انڈونیشی جنرل ترائی شریسو نے بھی کہی تھی۔ ماضی کے شیطان زمانہ حال میں زندہ ہو گئے ہیں۔ کروٹ "استاشے" بن گئے ہیں۔ مسلم "ترک" اور سرب "چیٹنکس"۔ جب فرقہ وارانہ نفرت فرقہ وارانہ نفرت کو بڑھاتی ہے تو وسیع پیمانے پر قتل و غارت، تشدد، زنا اور شہریوں کی وحشیانہ بے دخلی جائز قرار پاتی ہے۔ مخالف ثقافت کی مرکزی علامتیں ہدف قرار دے دی جاتی ہیں۔ سربوں نے منظم طریقے سے مسجدوں اور فرانسسکن معبدوں کو اور کروٹوں نے آرتھوڈوکس معبدوں کو جلایا ہے۔ ثقافت کے خزانوں یعنی عجائب گھروں اور لائبریریوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ جیسے سنہالی سکیورٹی فورسز نے جافنا پبلک لائبریری کی "بے بدل کتابوں اور تاریخی دستاویزات" کو تباہ کر دیا کیونکہ ان کا تعلق تامل ثقافت سے تھا اور سرب بندوق بازوں نے سرائیوو کے قومی عجائب گھر پر بمباری کی اور اسے تباہ کر دیا۔ سربوں نے چالیس ہزار آبادی کے بوسنیائی گاؤں زوورنک کا صفایا کر دیا اور **1463**ء میں آرتھوڈوکس چرچ کی جگہ تعمیر کئے گئے عثمانی مینار کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور اس پر صلیب نصب کر دی۔ ثقافتوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں ثقافت ہارتی ہے۔

تہذیب کی پشت پناہی: ہم رشتہ ملک اور تارکین وطن

سرد جنگ کے چالیس برسوں تک جھگڑے کی سمت نیچے کی طرف تھی جیسے سپر پاوروں

نے اتحاد بنانے کی کوشش کی اور دوسری سپر پاور کے اتحادیوں کی وفاداریوں کو تبدیل کرنے یا انہیں غیر جانبدار بنانے کی کوششیں کیں۔ مقابلہ تیسری دنیا میں بہت زیادہ شدید تھا۔ جہاں نئی اور کمزور ریاستوں پر سپر پاوروں نے بڑے عالمی مقابلے میں شریک ہونے کیلئے دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں واحد سپر پاور کے جھگڑے پر کئی فریقی جھگڑے غالب آ گئے ہیں۔ جب ان فرقہ وارانہ جھگڑوں میں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپ آ ملتے ہیں تو ان میں وسعت اور تیزی آ جاتی ہے۔ جیسے جیسے جھگڑا شدت پکڑتا ہے ہر فریق اپنی تہذیب سے تعلق رکھنے والے ملکوں اور گروپوں سے مدد کا طلبگار ہونے لگتا ہے۔ مدد خواہ ایک شکل میں ہو یا دوسری میں' سرکاری ہو یا غیر سرکاری' ظاہری ہو یا خفیہ' مادی' انسانی' سفارتی' مالی' علامتی یا فوجی ہو ہمیشہ ایک یا زیادہ ہم رشتہ ملکوں اور گروپوں کی جانب سے آیا کرتی ہے۔ تقسیمی خط کا جھگڑا جتنا طول پکڑتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ ہم رشتہ ملک مدد کرنے لگتے ہیں۔ اس ''ہم رشتہ ملک وبا'' کے نتیجے میں تقسیمی خط کا جھگڑا تہذیبوں کے داخلی جھگڑوں کی نسبت زیادہ وسعت پکڑنے کے امکان سے معمور ہوتا ہے اور اس کی تحدید اور اختتام کیلئے تہذیبوں کے درمیان تعاون عمومی طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔ سرد جنگ کے برعکس' جھگڑا اوپر سے نیچے نہیں آتا بلکہ نیچے سے اوپر کو جاتا ہے۔

تقسیمی خط کی جنگوں میں ریاستوں کی شمولیت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ ابتدائی درجے میں وہ فریق ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے حقیقت میں لڑتے مرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ ریاستیں ہوں' جیسا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگیں اور اسرائیل اور اس کے ہمسایوں میں جنگیں لیکن یہ مقامی گروپ بھی ہو سکتے ہیں جو ریاستیں یا جنم لیتی ہوئی ریاستیں نہیں ہوتی ہیں جیسا کہ بوسنیا کی مثال ہے اور جیسا کہ نگورنو کاراباخ کے آرمینیائی۔ ان جھگڑوں میں دوسرے درجے کے فریق بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ عمومی طور پر دوسری پارٹیوں سے متعلقہ ریاستیں جیسے کہ سابق یوگوسلاویہ میں سربیا اور کروشیا کی حکومتیں اور کاکیشیا میں آرمینیا اور آذربائیجان۔ زیادہ دور سے تعلق رکھنے والی ریاستیں تیسرے درجے میں آتی ہیں جو اصل جھگڑے سے تو بہت دور ہوتی ہیں تاہم لڑنے والوں کے ساتھ تہذیبی اتحاد ہوتا

ہے جیسا کہ سابق یوگوسلاویہ کے حوالے سے جرمنی' روس اور اسلامی ریاستیں نیز آرمینیائی آذری جھگڑے کے حوالے سے روس' ترکی اور ایران۔ تیسرے درجے کے شرکاء اکثر تہذیب کی مرکزی ریاستیں ہوا کرتی ہیں۔ پہلے درجے میں عمومی طور پر افراد اور ہتھیاروں کی فراہمی ہوتی ہے۔ دوسرے فریقوں کی امداد پہلے درجے کے شرکاء سے مماثل نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ مخلصانہ اور قلبی امداد تارکین وطن کی ان برادریوں سے آتی ہے جو اپنے ہم رشتہ ملک کے مقصد سے زبردست اتفاق کرتے ہیں اور ''پوپ سے زیادہ کیتھولک'' ہوتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ملکوں کے مفادات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ عمومی طور پر وہ پہلے درجے کے شرکاء کو مدد فراہم کرتے ہیں اور یہاں تک کہ اگر وہ مدد نہیں بھی دیتے ہیں تب بھی مخالف ان پر اس کا الزام ضرور لگاتا ہے جس سے اس کے اپنے ہم رشتہ ملکوں سے امداد کو جواز ملتا ہے تاہم دوسرے اور تیسرے درجے کے ملکوں کو جھگڑے کی محدودیت اور اپنے آپ کو براہ راست ملوث نہ کرنے ہی سے مفاد حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے درجے کے شرکاء کو مدد دینے کے ساتھ ساتھ وہ ان شرکاء کو محدود کرنے کی بھی کوششیں کرتے ہیں نیز انہیں اپنے مقاصد میں اعتدال لانے کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔ عمومی طور پر وہ تقسیمی خط کی دوسری طرف کے فریق کے دوسرے اور تیسرے درجے کے حلیفوں سے مذاکرات کرتے ہیں تاکہ ایک مقامی جنگ بڑھ کر مرکزی ریاستوں کی وسیع جنگ میں نہ بدل جائے۔ 1990ء کی دہائی میں ہونے والی سب جنگوں میں تارکین وطن اور ہم رشتہ ملک ملوث ہوئے۔ ایسی جنگوں میں مسلم گروپوں کو پہلے درجے کا وسیع کردار دیتے ہوئے' مسلم حکومتیں اور تنظیمیں دوسرے اور تیسرے درجے کے شرکاء رہی ہیں۔ سب سے زیادہ فعال تھیں سعودی عرب' پاکستان' ایران' ترکی اور لیبیا کی حکومتیں جن کے ساتھ بعض اوقات دوسری مسلم ریاستیں بھی شامل ہو گئیں۔ انہوں نے غیر مسلموں سے لڑنے والے مسلموں کو فلسطین' لبنان' بوسنیا' چیچنیا' کاکیشیا' تاجکستان' کشمیر' سوڈان اور فلپائن میں مدد دی۔ حکومتی امداد کے علاوہ افغانستان کی جنگ میں شریک اسلام پسند بین الاقوامی جنگجوؤں پر مشتمل دوسرے درجے کے مسلم گروپوں نے بھی تعاون کیا جو کہ الجیریا کی خانہ جنگی سے چیچنیا اور فلپائن تک محیط تھا۔

ایک تجزیہ نگار نے نشاندہی کی ہے کہ یہ اسلام پسند بین الاقوامی تنظیمیں ''افغانستان' کشمیر اور بوسنیا میں اسلام پسندوں کی حکومت قائم کرنے کے واسطے رضا کار بھیجتی ہیں' ایک یا دوسرے ملک میں اسلام پسندوں کی مخالف حکومتوں کے خلاف پراپیگنڈا وار لڑتی ہیں اور تارکین وطن میں اسلامی مراکز قائم کرتی ہیں جو ایسی تمام پارٹیوں کے سیاسی ہیڈ کوارٹرز بھی ہوتے ہیں۔'' عرب لیگ اور آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس بھی بین التہذیبی جھگڑوں میں ملوث مسلم گروپوں کو مدد دیتی ہیں اور اپنے ارکان کی کوشش کو مربوط بنانے کی سعی کرتی ہیں۔

سوویت یونین افغانستان کی جنگ میں پہلے درجے کا شریک تھا اور مابعد سرد جنگ کے برسوں میں روس' چیچن جنگ میں پہلے درجے کا شریک تھا۔ تاجکستان کی لڑائی میں دوسرے درجے کا اور سابق یوگوسلاویہ کی جنگ میں تیسرے درجے کا۔ ہندوستان کشمیر میں پہلے درجے کا شریک ہے اور سری لنکا میں دوسرے درجے کا۔ یوگوسلاویہ کی لڑائی میں بڑی مغربی ریاستیں تیسرے درجے کی شریک رہی ہیں۔ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کی لمبی جدوجہد میں تارکین وطن نے دونوں فریقوں کیلئے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جس طرح کہ آرمینیائیوں' کروٹوں اور چیچنوں کیلئے ٹیلی ویژن' فیکس اور ای میل کے ذریعے ''تارکین وطن کے وعدے مستحکم ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کے سابقہ گھروں سے مستقل روابط کی وجہ سے پولرائزڈ ہوتے ہیں۔'' ''سابقہ'' تادیر سابقہ نہیں رہتا۔

کشمیر کی جنگ میں پاکستان باغیوں کی سفارتی اور سیاسی مدد کھلم کھلا کرتا رہا ہے اور پاکستانی فوجی ذرائع کے حوالے سے روپے اور ہتھیاروں کی بڑی مقدار فراہم کی گئی ہے نیز تربیت' لاجسٹک اور جائے پناہ بھی فراہم کی گئی۔ اس نے دوسری مسلم حکومتوں کی بھی اس حوالے سے لابی بنائی۔ 1995ء میں باغیوں کو' بیان کیا جاتا ہے کہ 1200 مجاہدین کی مدد ملی جن کا تعلق افغانستان' تاجکستان اور سوڈان سے تھا اور وہ ان سٹنگر میزائلوں اور دوسرے اسلحے سے لیس تھے جو سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران میں امریکیوں نے فراہم کیا تھا۔ فلپائن میں مورو باغیوں کو ایک وقت میں ملائیشیا سے مدد ملتی رہی ہے' عرب حکومتوں نے اضافی فنڈ مہیا کئے' لیبیا نے کئی ہزار باغیوں کو تربیت دی اور انتہا پسند

باغی گروپ ابو سیاف کو پاکستانی اور افغان بنیاد پرستوں نے منظم کیا تھا۔ افریقہ میں سوڈان ایتھوپیا کے خلاف لڑنے والے مسلم اریٹریائی باغیوں کو مسلسل مدد دیتا رہا ہے۔ اس کے جواب میں ایتھوپیا سوڈان سے لڑنے والے "باغی عیسائیوں" کو "لاجسٹک اور جائے پناہ" فراہم کرتا رہا ہے۔ مؤخر الذکر کو ایسی ہی مدد یوگنڈا سے ملتی ہے جو اس کے "سوڈانی باغیوں کے ساتھ مضبوط مذہبی اور نسلی رشتوں" کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔ دوسری طرف سوڈانی حکومت کو ایران سے 300 ملین امریکی ڈالروں کا چینی اسلحہ اور ایرانی فوجی مشیروں کی طرف سے تربیت حاصل ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ 1992ء میں باغیوں کے خلاف ایک بڑی جارحیت کا آغاز کرنے کا اہل ہوا۔ سوڈانی حکومت کے مطابق عیسائی باغیوں کو بہت سی مغربی عیسائی تنظیمیں غذا' ادویات' رسد اور اسلحہ فراہم کرتی ہیں۔

سری لنکا میں باغی ہندو تاملوں اور بدھ سنہالی حکومت کے درمیان جنگ میں ہندوستانی حکومت نے باغیوں کو بھرپور مدد دی۔ اس نے جنوبی ہندوستان میں انہیں تربیت دی اور انہیں ہتھیار اور پیسہ دیا۔ 1987ء میں جب سری لنکا کی حکومتی افواج تامل ٹائیگروں کو شکست دے رہی تھیں تو ہندوستانی رائے عامہ اس "نسل کشی" کے خلاف ابھرنے لگی اور ہندوستانی حکومت نے ہوائی جہازوں کے ذریعے تاملوں کو غذا فراہم کی نیز (صدر) جے وردھنے کو ایسے اشارے دیئے کہ ہندوستان سری لنکا کو بزور قوت ٹائیگروں کی طاقت کو کچلنے سے روک سکتا ہے۔" پھر ہندوستانی اور سری لنکن حکومتوں میں معاہدہ ہوا کہ سری لنکا تامل علاقوں کو قابل لحاظ خودمختاری دے گا اور اس کے جواب میں باغی ہندوستانی فوج کو اپنے ہتھیار لوٹا دیں گے۔ ہندوستان نے معاہدے کے نفاذ کیلئے 50,000 فوجی جزیرے میں اتار دیئے۔ لیکن تاملوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور اس طرح جو ہندوستانی افواج ان کی مدد کر رہی تھیں اب ان کی تاملوں سے لڑائی شروع ہو گئی۔ ہندوستانی افواج کی واپسی 1998ء میں شروع ہوئی۔ 1991ء میں ہندوستانی وزیراعظم راجیو گاندھی کو قتل کر دیا گیا اور باغیوں کے حوالے سے ہندوستانی حکومت کا رویہ سفاکانہ ہو گیا کیونکہ راجیو گاندھی کے قتل کا الزام ہندوستانی حکومت نے تاملوں کی ایک حمایتی پر لگایا تھا تاہم حکومت نے جنوبی ہندوستان کے

50 ملین تاملوں کی حمایت اور ہمدردی ترک نہیں کی۔

1979ء کے شروع ہونے سے پہلے سوویت اور پھر روسی اپنے جنوبی مسلم ہمسایوں کے ساتھ تین بڑی تقسیمی خط کی جنگوں میں ملوث ہوئے۔ افغان جنگ 89-1979ء اس کا تسلسل تاجکستان کی جنگ 1992ء میں شروع ہوئی اور چیچنیا جنگ 1994ء میں شروع ہوئی۔ سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ ہی تاجکستان میں ایک کمیونسٹ حکومت برسراقتدار آئی۔ اس حکومت کو علاقائی اور نسلی گروپوں پر مشتمل حزب اختلاف نے 1992ء کے موسم بہار میں چیلنج کر دیا۔ اس حزب اختلاف میں سیکولر بھی تھے اور اسلام پسند بھی۔ اس حزب اختلاف کو افغانستان سے ہتھیار مل گئے۔ انہوں نے روس کی حامی حکومت کو ستمبر 1992ء میں دارالحکومت دوشنبے سے بے دخل کر دیا۔ روسی اور ازبکستانی حکومتوں نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا اور اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ سے خبردار کیا۔ روس کے 201 ویں موٹرائزڈ ڈویژن نے جو کہ تاجکستان ہی میں تھا حکومت کی حامی فوجوں کو اسلحہ فراہم کیا۔ ادھر روس نے افغانستان کے ساتھ واقع سرحد کے تحفظ کیلئے مزید فوجی دستے بھیج دیئے۔ نومبر 1992ء میں روس، ازبکستان، قزاقستان اور کرغزستان امن قائم کرنے کے نام پر روسی اور ازبک فوجی مداخلت پر متفق ہو گئے جو کہ درحقیقت جنگ میں شرکت تھی۔ اس امداد اور روسی ہتھیاروں اور پیسے کے بل پر سابق حکومتی افواج دوشنبے پر دوبارہ قبضہ کرنے اور ملک کے بیشتر علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کے بعد نسلی صفائی کا ایک عمل شروع ہو گیا اور حزب اختلاف کے پناہ گزین اور فوجی دستے افغانستان کی طرف پسپا ہو گئے۔

مشرق وسطیٰ کی مسلم حکومتوں نے روسی فوجی مداخلت پر احتجاج کیا۔ پاکستان، ایران اور افغانستان نے بڑھتی ہوئی اسلام پسند حزب اختلاف کو پیسے، ہتھیار اور تربیت مہیا کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ 1993ء میں کئی ہزار جنگجوؤں کو افغان ''مجاہدین'' نے تربیت دی اور 1993ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں تاجیک باغیوں نے افغانستانی سرحدوں کے پار متعدد حملے شروع کئے اور روسی سرحدی گارڈوں کی بڑی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ روس نے جواب میں تاجکستان میں مزید فوجی دستے بھیج دیئے اور ''بڑی مقدار میں آرٹلری اور مارٹر''

بھیجے اور افغانستان میں اہداف پر ہوائی حملے کیے۔ تاہم عرب حکومتوں نے باغیوں کو ہوائی حملے روکنے کیلئے سٹنگر میزائلوں کی فروخت کیلئے فنڈ فراہم کیے۔ 1995ء میں روس تاجکستان میں 25000 فوجی بھیج چکا تھا نیز اس نے حکومت کو مطلوب فنڈز کا نصف بھی فراہم کیا۔ دوسری طرف باغیوں کو افغانستان حکومت اور دوسری مسلم ریاستوں کی فعال مدد اور حمایت حاصل رہی۔ برنیت روبن کا موقف ہے کہ تاجکستان اور افغانستان کو بین الاقوامی ایجنسیوں یعنی مغرب کی طرف سے اہم امداد فراہم کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ہے کہ اول الذکر مکمل طور پر روس کا دست نگر بن گیا اور مؤخر الذکر اپنے مسلم تہذیبی رشتہ داروں کا دست نگر بن گیا۔ ''کوئی بھی افغان کمانڈر جو آج بیرونی امداد کی امید کرتا ہے اسے یا تو اس عرب اور پاکستانی خواہش کو ماننا پڑتا ہے کہ ''جہاد'' کو وسطی ایشیا تک پھیلایا جائے یا منشیات کی تجارت میں حصہ لینا پڑتا ہے۔''

روس کی مسلمانوں کے خلاف تیسری جنگ جنوبی کاکیشیا میں چیچنوں کے خلاف تھی۔ 1992-93ء میں ہمسایہ آرتھوڈوکس اور روسیشنوں اور مسلم انگش کے درمیان جنگ کا باعث بنی۔ مؤخر الذکر کو چیچنوں اور دوسرے مسلم لوگوں کے ساتھ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں وسطی ایشیا سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ روسیشن موجود رہے اور انہوں نے انگش جائیدادوں پر قبضہ کر لیا۔ 1956-57ء میں جلاوطن لوگوں کو واپسی کی اجازت دے دی گئی اور جائیداد کی ملکیت اور علاقے کے کنٹرول کے حوالے سے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔

1992ء میں انگش نے اپنی جمہوریہ سے حملوں کا آغاز کر دیا تاکہ پریگورودنی علاقہ دوبارہ حاصل کر لیں جو کہ سوویت حکومت نے روسیشنوں کو دے دیا تھا۔ روسیوں نے جواب میں آرتھوڈوکس روسیشنوں کی مدد کیلئے کوزاک یونٹوں کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر مداخلت کر دی جیسا کہ ایک بیرونی مبصر کا کہنا ہے کہ ''نومبر 1992ء میں روسی ٹینکوں نے روسیشنا میں واقع انگش بستیوں کا محاصرہ کر کے گولہ باری کی۔ جو لوگ گولہ باری سے بچ گئے انہیں یا تو ہلاک کر دیا گیا یا قیدی بنا کر لے جایا گیا۔ روسیشن اومون (OMON) ''خصوصی پولیس'' سکواڈ نے وسیع پیمانے پر قتل و غارت برپا کر دیا۔ لیکن روسی دستے انہیں کور فراہم کرنے

کیلئے علاقے میں ''امن قائم کرنے کے واسطے'' بھیج دیئے گئے۔ دی اکنامسٹ رپورٹ دیتا ہے کہ ''ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں ہونے والی تباہی کا شمار ناممکن ہے۔'' یہ ''روسی فیڈریشن میں پہلی نسلی صفائی'' تھی۔ پھر روسیوں نے چیچن اتحادیوں کو دھمکانے کیلئے اس جھگڑے کو استعمال کیا تو جواب میں ''چیچنیا اور (اکثریتی مسلم) کا کیشیائی لوگوں کی کنفیڈریشن (KNK) متحرک ہوگئی۔'' کے این کے (KNK) نے دھمکی دی کہ اگر روس نے چیچنیا سے واپسی اختیار نہ کی تو وہ 50,000 رضا کار بھیج دے گی۔ آخر کار ایک سخت موقف کے بعد ماسکو شمالی روسیشن انگش جھگڑے کو علاقائی جنگ میں بدلنے سے گریز کرنے پر آمادہ ہوگیا۔''

جب دسمبر 1994ء میں روس نے چیچنیا پر بھرپور فوجی حملہ شروع کیا تو ایک زیادہ شدید اور وسیع جنگ چھڑ گئی۔ دو آرتھوڈوکس جمہوریاؤں جارجیا اور آرمینیا کے لیڈروں نے روسی اقدام کی حمایت کی جبکہ یوکرائنی صدر نے ''سفارتی ملائمت کے ساتھ بحران کے پر امن حل کی بات کی۔'' روسی اقدام کو آرتھوڈوکس شمالی روسیشن حکومت نے بھی تائید فراہم کی اور 55 سے 60 فیصد شمالی روسیشن عوام نے بھی۔ روسی فیڈریشن کے اندر اور باہر مسلموں نے چیچنیا کی بھرپور حمایت کی۔ اسلام پسند بین الاقوامی تنظیمیں تیزی سے حرکت میں آئیں اور انہوں نے آذربائیجان' افغانستان' پاکستان' سوڈان اور ہر جگہ سے جنگجو بھیج دیئے۔ مسلم ریاستوں نے چیچن کاز کی حمایت کی۔ ترکی اور ایران نے مبینہ طور پر مادی امداد فراہم کی جس سے روس کو ایران کے ساتھ جھگڑا بڑھانے کا موقع ملا۔ آذربائیجان سے روسی فیڈریشن کے اندر اسلحہ تیزی سے آنے لگا۔ جو چیچنوں کیلئے فراہم کیا جا رہا تھا جس کی وجہ سے روس نے اس ملک کے ساتھ سرحد کو بند کر دیا۔ پھر چیچنوں کو میڈیکل اور دیگر سپلائی بھی بند ہوگئی۔

روسی فیڈریشن کے مسلم چیچنوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ جہاں روس کے کاکیشش گیر مسلم مقدس جنگ کی صداؤں نے ایسے نتائج پیدا نہیں کئے تھے۔ وہاں چھ وولگا یورال جمہوریاؤں کے لیڈوں نے روس سے اس فوجی اقدام کو روکنے کا مطالبہ کیا نیز مسلم کاکیشش کے نمائندوں نے روسی حکمرانی کے خلاف سول نافرمانی کی مہم کا اعلان کر دیا۔ چواش جمہوریہ کے صدر نے مسلموں کے خلاف اقدام میں شرکت سے خود کو باہر رکھا۔'' جنگ کے

خلاف سب سے مضبوط احتجاج'' چیچنیا کی دو پڑوسی جمہوریاؤں انگشتیا اور داغستان میں سامنے آئے۔ انگشتوں نے چیچنیا کو جانے والے روسی دستوں پر حملے کئے جس پر روسی وزیر دفاع کو کہنا پڑا کہ ''انگش لوگوں نے روس کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔'' جنوری 1996ء میں جب چیچوں نے کلزیئر شہر پر حملہ کیا تو روسیوں نے پرودمیسکو فے کی بستی کو نیست و نابود کر دیا تو داغستان میں روسیوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔

چیچن کاز کو چیچن تارکین وطن نے بھی حمایت دی جو کہ انیسویں صدی میں کاکیشش پہاڑی لوگوں کے خلاف روسی جارحیت سے رونما ہوئے تھے۔ تارکین وطن نے فنڈ اکٹھے کئے' ہتھیار مہیا کئے اور چیچن فوجوں کیلئے رضا کار بھیجے۔ یہ بہت بڑی تعداد میں خاص طور پر ترکی اور اردن میں ہیں۔ اس سے اردن کو روسیوں کے خلاف مضبوط مؤقف اپنانے کی راہ ملی اور ترکی چیچوں کو مدد دینے کیلئے رضا مند ہوا۔ جنوری 1996ء میں جب جنگ ترکی تک پھیلی تو ترک عوام میں ایک کشتی کے قیدیوں کے ساتھ ہمدردی بڑھ گئی۔ چیچن لیڈروں کی مدد سے ترک حکومت نے روسیوں کے ساتھ اس طرح سے اس بحران پر مذاکرات کئے کہ ترکی اور روس کے درمیان پہلے سے موجود کشیدہ تعلقات بدتر ہو گئے۔

اس جنگ میں روسیوں کے جارحانہ رویے کی وجہ سے سارے علاقے کے مسلم روس کے مخالف ہو گئے مزید کشیدگی پھیلتی چلی گئی۔

آرتھوڈوکس اور مسلمانوں میں ایک اور تقسیمی خط کی جنگ کے پہلے درجے کے شرکاء تھے نگورنو کاراباخ کے علاقے کے آرمیںیائی اور آذربائیجان کی حکومت اور عوام اول الذکر آزادی کیلئے لڑ رہے تھے۔ آرمینیا کی حکومت دوسرے درجے کی شریک تھی اور روس' ترکی اور ایران تیسرے درجے کے شریک تھے۔ مزید برآں مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں موجود آرمیںیائی تارکین وطن نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی 1988ء میں سوویت یونین کے ختم ہونے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس میں 1993-1992ء کے دوران میں شدت آئی اور 1994ء میں سیز فائر کیلئے مذاکرات کے بعد ٹھنڈی پڑ گئی۔ ترکوں اور دوسرے مسلموں نے آذربائیجان کی پشت پناہی کی جبکہ روس نے آرمینیوں کی مدد کی تاہم

بعد میں آذربائیجان میں ترک اثر ورسوخ کے خلاف اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ یہ جنگ بحیرہ اسود اور کاکیشیا کے علاقوں پر قبضے کیلئے صدیوں پہلے سے روسی سلطنت اور عثمانی سلطنت کے درمیان جاری جنگ اور بیسویں صدی کے آغاز میں ترکوں کے ہاتھوں آرمینیائیوں کے قتل عام کے حوالے سے موجود مخاصمت کی تازہ ترین قسط تھی۔

اس جنگ میں ترکی آذربائیجان کا مستقل حمایتی اور آرمینیائیوں کا دشمن رہا۔ کسی غیر بلقانی سوویت جمہوریہ کی آزادی کو سب سے پہلے تسلیم کرنا آذربائیجان کا ترکی کو تسلیم کرنا تھا۔ جھگڑے کے دوران شروع سے آخر تک ترکی نے آذربائیجان کو مالی اور مادی امداد مہیا کی نیز آذربائیجانی سپاہیوں کو تربیت دی۔ جونہی 1992-1991ء میں تشدد میں شدت آئی اور آرمینیائیوں نے آذربائیجانی علاقے میں پیش قدمی کی ترکی کے عوام کی رائے اس کی مخالفت میں ابھری اور ترک حکومت پر اپنے نسلی اور مذہبی رشتہ دار کی مدد کیلئے دباؤ بڑھا۔ یہ خطرہ بھی پیدا ہوا کہ اس سے مسلم عیسائی تقسیم پیدا ہوگی۔ مغرب کی آرمینیا کیلئے مدد میں اضافہ ہوگا نیز یہ اس کے ناٹو (NATO) اتحادیوں کو مشتعل کرے گی۔ تاہم ترک حکومت نے آذربائیجان کی مدد اور حمایت اور آرمینیا سے تصادم کو اپنے مفاد میں جانا۔ ایک ترک افسر نے کہا "یہ ناممکن ہوتا ہے کہ آپ کا رشتہ دار قتل ہو اور آپ اس سے متاثر نہ ہوں۔" اس پر ایک اور نے اضافہ کیا "ہم پر دباؤ ہے۔ ہمارے اخبارات المناک تصویروں سے بھرے پڑے ہیں ...... ہوسکتا ہے ہمیں آرمینیا پر واضح کرنا پڑے کہ علاقے میں ایک بڑا ترکی بھی ہے۔" صدر ترگت اوزال کا کہنا تھا ترکی کو "آرمینیائیوں کو ذرا سی زک پہنچانی پڑے گی۔" ترکی نے ایران کے ساتھ آرمینیائیوں کو انتباہ کیا کہ سرحدوں میں کسی تبدیلی کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اوزال نے ترکی سے آرمینیائیوں کو فراہم ہونے والی خوراک اور دوسری رسد پر بھی پابندی لگادی جس کے نتیجے میں 1993-1992ء کے موسم سرما میں آرمینیائیوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی کے نتیجے میں روسی مارشل یوگینی شیپوشنیکوف نے انتباہ کیا کہ "اگر کوئی اور فریق (بالفاظ دیگر ترکی) "جنگ میں ملوث ہوا تو "ہم تیسری عالمی جنگ کے سرے پر ہوں گے۔"

1993ء کے موسم گرما اور خزاں میں آرمینیائی پیش قدمی جاری رہی اور ایرانی سرحدوں تک پہنچ گئی جس سے ترکی اور ایران دونوں میں زیادہ ردعمل پیدا ہوا۔ جو آذربائیجان اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے اندر اثر و رسوخ کیلئے باہمی مسابقت کا بھی شکار تھے۔ ترکی نے اعلان کیا کہ حملہ ترکی کی سلامتی کیلئے خطرہ ہے' اس نے مطالبہ کیا کہ آرمینیائی فوجیں ''جلد از جلد اور غیر مشروط طور پر'' آذربائیجانی علاقے سے نکل جائیں اور آرمینیا کے ساتھ اپنی سرحدوں پر مزید فوجی بھیج دیئے۔ روسی اور ترک دستوں کے درمیان سرحد پر مبینہ طور پر گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ ترکی کی وزیراعظم تانسو چلر نے اعلان کیا کہ اگر آرمینیائی دستے آذربائیجان کے ترکی کے قریبی علاقے میں گئے تو وہ اعلان جنگ کر دیں گی۔ ایران نے اپنی سرحدوں کے قریب اور آذربائیجان کے اندر اپنی فوجیں پہنچا دیں تاکہ آرمینیائی حملے کے نتیجے میں پناہ کے متلاشیوں کیلئے کیمپ بنائے۔ ایرانی اقدام سے ترکی کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ روس کو خفا کئے بغیر مزید اقدامات کر سکتے ہیں اور ایران کا مقابلہ کرتے ہوئے آذربائیجان کیلئے زیادہ حفاظت کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ آخرکار ماسکو میں ہونے والے ترکی' آرمینیا اور آذربائیجان کے مذاکرات کے بعد صورتحال درست ہوئی۔ جس میں آرمینیا امریکی دباؤ پر شامل ہوا تھا۔ تھوڑی آبادی والا' چاروں طرف خشکی سے گھرا ہوا ملک جو بے پناہ قدرتی ذخائر سے مالا مال ہے۔ دشمن ترکوں کے خلاف تحفظ کیلئے تاریخی حوالے سے اپنے ہمسایہ آرتھوڈوکس رشتہ داروں جارجیا اور روس کی طرف دیکھتا ہے۔ روس کو تو خصوصی طور پر بڑے بھائی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ تاہم جونہی سوویت یونین کا انہدام ہوا تو نگورنوکاراباخ کے آرمینیائیوں نے آزادی کی مہم شروع کر دی اور گورباچوف حکومت نے ان کے مطالبوں کو مسترد کرتے ہوئے باکو کی کمیونسٹ وفادار حکومت کی مدد کرنے کیلئے علاقے میں فوجی دستے بھیج دیئے۔ سوویت یونین کے ختم ہو جانے کے بعد ان مسائل نے زیادہ طویل مدتی تاریخی اور ثقافتی مسئلوں کو راہ دے دی جس میں آذربائیجان کا یہ اعتراض شامل تھا کہ ''روسی حکومت نے 180 درجے کا موڑ لے لیا ہے'' اور عیسائی آرمینیائیوں کو مدد دے رہی ہے۔ درحقیقت آرمینیائیوں کیلئے روسی فوجی امداد سوویت یونین ہی میں شروع ہو گئی تھی جس کے تحت آرمینیائیوں کو اعلیٰ عہدوں پر

ترقی دی گئی اور مسلموں کی نسبت زیادہ لڑاکا یونٹوں کی کمان سونپی گئی۔ جنگ شروع ہو جانے کے بعد نگورنو کاراباخ میں متعین روسی فوج کی 366 ویں موٹرائزڈ رائفل رجمنٹ نے خود جالی گاؤں پر حملے میں پیشرو کا کردار ادا کیا اور مبینہ طور پر 1000 آذریوں کے قتل عام میں حصہ لیا۔ بعد میں روس کے سپیشناز دستوں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ جب 1992-1993ء کے موسم سرما کے دوران میں آرمینیا پر ترکی نے معاشی پابندیاں لگا دی تھیں تب ''روس نے اربوں روبل کے قرضے فراہم کر کے اسے معاشی انہدام سے بچا لیا تھا۔'' اس موسم بہار میں روسی دستوں نے ریگولر آرمینیائی فوجوں کے شانے سے شانہ ملایا تاکہ نگورنو کاراباخ سے آرمینیا کو ملانے کیلئے راستے کھولے۔ 1993ء کے موسم گرما میں کاراباخ یلغار میں مبینہ طور پر چالیس ٹینکوں پر مشتمل روسی آرمرڈ فوج نے حصہ لیا تھا۔ ہل (HILL) اور جیویٹ کے تجزیے کے مطابق ''آرمینیا کے پاس روس سے قریبی اتحاد کے سوا کوئی اور راستہ بمشکل ہی موجود ہے۔ اس کا انحصار خام مال، توانائی اور خوراک کیلئے روس پر ہے۔ نیز تاریخی دشمنوں آذربائیجان اور ترکی سے تحفظ کیلئے بھی وہ روس کا محتاج ہے۔ آرمینیا نے تمام سی آئی ایس (CIS) معاشی اور فوجی معاہدوں پر دستخط کئے ہیں۔ اپنے علاقے میں روسی دستوں کے قیام کی اجازت دی ہے اور سابق سوویت اثاثوں پر سے روس کے حق میں ہاتھ کھینچ لیا ہے۔''

آرمینیائیوں کیلئے روسی امداد نے آذربائیجان میں روسی اثر ورسوخ کو بڑھاوا دیا ہے۔ جون 1993ء میں آذربائیجانی قوم پرست لیڈر ابوالفیض ایلچی بے کو ایک بغاوت کے بعد ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ سابق کمیونسٹ اور روس کے حامی سمجھے جانے والے گیدار علی یوف نے لے لی۔ علی یوف نے آرمینیا کی تحدید کیلئے روس کے ساتھ مصالحت کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ اس نے کامن ویلتھ آف انڈی پینڈنٹ سٹیٹس (CIS) کے رکن بننے سے آذربائیجان کے انکار کو واپس لیا اور اپنے علاقے میں روسی دستوں کو ٹھہرنے کی اجازت دی۔ اس نے روس کو آذربائیجانی تیل کی ترقی کیلئے بننے والے بین الاقوامی کنسورشیم کا بھی حصہ بننے کی اجازت دی۔ اس کے بدلے میں روس آذربائیجانی فوجیوں کو تربیت دینے لگا اور اس نے آرمینیا پر دباؤ ڈالا کہ وہ کاراباخ کی فوجوں کو مدد دینا بند کر دے اور انہیں آذربائیجانی

علاقے سے واپس نکالے۔ اپنے وزن کو ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر کے روس آذربائیجان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے اور ایران اور ترکی کو بے اثر کرنے میں کامیاب ہوا۔ لہٰذا آرمینیا کیلئے روسی امداد نے نہ صرف کاکیشش میں اس کے قریب ترین اتحاد کے ساتھ تعلقات کو مضبوط تر بنایا بلکہ علاقے میں اس کے بڑے مسلم رقیب کو بھی کمزور بنایا۔

روس کے علاوہ آرمینیا کی امداد وحمایت کا ایک اہم ذریعہ وہ دولت مند اور بارسوخ تارکین وطن ہیں جو مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں موجود ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں دس لاکھ آرمینیائی موجود ہیں اور فرانس میں چار لاکھ پچاس ہزار۔ انہوں نے ترکی کی عائد کردہ پابندیوں کے دنوں میں آرمینیا کو پیسہ اور امداد فراہم کی۔ آرمینیائی حکومت کیلئے افسران اور آرمینیائی مسلح افواج کیلئے رضا کار بھیجے۔ امریکہ میں موجود تارکین وطن کی بھیجی گئی امداد 50 ملین ڈالر مالیت کی تھی اور 1990ء کی دہائی کے وسط میں 75 ملین ڈالر ہوگئی۔ تارکین وطن اپنی میزبان حکومتوں پر اپنا سیاسی اثر ورسوخ بھی وطن کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ آرمینیائیوں کی بڑی برادریاں امریکہ کی کلیدی ریاستوں کیلیفورنیا' میساچوسٹس اور نیو جرسی میں ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کانگریس نے آذربائیجان پر غیر ملکی امداد حاصل کرنے پر پابندی عائد کر دی اور آرمینیا امریکی امداد حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن گیا۔ اس پشت پناہی نے آرمینیا کی بقا میں جوہری کردار ادا کیا اور اسے ''کاکیشش کا اسرائیل'' بنا دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شمالی کاکیشش پر روسی حملوں نے ایسے تارکین وطن کو پیدا کیا تھا جنہوں نے روسیوں سے لڑنے کیلئے چیچنوں کی مدد کی تھی۔ اسی طرح بیسویں صدی کے شروع میں ترکوں نے آرمینیائیوں کا قتل عام کیا تو ایسے تارکین وطن وجود پذیر ہوئے جنہوں نے ترکی اور آذربائیجان سے لڑنے کیلئے آرمینیا کو مدد فراہم کی۔

دوسرے اور تیسرے درجے کی پارٹیوں کی امداد تقسیمی خط کی جنگ کے شروع ہونے اور اس کے ختم ہونے میں جوہری کردار ادا کرتی ہے۔ سربوں' کروٹوں اور مسلموں سبھی نے اپنے تہذیبی رشتہ داروں سے امداد حاصل کی جو کہ سابق یوگوسلاویہ سے باہر تھے اور پیسہ' ہتھیار' رسد' رضا کار' فوجی تربیت اور سیاسی وسفارتی امداد حاصل کی۔ غیر حکومتی پہلے درجے

کے سرب اور کروٹ انتہا درجے کی قوم پرستی میں مبتلا تھے اور اپنے اہداف کو عسکریت سے حاصل کرنے کے جنون کا شکار تھے۔ دوسرے درجے کی کروٹ اور سرب حکومتیں پہلے پہل تو زور شور سے مدد کرتی رہیں تاہم بعد میں اپنے مفادات کے تحت انہوں نے مصالحتی کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی رجحان کے تحت تیسرے درجے کے روس' جرمن اور آرمینیائی حکومتوں نے دوسرے درجے کی حکومتوں کی پشت پناہی کی۔

تقسیمی خط کی جنگوں کو روکنے کی تدابیر

''ہر جنگ ضرور ختم ہوتی ہے۔'' یہ تو ہے روایتی حکمت و دانش۔ کیا یہ تقسیمی خط کی جنگوں کے حوالے سے بھی درست ہے؟ ہاں اور نہیں۔ تقسیمی خط کا تشدد کچھ مدت کیلئے تو پوری طرح روکا جا سکتا ہے تاہم یہ مستقل طور پر شاذ ہی رکتا ہے۔ تقسیمی خط کی جنگوں کے دوران میں عارضی صلح' جنگ بندیوں اور التوائے جنگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن مرکزی سیاسی مسئلوں کے حل کیلئے امن کا کوئی جامع معاہدہ عمل میں نہیں آتا چونکہ ان کی جڑیں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے ان تقسیمی خط کے جھگڑوں میں ہوتی ہیں جو مستقل نوعیت کے مخاصمانہ تعلقات سے جنم لیتے ہیں اس لئے یہ رکنے اور جاری ہونے کی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ جھگڑے جغرافیائی قربت' مختلف مذاہب اور ثقافتوں' جدا معاشرتی ڈھانچے اور دونوں معاشروں کی تاریخی یادوں سے پھوٹتے ہیں۔ صدیوں تک یہ پروان چڑھتے رہتے ہیں اور پھر دبا ہوا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر کوئی گروپ دوسرے کو نیست و نابود کر دے تو یہ جلد ہی مگر سفاکانہ انداز میں ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر ایسا نہیں ہوتا تو جھگڑا جاری رہتا ہے۔ تقسیمی خط کی جنگیں وقفوں وقفوں سے جاری رہتی ہیں۔ تقسیمی خط کے جھگڑے لامتناہی ہوا کرتے ہیں۔

ایک عارضی تعطل کیلئے بھی دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو پہلے درجے کے فریقوں کی تھکن یعنی جب ہلاکتیں ہزاروں کی تعداد تک پہنچ جائیں' پناہ گزین ہزاروں کی تعداد میں ہوں اور شہر ...... بیروت' گروزنی' ویکور...... تباہ و برباد ہو جائیں۔ لوگ چیخنے لگیں ''پاگل

پن' پاگل پن' بس بہت ہو چکا۔" دونوں فریقین کے ریڈیکل عوامی اشتعال کو بیدار کرنے کی استعداد کھو بیٹھیں' برسوں سے بے نتیجہ رہنے والے مذاکرات کو زندگی مل جائے اور اعتدال پسند دوبارہ ابھر آئیں اور قتل و غارت کو روکنے کا کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ نگورنو کارا باخ پر چھ سال جاری رہنے والی جنگ آخر آرمینیا ئیوں اور آذربائیجانیوں کے "تھکنے" سے بند ہوئی۔ 1995ء کے موسم خزاں میں اسی طرح بوسنیا سے خبر آئی کہ "سب فریق تھک گئے ہیں" اور ڈیٹن معاہدہ عمل میں آ گیا۔ تاہم ایسے جنگ بندی کے معاہدوں کی اپنی ہی حدیں ہوتی ہیں۔ ان سے دونوں فریقوں کو آرام کرنے اور اپنے ذرائع کو دوبارہ اکٹھا کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور جب کوئی فریق فائدے کا موقع دیکھتا ہے تو جنگ دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔

عارضی وقفے کیلئے دوسرا عنصر ہوتا ہے: ایسی پارٹیوں کا اپنے مفاد کی خاطر ملوث ہونا جو پہلے درجے کی نہیں ہوتیں اور لڑنے والوں کو میز پر اکٹھا بٹھاتی ہیں۔ تقسیمی خط کی جنگیں صرف پہلے درجے کی پارٹیوں کے براہ راست مذاکرات سے کبھی ختم نہیں ہوتیں اور نہ ہی ایسی پارٹیوں کی ثالثی سے جن کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو۔ ثقافتی فرق' شدید نفرت اور دوطرفہ تشدد پہلے درجے کی پارٹیوں کو اس قابل ہی نہیں چھوڑتا کہ وہ مل بیٹھیں اور کسی قسم کا کوئی سیز فائر معاہدہ کریں۔

ایسے جھگڑے جو ایک ہی ثقافت سے تعلق رکھنے والے فریقوں میں جاری ہوں کسی تیسری پارٹی کے ذریعے جس کا کوئی اپنا مفاد نہ ہو' اس وقت ختم ہوتے ہیں' جب وہ بھی اسی ثقافت سے تعلق رکھتی ہو اور ایسا حل ڈھونڈنے میں مدد دے جس کی جڑیں اس ثقافت کی اقدار میں ہوں۔ پوپ ارجنٹائن اور چلی کے سرحدی جھگڑے میں کامیاب ثالثی کر سکتے تھے۔ تاہم مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے درمیان جھگڑوں میں کوئی ایسی پارٹیاں نہیں ہوتیں جو اپنے مفادات نہ رکھتی ہوں۔ کسی ایسے فرد' ادارے یا ریاست کی تلاش دشوار ہوتی ہے جو دونوں فریقوں کیلئے اعتماد کے قابل ہو۔ لڑنے والی کسی بھی تہذیب کا ثالث یا کسی تیسری تہذیب اور ثقافت کا ثالث کسی بھی فریق کیلئے قابل اعتماد نہیں ہوا کرتا۔ پوپ کو چیچنیا اور روسی یا تامل اور سنہالی نہیں بلائیں گے۔ بین الاقوامی تنظیمیں بھی اکثر ناکام

ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ فریقین کو نہ تو فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ انہیں کوئی نقصان دے سکتی ہیں۔

تقسیمی خط کی جنگیں ایسے افراد' گروپوں یا تنظیموں کے ذریعے نہیں رک سکتیں جن کے اپنے مفادات نہ ہوں بلکہ دوسرے اور تیسرے درجے کے مفاد رکھنے والے فریق جو اپنے ہم رشتہ کی پشت پناہی کر رہے ہوتے ہیں اور یہ استعداد رکھتے ہیں کہ فریق مخالف سے مذاکرات کر سکیں اور اپنے ہم رشتہ ملک کو معاہدے قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ پشت پناہی جنگ کو شدت اور طوالت دیا کرتی ہے تاہم یہ جنگ کو روکنے یا محدود رکھنے کیلئے بھی ضروری ہوتی ہے اگرچہ قابل اطمینان نہیں ہوتی۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے پشت پناہ عموماً پہلے درجے کے لڑنے والے نہیں بننا چاہتے لہٰذا جنگ کو بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ وہ پہلے درجے کے فریقوں کی نسبت زیادہ مختلف مفادات رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ جنگ کے اختتام کو اپنے مفاد میں بھی دیکھتے ہیں چونکہ وہ اپنے ہم رشتہ کے پشت پناہ ہوتے ہیں لہٰذا اس پر دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔ یوں پشت پناہ جنگ کو محدود کرنے اور روکنے والے بن جاتے ہیں۔

ایسی جنگیں جن میں دوسرے اور تیسرے درجے کے فریق نہیں ہوتے ہیں زیادہ پھیلتی تو نہیں ہیں لیکن ان کو ختم کروانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایشیائی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کی جنگیں جن کی مرکزی ریاستیں نہیں ہوتیں۔ تقسیمی خط کی ایسی جنگیں جس میں کسی مستحکم ریاست کے اندر بغاوت بھی شامل ہو اور جن کا کوئی اہم پشت پناہ بھی نہ ہو' خصوصاً بہت دشواریاں کھڑی کر دیتی ہیں۔ اگر جنگ کافی طویل مدت تک جاری رہے تو باغیوں کا مطالبہ خودمختاری سے بڑھ کر آزادی تک پہنچ جاتا ہے جس کو حکومت مسترد کر دیتی ہے۔ حکومت عمومی طور پر مطالبہ کرتی ہے کہ باغی ہتھیار ڈال دیں جو لڑائی کے اختتام کا پہلا قدم ہو گا' اس کو باغی مسترد کر دیتے ہیں۔ بالکل قدرتی طور پر حکومت بیرونی مداخلت کاروں کی مزاحمت کرتی ہے اور اسے خالصتاً داخلی معاملہ قرار دیتی ہے جس میں ''مجرم عناصر'' ملوث ہوتے ہیں۔ داخلی معاملہ قرار دینے کی وجہ سے دوسری ریاستوں کو مداخلت نہ کرنے کا بہانہ بھی مل جاتا ہے۔ جیسا کہ مغربی طاقتوں اور چیچنیا کے معاملے میں ہوا۔

یہ مسائل اس وقت پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب مرکزی ریاستوں سے عاری تہذیبیں

ملوث ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان میں ہونے والی جنگ جو 1956ء میں شروع ہوئی' 1972ء میں ختم کروائی گئی تھی جب فریقین تھک گئے تھے اور ورلڈ کونسل آف چرچز اور آل افریقن کونسل آف چرچز نے حقیقتاً غیر حکومتی تنظیموں کی ایک منفرد کامیابی حاصل کی تھی۔ ادیس ابابا معاہدہ کیلئے کامیاب مذاکرات کئے اور جنوبی سوڈان کو خودمختاری دلوا دی تھی تاہم دس برس کے بعد حکومت نے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ جنگ دوبارہ چھڑ گئی' باغیوں کے مطالبے بڑھ گئے' حکومت کیلئے صورتحال مشکل ہو گئی اور دوسرے انقطاع جنگ کے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ نہ تو عرب دنیا اور نہ ہی افریقہ کی مرکزی ریاستیں ہیں اور انہی کا مفاد ہے اور فریقین پر زور بھی انہی کا چلتا ہے نہ تو جمی کارٹر اور بہت سے افریقی لیڈروں کی ثالثی کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور نہ ہی کینیا' اریٹریا' یوگنڈا اور ایتھوپیا پر مشتمل کمیٹی آف ایسٹ افریقن سٹیٹس کی مصالحتی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ امریکہ جس کے سوڈان کے ساتھ انتہائی مخاصمانہ تعلقات ہیں براہ راست اقدام نہیں کر سکتا تھا نہ وہ فائدہ مند کردار ادا کرنے کیلئے ایران سے کہہ سکتا تھا' نہ عراق اور لیبیا سے' جن کے سوڈان سے قریبی تعلقات تھے۔ لہٰذا وہ سعودی عرب کو شامل کرنے تک محدود رہا لیکن سوڈان پر سعودی عرب کا اثر و رسوخ بھی محدود تھا۔

عمومی طور پر سیز فائر مذاکرات اسی وقت آگے بڑھتے ہیں جب دونوں فریقوں کی طرف سے دوسرے اور تیسرے درجے کے شرکاء کی متوازی اور مساوی شرکت ہو۔ تاہم کچھ حالات میں ایک ہی مرکزی ریاست جنگ کو ختم کروا سکتی ہے۔ 1992ء میں کانفرنس آن سکیورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ (CSCE) نے آذربائیجان اور آرمیبیا کی جنگ میں ثالثی کی کوششیں کیں۔ منسک گروپ کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں جھگڑے کے پہلے' دوسرے اور تیسرے درجے کے فریق شامل تھے (نگورنو کاراباخ کے آرمینیائی' آرمیبیا' آذربائیجان' روس' ترکی) نیز فرانس' جرمنی' اٹلی' سویڈن' دی چیک ری پبلک' بیلا روس اور امریکہ۔ امریکہ اور فرانس کے علاوہ جہاں بڑی تعداد میں آرمینیائی تارکین وطن آباد ہیں باقی کی مؤخر الذکر ملکوں کو جنگ ختم کروانے سے کم دلچسپی تھی یا وہ اس کی استعداد ہی کم رکھتے تھے۔ جب امریکہ سمیت دو تیسرے درجے کے فریق روس اور ترکی ایک منصوبے پر

رضامند ہوئے تو اس کونگورنو کاراباخ کے آرمینیائیوں نے مسترد کر دیا۔ تاہم روس نے آزادانہ طور پر ماسکو میں آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان مذاکرات کے ایک طویل سلسلے کی میزبانی کی جو کہ منسک گروپ کا متبادل تھا اور...... اس کے نتیجے میں بین الاقوامی برادری کی کوششیں پراگندہ ہوئیں۔" آخرکار پہلے درجے کے فریقوں کے تھک جانے کے بعد اور مذاکرات کی پشت پناہی پر ایران کو برقرار رکھنے میں روس کی کامیابی سے ایک سیز فائر معاہدہ ہوگیا جیسے دوسرے درجے کے فریق روس اور ایران تاجکستان میں ایک سیز فائر کا بندوبست کرنے کی کامیاب کوششوں میں بھی وقفے وقفے سے تعاون کرتے رہے تھے۔

رابرٹ پٹ نام نے ریاستوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو" دومرحلوں کا کھیل" قرار دیا ہے جس میں سفارتکار اپنے ملک کے اندر اور فریق مخالف کے ساتھ بیک وقت مذاکرات کرتے تھے۔ ہنٹنگٹن نے ایک متوازی تجزیے میں واضح کیا ہے کہ کس طرح ایک آمرانہ حکومت جمہوریت کی طرف جانے کیلئے اعتدال پسندوں سے مذاکرات کرتی ہے۔ ان اعتدال پسندوں کو جو حزب اختلاف میں ہوتے ہیں حکومت کے اندر موجود ہارڈ لائنزوں (سخت گیر موقف رکھنے والوں) کو رد کرنا ہوتا ہے یا ان سے بھی مذاکرات کرنے ہوتے ہیں جبکہ اعتدال پسندوں کو حزب اختلاف میں موجود ریڈیکلوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا برتاؤ برتنا پڑتا ہے۔ ان دومرحلوں والے کھیلوں میں کم ازکم چار فریق شامل ہوتے ہیں یا کم ازکم تین نیز چاروں کے آپس میں تعلقات بھی ہوتے ہیں۔ تاہم تقسیمی خط کی ایک پیچیدہ جنگ تین مرحلوں کا کھیل ہوتی ہے جس میں کم ازکم چھ یا سات فریق ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے تعلقات رکھتے ہوں۔ تقسیمی خط کے آرپار افقی تعلقات پہلے دوسرے اور تیسرے درجے کے شرکاء کے جوڑوں کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔ عمودی تعلقات ہر تہذیب کے اندر مختلف سطحوں کی پارٹیوں کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔ ایک" بھرپور جنگ" میں لڑائی کو رکوانے کیلئے درج ذیل شرطوں کا پورا ہونا لازمی ہوتا ہے:

☆ دوسرے اور تیسرے درجے کے فریقوں کی فعال شرکت۔

☆ تیسرے درجے کے شرکاء کے درمیان جنگ روکنے کیلئے وسیع شرائط پر مذاکرات۔

☆ تیسرے درجے کے فریق کی طرف سے ان شرائط کو دوسرے درجے کے فریقوں سے منوانے کیلئے "گاجر اور چھڑی" کا استعمال نیز اسے پہلے درجے کے فریقوں پر دباؤ ڈالنے کیلئے آمادہ کرنا۔

☆ دوسرے درجے کی پارٹیوں کی طرف سے پہلے درجے کی پارٹیوں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا۔

☆ ان دباؤ کے نتیجے میں پہلے درجے کی پارٹیوں کی طرف سے شرائط کی قبولیت بہر حال جس سے وہ اس وقت منحرف ہو جاتے ہیں جب اپنے مفاد میں نہیں پاتے۔

جنگ لڑ لڑ کر تھک جانے سے اور تیسرے درجے کے فریقوں کے دوسرے اور پہلے درجے کے فریقوں کو زور دینے سے تبدیلیاں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو اعتدال پسند انتہا پسندوں کی جگہ لے لیں یا انتہا پسند ملازوچ کی طرح انتہا پسندی چھوڑ کر اعتدال پسندی اختیار کر لیں تاہم وہ ایسا کچھ خطرے مول لے کر ہی کر سکتے ہیں۔ انہیں غدار تصور کیا جا سکتا ہے اور دشمنوں سے بھی زیادہ نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔ کشمیری مسلموں، چیچوں اور سری لنکا کے سنہالیوں کے لیڈروں کو مخالف کے ساتھ مصالحت کی کوشش کرنے پر کاز سے غداری کا مرتکب قرار دیا گیا۔ جیسا کہ سادات اور رابن کے ساتھ ہوا تھا۔

تقسیمی خط کی جنگ کو روکنے کا کوئی معاہدہ کامیاب تو ہو سکتا ہے مگر عارضی طور پر۔ مزید یہ کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے فریقوں، جو مؤخر الذکر اکثر کسی تہذیب کی مرکزی ریاست ہوتی ہیں، کیلئے جنگ میں سلامتی کے یا فرقہ وارانہ مفادات ہونے ضرورت ہیں اسی طرح وہ کسی حل کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ تقسیمی خط کی جنگوں کو روکنے اور پھیل کر گلوبل جنگ بننے سے بچانے کیلئے بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کی دلچسپی اور اقدامات بنیادی طور پر ناگزیر ہیں۔ تقسیمی خط کی جنگیں نیچے سے شروع ہوتی ہیں۔ تقسیمی خط کا امن اوپر سے نیچے آتا ہے۔

☆☆☆

تہذیبوں کا مستقبل

باب 12

تہذیبوں کا مستقبل

مغرب' تہذیبیں اور "تہذیب"

مغرب کا احیاء

تاریخ کم از کم ایک دفعہ ختم ہوتی ہے اور ہر تہذیب کی تاریخ گاہے گاہے' جیسے ہی تہذیب کی آفاقی ریاست ابھرتی ہے اس کے لوگ ٹائن بی کے الفاظ میں "لافانیت کے سراب" کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور خود کو انسانی معاشرے کی آخری صورت تصور کرتے ہیں۔ ایسا ہی رومی سلطنت' عباسی خلافت' مغل سلطنت اور عثمانی سلطنت کے معاملہ میں ہوا تھا۔ ایسی آفاقی ریاستوں کے شہری "واضح طور پر سادہ حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے...... اس کو ویرانے میں ایک رات کی پناہ گاہ نہیں بلکہ موعودہ سرزمین ماننے لگتے ہیں۔ انسانی کوششوں کی منزل!" ایسا ہی پیکس بریٹینکا کے معاملے میں سچ تھا۔ 1897ء میں انگریز مڈل کلاس کیلئے "جیسا کہ وہ سمجھتے تھے' ان کیلئے تاریخ ختم ہو گئی تھی...... اور وہ اس اقبال مندی کی مستقل حالت پر خود کو مبارکباد دیتے تھے جو تاریخ کے اختتام نے انہیں عطا کی تھی۔" تاہم وہ معاشرے جو یہ تصور کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ ختم ہو گئی ایسے معاشرے ہوتے ہیں جن کی تاریخ زوال پانے والی ہوتی ہے۔

کیا مغرب اس پیٹرن سے مستثنیٰ ہے؟ میتکو نے دو کلیدی سوالات خوب اٹھائے ہیں:
اول: کیا مغربی تہذیب کوئی نئی نوع ہے' فی نفسہ ایک طبقے میں ان سب تہذیبوں سے مختلف ہے جو کہ کبھی وجود میں رہی ہیں؟
دوم: کیا اس کے عالم گیر پھیلاؤ نے دوسری تمام تہذیبوں کے خاتمے کا خطرہ (یا توقع) پیدا کر دیا ہے؟

بیشتر مغربیوں کا رجحان بالکل فطری طور پر دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دینے کا ہے اور شاید وہ درست ہیں۔ تاہم ماضی میں دوسری تہذیبوں کے لوگ ایسا ہی سوچتے تھے اور غلط سوچتے تھے۔

مغرب واضح طور پر ان سب تہذیبوں سے مختلف ہے جو کبھی وجود رکھتی تھیں اور یہ کہ اس نے 1500ء سے تمام دیگر تہذیبوں پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ اس نے جدیدیت اور صنعتیت (انڈسٹریلائزیشن) کے عمل کو بھی شروع کیا جو عالم گیر ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری تمام تہذیبوں کے معاشرے دولت اور جدت میں مغرب کی پیروی کرنے لگے۔ تاہم کیا ان خصوصیات کا یہ مطلب ہے کہ تہذیب کے طور پر اس کا ارتقا اور حرکیات اس پیٹرن سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو دوسری تمام تہذیبوں پر غالب رہا ہے؟ تاریخ کی گواہی اور تہذیبوں کی تقابلی تاریخ کے سکالروں کا فیصلہ تو مختلف ہے۔ مغرب کا ارتقا ساری تاریخ میں تہذیبوں کے عمومی ارتقائی پیٹرن سے مختلف نہیں تھا۔ اسلامی احیاء اور ایشیا کی معاشی حرکیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تہذیبیں زندہ ہیں اور مغرب کیلئے ایک خاموش خطرہ ہیں۔ مغرب اور دوسری تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں میں ایک بڑی جنگ ناگزیر نہیں ہے لیکن یہ ہو بھی سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کی ابتداء سے شروع ہونے والا مغرب کا بتدریج اور بے قاعدہ زوال کئی عشروں اور شاید آنے والی صدیوں تک جاری رہ سکتا ہے یا مغرب کا احیا کامیابی سے ہونا ممکن ہے' وہ دنیا کے معاملات میں اپنے زوال پاتے ہوئے اثر و رسوخ کو بحال کر سکتا ہے اور دوسری تہذیبوں کے پیش رو کے طور پر اپنی حیثیت کو دوبارہ منوا سکتا ہے۔

کیرول کگلے کے تجزیے کے مطابق تاریخی تہذیبیں سات مدارج سے گزر کر ارتقا پاتی ہیں۔ مغرب کی تہذیب ان تمام مدارج سے گزر کر اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے جسے آنے والی نسلیں ''سنہری'' دور کے نام سے یاد کریں گی۔ اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔

گزشتہ تہذیبوں میں یہ مبارک و مسعود سنہری دور اپنے لافانیت کے احساسات کے باوجود ختم ہو کر رہا۔ یا تو ڈرامائی طور پر کسی خارجی حملے کے تحت یا داخلی انتشار کے سبب سے۔ تہذیب کو زوال سے بچنے کیلئے تباہی کے خلاف اپنے داخلی مزاحمتی نظام کو مضبوط بنانا ہوتا ہے۔ تہذیبیں اس وقت زوال پاتی ہیں جب وہ اپنے منافعوں کو نئی اشیا بنانے پر صرف نہیں کرتیں۔ جدید اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب سرمایہ کاری کی شرح گھٹ جاتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ سوشل گروپ جو منافعوں کے مالک ہوتے ہیں ''انہیں غیر پیداواری لیکن نفس (انا) کو تسکین دینے والے مقاصد پر خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں...... اس سے منافعے اسراف میں تو ضائع ہوتے ہیں تاہم نئے اور موثر طریق ہائے پیداوار کو وضع کرنے پر نہیں۔'' لوگ اپنے سرمایوں کو ضائع کرتے رہتے ہیں اور تہذیب اپنی آفاقی ریاست کے درجے سے زوال کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ زوال بیرونی یورش کا باعث بنتا ہے۔ ''جب کسی تہذیب میں اپنے دفاع کی سکت نہیں ہوتی یعنی وہ اپنے دفاع کی خواہش ہی نہیں رکھتی تو یوں سمجھئے وہ ''وحشیانہ یورش'' کے سامنے لیٹی ہوئی ہوتی ہے۔'' جو عموماً کوئی دوسری نوجوان اور زیادہ طاقت ور تہذیب کرتی ہے۔

تاہم تہذیبوں کی تاریخ کا سبق ہے کہ بہت سی چیزیں ممکن ہوتی ہیں لیکن ناگزیر کچھ بھی نہیں ہوا کرتا۔ تہذیبیں خود کو بحال کر سکتی ہیں اور کر چکی ہیں۔ مغرب کیلئے مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ کسی بیرونی چیلنج سے قطع نظر کیا وہ اپنے داخلی زوال کے عمل کو روکنے اور واپس پھیرنے کی سکت اور اہلیت رکھتی ہے؟ کیا مغرب خود کو بحال کر سکتا ہے یا پھر اس کا داخلی زوال اسے کسی دوسری زیادہ متحرک اور جاندار تہذیب کے مقابلے میں سرنگوں کر دے گا؟

کگلے کی بیان کردہ کئی علامات زوال مغربی تہذیب میں 1990ء کی دہائی کے وسط میں نمایاں ہوئی ہیں۔ یہ درست ہے کہ مغرب کسی بھی دوسری تہذیب سے معاشی طور پر

زیادہ امیر ہے تاہم اس کی شرح پیداوار کم ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ خصوصی طور پر مشرقی ایشیا کے معاشروں کے مقابلے میں اس کی بچت کی شرح اور سرمایہ کاری کی شرح کم ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر صارفیت کو ترجیح دی جارہی ہے جبکہ فوجی اور معاشی ذرائع کی ترقی پر کم خرچ کیا جارہا ہے۔ تاہم بہت سے عوامل مثلاً کم شرح پیدائش، اعلیٰ سائنسی تحقیق، معاشی شعبے کا مسلسل پروان چڑھنا، آبادی کے بیشتر حصے کی آسودہ حالی، امیگریشن کو ترجیح دی جانی چاہیے خصوصاً ہنرمند، تعلیم یافتہ، توانا لوگوں کو آنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

معیشت اور آبادی سے کہیں زیادہ اہم چیز مغرب کا اخلاقی زوال، ثقافتی خودکشی اور سیاسی انتشار ہے۔ مستقبل میں مغرب کی توانائی اور دوسرے معاشروں پر اس کے اثر ورسوخ کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذکورہ بالا رجحانات کو ختم کرنے کیلئے بھرپور اقدامات اٹھائے جاتے ہیں یا نہیں۔

مغرب کا اخلاقی زوال درج ذیل معاملات کے حوالے سے نمایاں ہوا ہے:

1- غیر معاشرتی رویے میں اضافہ مثلاً جرائم، منشیات کا استعمال اور تشدد۔

2- خاندان کا زوال، بشمول طلاق کی بڑھی ہوئی شرح، ناجائز تعلقات، ٹین ایج حمل اور واحد والدہ، والد پر مشتمل گھرانے۔

3- کم از کم امریکہ میں "معاشرتی سرمائے" میں کمی جو کہ رضا کار تنظیموں کی رکنیت اور ایسی رکنیت سے منسلک بین الشخصی ٹرسٹ میں کمی۔

4- کام کی اخلاقیات کی عمومی کمزوری اور ذاتیات کے ملوث ہونے کے کلچر کا فروغ۔

5- تعلیم اور دانشورانہ سرگرمیوں سے کم ہوتی ہوئی وابستگی جو امریکہ میں سکول سطح کی کامیابیوں کی کم شرح سے ظاہر ہے۔

مسلم اور ایشیائی معاشرے اس حوالے سے آگے اور بلند ہیں۔

مغربی ثقافت کو مغربی معاشروں کے داخلی گروپوں نے چیلنج کیا ہے۔ ایسا ایک چیلنج دوسری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے تارکین وطن (امیگرنٹس) نے پیدا کیا ہے جو ان معاشروں میں گھلنے ملنے کو مسترد کر چکے ہیں اور اپنے معاشروں کی اقدار، رسوم و روایات اور

ثقافت سے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ اس کو ترویج بھی دے رہے ہیں۔ یہ مظہر یورپ میں رہنے والے مسلموں کے حوالے سے زیادہ اہم ہے۔ تاہم وہ اقلیت میں ہیں۔ یہ امریکہ میں ہسپانیوں میں قدرے کم درجے میں ظاہر ہوا ہے جو کہ ایک بڑی اقلیت ہیں۔ اگر اس صورتحال میں گھلنے ملنے کا عمل ناکام ہوا تو امریکہ بحران اور انتشار کے امکانات کے ساتھ ایک منقسم ملک بن جائے گا۔ یورپ میں مغربی تہذیب اپنے جزواعظم عیسائیت کی کمزوری کی وجہ سے کھوکھلی ہو رہی ہے۔ عیسائی تصورات' اقدار اور اعمال یورپی تہذیب پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک دانشور کا کہنا ہے"سویڈ یورپ میں شاید سب سے زیادہ غیر مذہبی لوگ ہیں تاہم تم اس کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ یہ نہ جان لو کہ ہمارے ادارے' معاشرتی اعمال' خاندان' سیاست اور طرز حیات بنیادی طور پر ہمارے لوتھرن ورثے سے پیدا ہوئے ہیں۔" یورپیوں کے برعکس امریکی خدا پر بھرپور ایمان رکھتے ہیں۔ خود کو مذہبی لوگ تصور کرتے ہیں اور بڑی تعداد میں گرجا جاتے ہیں۔ **1980**ء کی دہائی تک امریکہ میں مذہبی احیا کے شواہد عدم دستیاب تھے مگر آنے والے برسوں میں مذہبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ مغربیوں میں عیسائیت کا زوال مغربی تہذیب کی بقا کیلئے ایک طویل المدتی خطرہ ہے۔ امریکہ میں ایک زیادہ فوری اور خطرناک چیلنج موجود ہے۔ تاریخی حوالے سے امریکی قومی تشخص کا تعین ثقافتی طور پر مغربی تہذیب کے ورثے کے اعتبار سے اور سیاسی حوالے سے امریکی مسلک کے اصولوں سے ہوتا ہے جن پر کہ امریکی بھرپور طور پر متفق ہیں یعنی آزادی' جمہوریت' انفرادیت پسندی' قانون کے سامنے برابری' آئین پسندی' نجی ملکیت۔ بیسویں صدی کے اواخر میں امریکی تشخص کے دونوں اجزا کو دانشوروں اور پبلیسٹی کرنے والوں کی ایک چھوٹی لیکن موثر تعداد کی جانب سے مرکوز اور مسلسل حملے کا سامنا ہے۔ انہوں نے کثیر الثقافتیت (ملٹی کلچرل ازم) کے حوالے سے امریکہ کے مغربی تہذیب سے شناخت کروائے جانے پر حملہ کیا ہے۔ وہ ایک مشترک امریکی ثقافت کو نہیں مانتے اور نسلی اور قومیتی ثقافتی شناختوں اور گروپ بندیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ ان کی رپورٹوں میں سے ایک کے الفاظ میں وہ تعلیم میں "یورپی ثقافت اور اس کے حاصلات کی

منظم جانب داری کو رد کرتے ہیں۔'' اور ''یورپی امریکی یک ثقافتی انداز نظر کو مسترد کرتے ہیں۔'' آرتھر ایم شلینگر جونیئر کہتا ہے کہ ملٹی کلچرسٹ ''نسل پرست علیحدگی پسند ہیں جنہیں مغربی ورثے میں سوائے جرائم کے اور بہت کم دکھائی دیتا ہے۔''

ملٹی کلچرل رجحان ان قانون سازیوں سے بھی نمایاں ہوا ہے جو 1960ء کی دہائی کے سول رائٹس ایکٹ کی پیروی میں کی گئیں اور 1990ء کی دہائی میں کلنٹن انتظامیہ نے تنوع کی حوصلہ افزائی کو اپنا بڑا مقصد بنالیا۔ ماضی سے یہ اختلاف ہلا دینے والا ہے۔ بانیان وطن نے تنوع کو ایک حقیقت اور ایک مصیبت کے طور پر دیکھا تھا۔ بعد میں آنے والے لیڈروں نے بھی جو کہ نسلی، فرقہ وارانہ، معاشی اور ثقافتی تنوع سے خوفزدہ تھے (جو کہ درحقیقت 1815ء اور 1914ء کے درمیان میں صدی کی سب سے بڑی جنگ کا باعث تھا) ''متحد ہو جاؤ'' کا نعرہ لگایا اور قومی اتحاد کو اپنی مرکزی ذمہ داری بنالیا تھا۔ تھیوڈور روز ویلٹ نے خبردار کیا تھا کہ ''اس قوم کو تباہ و برباد کرنے کا ایک سب سے یقینی راستہ یہ ہے کہ اس کو باہم جھگڑنے والی قومیتوں کا جال بنادو۔'' تاہم 1990ء کی دہائی میں امریکہ کے لیڈروں نے نہ صرف اس کو رائج کر دیا بلکہ اپنے زیر حکومت لوگوں کو متحد کرنے کے بجائے منتشر ہونے کو بڑھاوا دیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے لیڈروں نے اپنے ثقافتی ورثے کے انکار اور اپنے ملک کا تشخص ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ایسی کوئی مثال نہیں کہ وہ کامیاب ہوئے ہوں بلکہ انہوں نے تو شیزوفرینیائی کٹے ہوئے ملک پیدا کئے ہیں۔ امریکہ کے ملٹی کلچرسٹ بالکل اسی طرح اپنے ملک کے ثقافتی ورثے کو مسترد کرتے ہیں تاہم وہ امریکہ کے تشخص کو کسی دوسری تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے اپنے ملک کو ایک کثیر التہذیبی ملک بنانا چاہتے ہیں جو کہ ایک ایسا ملک ہو کہ جو کسی تہذیب سے تعلق نہ رکھتا ہو اور جس کا ثقافتی مرکز کوئی نہ ہو۔ تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ اس بنیاد پر استوار کوئی بھی ملک تادیر متحد معاشرے کے طور پر باقی نہیں رہتا۔ ایک کثیر التہذیبی امریکہ ریاست ہائے متحدہ نہیں ہوگا بلکہ اقوام متحدہ ہوگا۔

امریکی مسلک اور مغربی تہذیب کے مسترد کئے جانے کا مطلب ہے ریاست ہائے

متحدہ امریکہ کا اختتام۔ اس کا مطلب مغربی تہذیب کا خاتمہ بھی ہے۔ اگر امریکہ غیر مغربی ہوتا ہے تو مغرب یورپ تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ امریکہ کے بغیر مغرب دنیا کی آبادی کا ایک زوال پذیر حصہ بن جائے گا جو کہ ایک چھوٹے سے جزیرہ نما تک محدود ہو گا۔

جیمز کرتھر کے الفاظ میں ملٹی کلچر سٹوں اور مغربی تہذیب اور امریکی مسلک کا دفاع کرنے والوں کے درمیان تصادم ہی ''حقیقی تصادم'' ہے۔ امریکہ اور مغرب کا مستقبل امریکیوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے اپنی وابستگی کا دوبارہ اقرار کرتے ہیں یا نہیں۔ داخلی طور پر اس کا مطلب ہے ملٹی کلچر سٹوں کے تفریقی بلاووں کو رد کرنا۔ بین الاقوامی سطح پر اس کا مطلب ہے امریکہ کو ایشیا سے شناخت کروانے کو رد کرنا۔ خواہ امریکہ اور ایشیا کے درمیان معاشی رشتے موجود ہی کیوں نہ ہوں ثقافتی فرق ان دونوں کو ایک گھر میں اکٹھے ہونے نہیں دے گا۔ امریکی ثقافت کے حوالے سے مغربی خاندان کا حصہ ہیں۔ ملٹی کلچرسٹ اس رشتے کو نقصان پہنچا اور برباد کر سکتے ہیں لیکن اس کا متبادل نہیں دے سکتے۔ جب امریکی ثقافتی جڑوں کو ڈھونڈتے ہیں تو وہ انہیں یورپ کے اندر ملتی ہیں۔

1990ء کی دہائی کے وسط سے ایک نئی بحث چل نکلی ہے جو مغرب کی ساخت اور مستقبل کو موضوع بناتی ہے۔ سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ کیا مغربی تہذیب کا وجود برقرار رہے گا؟

مغرب ارتقا اور توسیع کے یورپی مرحلے سے گزر چکا ہے جو کہ کئی صدیوں تک جاری رہا تھا اور پھر بیسویں صدی میں امریکی مرحلے سے گزرا۔ اگر شمالی امریکہ اور یورپ اپنی اخلاقی زندگی کا احیا کرتے ہیں جو کہ ان کی ثقافتی یکسانیت پر استوار ہو اور ناٹو میں اپنے سلامتی کے اتحاد کو موثر کرتے ہوئے اپنے معاشی اور سیاسی رشتوں کو مستحکم کرتے ہیں تو وہ مغربی معاشی اور سیاسی اثر و رسوخ کے یورو امریکی مرحلے کو شروع کریں گے۔ بامعنی سیاسی اتحاد دنیا میں مغرب کے زوال کو روک سکتا ہے جو کہ معاشی پیداوار اور فوجی استعداد کے حوالے سے رونما ہوا ہے نیز دوسری تہذیبوں کے لیڈروں کی نگاہوں میں مغرب کی طاقت کو بحال کر سکتا ہے۔ وزیراعظم مہاتیر نے ایشیائیوں کو خبردار کیا کہ ''ای یو نافٹا (EU-NAFTA) کنفیڈریشن باقی کی ساری دنیا کو اپنے آگے لگا سکتی ہے۔'' تاہم

مغرب سیاسی اور معاشی حوالے سے متحد ہوتا ہے یا نہیں اس کا انحصار اس بات پر بہت زیادہ ہے کہ امریکہ خود کو ایک مغربی قوم کے طور پر شناخت کرواتا ہے یا نہیں نیز اپنا عالمی کردار مغربی تہذیب کے لیڈر کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔

مغرب دنیا کے تناظر میں

ایک ایسی دنیا جس میں ثقافتی شناختیں' نسلی' قومی' مذہبی' تہذیبی...... مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور ثقافتی اشتراکات اور اختلافات اتحادوں' جھگڑوں اور ریاستوں کی پالیسیوں کو تشکیل دیتے ہوں مغرب کیلئے تین بڑی الجھنیں عمومی طور پر اور امریکہ کیلئے خصوصی طور پر موجود ہیں:

اول: سیاست دان حقیقت کو اسی وقت تبدیل کر سکتے ہیں جب وہ اس کو پہچانتے اور سمجھتے ہوں۔ ثقافت کی ابھرتی ہوئی سیاست' غیر مغربی تہذیبوں کی نمایاں ہوتی ہوئی طاقت اور ان معاشروں کی بڑھتی ہوئی ثقافتی ایجابیت غیر مغربی دنیا میں وسیع طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ یورپی لیڈروں کا موقف رہا ہے کہ ثقافتی قوتیں ہیں جو لوگوں کو متحد یا منتشر کرتی ہیں اور اس کے برعکس امریکی اشرافیہ ان ابھرتی ہوئی حقیقتوں کو قبول کرنے میں سُست رہی ہے۔ بش اور کلنٹن انتظامیہ نے کثیر التہذیبی سوویت یونین' یوگوسلاویہ' بوسنیا اور روس کو متحد کرنے کی کوششیں کیں جو کہ انتشار کو پیدا کرنے والی منہ زور نسلی اور ثقافتی قوتوں کو لگام ڈالنے کی ناکام کوشش تھیں۔ انہوں نے ایپک (APEC) وغیرہ کے ساتھ کثیر التہذیبی معاشی اتحادوں کو قائم کرنا چاہا جو کہ بے معنی ہیں یا غیر متوقع بڑے معاشی اور سیاسی مصارف کروانے والے معاہدے مثلاً نافٹا اور میکسیکو کے ساتھ معاشی ربط و تعلق۔ انہوں نے روس کے ساتھ ''گلوبل پارٹنر شپ'' اور چین کے ساتھ ''تعمیری رفاقت'' کے نام پر دوسری تہذیبوں کے ساتھ قریبی مراسم قائم کرنے کی کوششیں کیں جبکہ امریکہ اور ان ملکوں کے مابین مفاداتِ کے فطری جھگڑے موجود تھے۔ عین اسی اثنا میں کلنٹن انتظامیہ بوسنیا میں امن کیلئے روس کی پورے دل سے حمایت و مدد حاصل کرنے میں ناکام ہوئی جبکہ روس

آرتھوڈوکسوں کی مرکزی ریاست کی حیثیت سے اس جنگ میں بڑی دلچسپی لیتا رہا تھا۔ اگرچہ یورپی آفاقی طور پر مغربی عیسائیت اور آرتھوڈوکسی اور اسلام کے درمیان تقسیمی خط کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن امریکہ جیسا کہ اس کے سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) نے کہا ہے "یورپ کے کیتھولک' آرتھوڈوکس اور اسلامی حصوں میں بنیادی تقسیم کو تسلیم نہیں کرے گا۔" تاہم جو لوگ بنیادی تقسیموں کو تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ ان کے ہاتھوں زک اٹھاتے ہیں۔ مجموعی طور پر امریکی حکومت ایک ایسے عہد کو قبول کرنے میں غیر معمولی دشواری کا سامنا کر رہی ہے جس کے اندر عالمی سیاست ثقافتی اور تہذیبی لہروں سے تشکیل پاتی ہے۔

دوم: امریکی خارجہ پالیسی کا تصور سرد جنگ کی ضروریات کو پورا کرنے والی پالیسیوں کو ترک کرنے' تبدیل کرنے یا وقت پڑنے پر نظر ثانی کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ایسا اس لئے ہے کہ سوویت یونین کو اب بھی ایک خطرہ تصور کیا جا رہا ہے۔ لوگ زیادہ تر سرد جنگ کے اتحادوں اور اسلحہ پر پابندی (کنٹرول) کے معاہدوں کو تقدس دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔ ناٹو کو سرد جنگ کے خطوط پر ہی باقی و برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جاپان امریکی سلامتی کا معاہدہ مشرقی ایشیا کی سلامتی کے حوالے سے مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے انہیں اور سرد جنگ کے دوسرے ورثوں کو بے کار نہیں تصور کرنا چاہئے۔ تاہم انہیں سرد جنگ کے زمانے والی شکل وصورت میں برقرار رکھنا نہ تو امریکہ کیلئے فائدہ مند ہے اور نہ مغرب کیلئے۔ کثیر التہذیبی دنیا کے حقائق کا تقاضا ہے کہ ناٹو کو توسیع دے کر دوسرے مغربی ملکوں کو بھی رکن بنایا جائے اور اس لایعنیت کو ختم کیا جائے کہ دو ایسے ملک بھی رکن ہوں جن میں سے ایک دوسرے کا بدترین دشمن ہو اور دونوں دوسرے ارکان کے ساتھ ثقافتی یکسانیت بھی نہ رکھتے ہوں۔ سرد جنگ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ایک اے بی ایم (ABM) معاہدہ امریکہ اور سوویت روس دونوں کو نیوکلیائی جنگ سے باز رکھنے میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ اس معاہدے کو باقی رہنا چاہئے تاکہ امریکہ اور دوسرے مغربی معاشرے خود کو دہشت گرد تحریکوں اور غیر متوقع آمروں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ امریکہ جاپان سلامتی معاہدے نے جاپان کے خلاف سوویت جارحیت کو روکا تھا۔ کیا سرد

جنگ کے بعد کے زمانے میں اس کا کوئی مقصد ہے؟ چین کو محدود اور باز رکھنے کیلئے؟ جاپان کو مزید فوجی اضافے سے روکنے کیلئے؟ جاپان اور امریکہ ہر دو ملکوں میں امریکی فوجوں کی جاپان میں موجودگی کی ضرورت کے حوالے سے شکوک بڑھ رہے ہیں۔ یورپ معاہدے میں روایتی افواج کو اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے وسطی یورپ میں ناٹو‘ وارسا پیکٹ کشمکش کو اعتدال میں رکھا جائے جو کہ اب ختم ہو چکی ہے۔اب اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہی رہ گیا ہے کہ روس کو اس کے جنوب سے اپنی سلامتی کو درپیش مسلم خطرے سے نمٹنے میں دشواریاں پیدا کی جائیں۔

سوم: ثقافتی اور تہذیبی تنوع نے مغرب اور خاص طور پر امریکہ کے اس ایقان کو چیلنج کیا ہے کہ مغربی ثقافت آفاقیت کی حامل ہے۔اس ایقان کا مظہری اور معیاری ہر دو حوالوں سے اظہار کیا گیا ہے۔مظہری حوالے سے یہ اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ تمام معاشروں کے لوگ مغربی اقدار‘ اداروں اور اعمال کو اپنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔اگر ان کے اندر اس طرح کی خواہش دکھائی نہیں پڑتی ہے اور وہ لوگ اپنی روایتی ثقافت سے وابستہ ہیں تو یہ اسی طرح کا ”جعلی شعور“ ہے جیسا کہ مارکسیوں نے سرمایہ داری کی حمایت کرنے والے پرولتاریہ میں پایا تھا۔ معیاری حوالے سے مغرب کی آفاقیت کا ایقان اس مفروضے سے عیاں ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کو مغربی اقدار‘ اداروں اور ثقافت کو گلے کا ہار بنا لینا چاہئے تاکہ انہیں نوع انسان کے سب سے زیادہ اعلیٰ و برتر‘ سب سے زیادہ روشن خیال‘ سب سے زیادہ آزاد‘ سب سے زیادہ منطقی و عقلی‘ سب سے زیادہ جدید اور سب سے زیادہ مہذب تصور کو اپنانے کا موقع ملے۔

نسلی تنازعوں اور تہذیبی تصادم سے بھرپور اس ابھرتی ہوئی دنیا میں مغربی ثقافت کی آفاقیت کا مغربی ایقان تین مسائل سے دوچار ہے: یہ جھوٹا ہے‘ یہ غیر اخلاقی ہے اور یہ خطرناک ہے۔ یہ مفروضہ کہ یہ جھوٹا ہے اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے۔اس مفروضے (تھیسس) کو مائیکل ہاورڈ نے خوب طرح سے پیش کیا ہے ”یہ عمومی مغربی مفروضہ تصور کہ ثقافتی تنوع ایک تاریخی تجسس ہے جو کہ ایک مشترک‘ مغرب اساس‘ اینگلوفون عالمی کلچر سے مغلوب ہو گئی ہے جس نے ہماری بنیادی اقدار کو تشکیل دیا ہے...... سادہ سی بات ہے کہ سچا

اور حقیقی نہیں ہے۔''

یہ ایقان کہ غیر مغربی لوگوں کو مغربی اقدار' مغربی اداروں اور مغربی ثقافت کو اپنا لینا چاہئے غیر اخلاقی ہے اور اس کی وجہ اس کو بروئے عمل لانے کیلئے جو کچھ ضروری ہے وہ موجود نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یورپیوں کی طاقت و اقتدار کی تقریباً آفاقی وسعت اور بیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ کی عالمی (گلوبل) برتری و غلبے نے دنیا بھر میں مغربی تہذیب کو توسیع دی تھی۔ تاہم یورپی عالمگیریت (یورپین گلوبل ازم) اب اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ امریکی اجارہ داری پسپا ہو رہی ہے۔ جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ کلچر (ثقافت) طاقت و اقتدار کی پیروی کرتی ہے اگر غیر مغربی معاشروں کو ایک بار پھر مغربی ثقافت کے تحت تشکیل دینا ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ مغربی طاقت کو توسیع دی جائے اور فوج کثیر کی جائے۔ سامراجیت آفاقیت کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ایک بالغ تہذیب کی حیثیت میں مغرب کو مزید معاشی یا آبادیاتی حرکیات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دوسرے معاشروں پر اپنی مرضی مسلط کرے نیز ایسا کرنے کی کوئی بھی کوشش مغرب کے نظریۂ خود مختاری اور جمہوریت کے الٹ ہوگی۔ جیسا کہ ایشیائی اور مسلم تہذیبیں اپنی اپنی ثقافتوں کی آفاقیت کو تسلیم کرنا شروع ہو گئی ہیں۔ مغربی ارادہ زیادہ سے زیادہ سامراجیت اور آفاقیت کے ربط و تعلق کے حق میں ہو رہا ہے۔

مغربی آفاقیت دنیا کیلئے خطرناک ہے کیونکہ یہ مرکزی ریاستوں کے درمیان ایک بڑی بین التہذیبی جنگ کی طرف لے جا سکتی ہے نیز یہ مغرب کیلئے خطرناک ہے کیونکہ یہ مغرب کو شکست کی طرف لے جا سکتی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ ہی مغربیوں نے اپنی تہذیب کو ''کوئی مقابل نہیں دور تک'' والی حالت میں دیکھا ہے جبکہ اسی اثنا میں کمزور ایشیائی' مسلم اور دوسرے معاشرے زور پکڑنا شروع ہو گئے ہیں لہٰذا وہ بروٹس کی مشہور اور طاقتور منطق کو بروئے عمل لانے کی طرف جا سکتے ہیں:

''ہمارا لشکر تیار ہے' ہمارا وقوع ناگزیر ہے' دشمن ہر روز مضبوط ہو رہا ہے' ہم جو عروج پر ہیں' زوال آمادہ ہونے کو ہیں' انسانی

معاملات میں ایک لہر رونما ہوئی ہے' جو سیلاب بن سکتی ہے' تقدیر کو
بروئے عمل لا سکتی ہے' اس کی زندگی کے سارے سفر' مصیبتوں اور
نایاب پانیوں میں گھرے ہوئے ہیں' ایک بھرپور سمندر میں ہم تیر
رہے ہیں' اور ہمیں لازماً لہروں کا سامنا کرنا ہوگا یا اپنی مہم سے ہاتھ
دھو بیٹھنا ہوگا۔"

تاہم یہ منطق فلپی میں بروٹس کی شکست کا باعث بنی تھی اور مغرب کیلئے بہترین لائحہ عمل یہی ہے کہ طاقت و اقتدار میں تبدیلی کو روکنے کی کوشش نہیں کرے بلکہ پایاب پانیوں میں کشتی کھینا سیکھے' مصیبتوں کو برداشت کرے' اپنی مہمات کو اعتدال میں لائے اور اپنی ثقافت کو بچائے۔

ہر تہذیب ظہور' عروج اور زوال کے یکساں عمل سے گزرتی ہے۔ مغرب اس حوالے سے دوسری تہذیبوں سے مختلف نہیں ہے بلکہ اپنی اقدار اور اداروں کے منفرد کردار کی وجہ سے مختلف ہے۔ ان میں سب سے اہم ہیں اس کی عیسائیت' کثرتیت (پلورل ازم)' انفرادیت پسندی اور قانون کی حکمرانی جس نے مغرب کیلئے ممکن بنایا کہ وہ پوری دنیا پر تسلط پالے' جدت کو وضع کرے اور دوسرے معاشروں کا آقا بن جائے۔ آرتھر ایم شلیسنگر کا کہنا ہے کہ مغربی تہذیب کو اپنی مخصوص خصوصیات کو حاصل کرنے کیلئے یورپ "ایک سرچشمہ ہے...... ایک منفرد سرچشمہ" جس سے حاصل ہوتی ہیں انفرادی آزادی' سیاسی جمہوریت' قانون کی حکمرانی' انسانی حقوق اور ثقافتی آزادی...... یہ یورپی تصورات ہیں' ایشیائی نہیں' نہ ہی افریقی' نہ ہی یہ تصورات مشرق وسطیٰ کے ہیں' ہاں سوائے ان کی قبولیت کے۔" انہوں نے مغربی تہذیب کو منفرد بنایا ہے اور مغربی تہذیب اس لئے قابل قدر نہیں ہے کہ یہ آفاقی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ منفرد ہے' لاثانی ہے۔ نتیجتاً مغربی لیڈروں کی سب سے اہم ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ دوسری تہذیبوں کو مغربی تصور کے مطابق ڈھالیں جو کہ ان کی زوال پذیر طاقت سے ماورا ہے بلکہ یہ کہ مغربی تہذیب کی منفرد خصوصیات کو محفوظ کریں اور انہیں تازگی فراہم کریں۔ چونکہ وہ ایک طاقتور مغربی ملک ہے لہٰذا ساری ذمہ داری ریاست ہائے متحدہ

امریکہ کے کاندھوں پر ہے۔

مغربی طاقت و اقتدار کے زوال کی صورت میں مغربی تہذیب کو محفوظ کرنا امریکہ اور یورپی ملکوں کے مفاد میں ہے۔

زیادہ بڑے سیاسی' معاشی اور فوجی ربط و تعلق اور دوسری تہذیبوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کیلئے اپنی پالیسیوں کو مربوط بنانا۔

یورپی یونین اور ناٹو میں وسطی یورپ کی مغربی ریاستوں کو جو کہ بالٹک جمہوریائیں' سلوویینیا اور کروشیا۔

جہاں تک ممکن ہو لاطینی امریکہ کے "مغربیانے" کو فروغ دینا اور مغرب کے ساتھ لاطینی امریکی ملکوں کا قریبی اتحاد قائم کرنا۔

چینی اور اسلامی ملکوں کو روایتی اور غیر روایتی فوجی طاقت کو ترقی دینے سے روکنا۔

جاپان کے مغرب سے دوری اور چین سے قربت کے عمل کی رفتار کو دھیما کرنا۔

روس کو آرتھوڈوکسی کی مرکزی ریاست تسلیم کرنا نیز ایک ایسی علاقائی طاقت ماننا جو اپنی جنوبی سرحدوں کی طرف اپنی سلامتی کے جائز مفادات کی حامل ہے۔

دوسری تہذیبوں پر مغرب کی ٹیکنالوجیکل اور فوجی برتری کو برقرار رکھنا۔

اور سب سے زیادہ اہم یہ تسلیم کرنا کہ دوسری تہذیبوں کے معاملات میں دخل اندازی کثیر التہذیبی دنیا کے اندر عدم استحکام اور عالمی تصادم کا شاید واحد خطرہ اور امکان ہے۔

سرد جنگ کے بعد امریکہ کو خارجہ پالیسی کے حوالے سے بہت سے مسائل کا سامنا ہے اور اس حوالے سے وسیع بحث مباحثہ ضروری ہے۔ تاہم اس عہد میں امریکہ دنیا سے نہ تو فرار ہو سکتا ہے نہ ہی اس پر غالب آ سکتا ہے۔ نہ تو بین الاقوامیت اور نہ ہی تنہائی پسندی' نہ تو کثیر فریقیت اور نہ ہی یک فریقیت اس کے مفادات کو بہتر طور پر پورا کر سکتی ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ ان انتہائی متضاد تصورات کے امتزاج کو اپنایا جائے نیز ایک اٹلانٹسی پالیسی کو اپنایا جائے جس کے تحت وہ اپنے یورپی پارٹنروں سے تعلقات کو مزید قریبی بنائے اور اس منفرد تہذیب کے مفادات اور اقدار کو تحفظ اور فروغ دے جو ان کا مشترک اثاثہ ہے۔

تہذیبی جنگ اور نظام

دنیا کی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستوں کے درمیان ہونے والی کوئی عالمی جنگ یقینی تو نہیں البتہ ممکن ضرور ہے۔ ایسی کوئی جنگ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کے درمیان ہونے والی تقسیمی خط کی جنگ سے شروع ہو سکتی ہے۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس میں ایک طرف تو مسلم ہوں گے اور دوسری طرف غیر مسلم۔ ایسی جنگ کے پھیلنے کا زیادہ امکان تب ہو گا جب مسلمانوں کی مرکزی ریاستیں اپنے ہم مذہبوں کو مدد فراہم کریں گی۔ عالمی بین التہذیبی جنگ کا ایک زیادہ خطرناک سرچشمہ تہذیبوں اور ان کی مرکزی ریاستوں کے مابین طاقت کا بدلتا ہوا توازن ہے۔ اگر یہ جاری رہتا ہے تو چین کے ابھار اور ''انسانی تاریخ کے اس سب سے بڑے کھلاڑی'' کی بڑھتی ہوئی ایجابیت اکیسویں صدی کے آغاز میں بین الاقوامی استحکام پر بہت زیادہ دباؤ ڈالے گی۔ مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی برتر قوت کا ظہور امریکہ کے اس خطے میں تاریخی حوالے سے موجود مفادات کے خلاف ہے۔

اس امریکی مفاد کے پیش نظر چین اور امریکہ میں جنگ کیونکر چھڑ سکتی ہے؟ 2010ء کے متعلق فرض کیجئے امریکی فوجی دستے کوریا سے نکلتے ہیں جو کہ متحد ہو چکا ہے اور جاپان میں امریکی فوجی موجودگی محدود ہو گئی ہے۔ تائیوان اور مرکزی چین مصالحت کر چکے ہیں جس کے تحت تائیوان کی ڈی فیکٹو آزادی برقرار ہے اور اس نے چین کے ماتحت اقوام متحدہ کی رکنیت لے لی ہے جیسا کہ 1946ء میں یوکرائن اور بیلاروس نے لی تھی۔ جنوبی چینی سمندر میں تیل کے ذخائر کو ترقی دے دی گئی ہے۔ جہاں چین کا بہت بڑے علاقے پر کنٹرول ہے تاہم امریکی کمپنیوں کے ذریعے ویتنام بھی تھوڑا سا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کا اعتماد طاقت کے نئے فروغ سے بڑھا ہے۔ چین اعلان کرتا ہے کہ وہ پورے سمندر پر اپنا کنٹرول قائم کرے گا۔ ویتنامی مزاحمت کرتے ہیں اور چینی اور ویتنامی بحری جنگی جہازوں کے درمیان لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ چینی اپنی 1979ء کی ذلت کا انتقام لینے کیلئے بے قرار ہیں

اور ویتنام پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ویتنامی امریکی امداد کیلئے درخواست کرتے ہیں۔ چینی امریکہ کو دور رہنے کا انتباہ دیتے ہیں۔ ایشیا میں جاپان اور دوسری قومیں۔

امریکہ کہتا ہے کہ وہ ویتنام پر چین کی فتح کو قبول نہیں کرتا۔ چین کے خلاف معاشی پابندیاں لگا دیتا ہے اور اپنے تھوڑے سے بچ رہنے والے جنگی بحری جہازوں کو جنوبی چینی سمندر میں بھیج دیتا ہے۔ چینی اس کو چین کے علاقائی پانیوں کی سرحدوں میں مداخلت قرار دے کر مذمت کرتے ہیں اور ان پر ہوائی حملے کرتے ہیں۔ فائر بندی (سیز فائر) کیلئے اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری اور جاپانی وزیراعظم کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور وہ جنگ سارے مشرقی ایشیا میں پھیل جاتی ہے۔ جاپان امریکہ کو چین کے خلاف جاپان میں قائم ٹھکانے استعمال کرنے سے روک دیتا ہے۔ امریکہ اس کو تسلیم نہیں کرتا ہے اور جاپان اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہوئے ان ٹھکانوں سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ چینی آبدوزیں اور ہوائی جہاز تائیوان اور چین دونوں جگہوں سے امریکی بحری جہازوں اور مشرقی ایشیا میں تنصیبات کو سنگین نقصانات پہنچاتے ہیں۔ اسی دوران میں چینی زمینی افواج ہنوئی میں داخل ہو جاتی ہیں اور ویتنام کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیتی ہیں۔

اگرچہ دونوں چین اور امریکہ نیوکلیائی ہتھیار پھینکنے والے میزائلوں سے لیس ہیں تاہم وہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں انہیں استعمال نہیں کرتے ہیں تاہم ایسے حملوں کا خوف دونوں معاشروں میں موجود ہے اور امریکہ میں تو خاص طور پر بہت خوف ہے۔ اس خوف کے تحت امریکی کہنا شروع کریں گے کہ ہم اس خطرے کا شکار کیوں بنیں؟ اگر چین نے جنوبی چینی سمندر، ویتنام یا حتیٰ کہ سارے کے سارے جنوب مشرقی ایشیا پر قبضہ کر لیا ہے تو کیا فرق پڑا ہے؟ ہسپانوی غلبے والی ریاستوں میں خصوصاً جنگ کی مخالفت ہو رہی ہے جو کہ امریکہ کی جنوب مغربی ریاستیں ہیں۔ ان کے لوگ اور حکومتیں کہتی ہیں ''یہ ہماری جنگ نہیں ہے'' اور 1812ء کی جنگ میں نیو انگلینڈ کے طرز پر جنگ سے باہر رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ جب چین مشرقی ایشیا پر اپنا ابتدائی قبضہ مضبوط کر لیتا ہے تو اس کے بعد امریکی جاپان سے اس کا 1942ء والا رویہ اپنانے کی خواہش کرتے ہیں اس نئی وجود میں آتی ہوئی اجارہ

داری کو شکست دینے کی قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ اب مذاکرات ہو رہے ہیں۔

تاہم اسی دوران میں دوسری تہذیبوں کی بڑی ریاستیں اس جنگ سے بہت اثر لیتی ہیں۔ ہندوستان مشرقی ایشیا میں چین کے اس حملے کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی نیوکلیئر اور روایتی فوجی صلاحیتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر حملہ کر دیتا ہے۔ یہ ابتدا میں تو کامیاب رہتا ہے تاہم پاکستان' ایران اور چین کے درمیان فوجی معاہدہ عمل میں آتا ہے اور ایران جدید اور سوفسٹی کیٹڈ فوجوں کے ساتھ پاکستان کی مدد کو آتا ہے۔ ہندوستان ایرانیوں کے فوجی دستوں اور پاکستانی گوریلوں' جو مختلف نسلی گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں' کے ساتھ لڑائی میں پھنس جاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں عرب ریاستوں سے مدد کی درخواستیں کرتے ہیں...... ہندوستان جنوب مشرقی ایشیا پر ایرانی قبضے اور تسلط سے خبردار کرتا ہے...... تاہم امریکہ کے خلاف چین کی ابتدائی کامیابیوں نے مسلم معاشروں میں مغرب مخالف تحریکوں کو بیدار کر دیا ہے۔ ایک ایک کر کے عرب ملکوں اور ترکی میں باقی ماندہ مغرب دوست حکومتیں اسلام پسند تحریکوں کے ہاتھوں ختم ہو رہی ہیں جنہیں مسلم نوجوانوں کے آخری دستوں سے طاقت حاصل ہوئی ہے۔ مغربی کمزوری سے بیدار ہونے والی مغرب دشمنی کی تحریک جس نے امریکی چھٹے بیڑے کو بہت محدود کر دیا ہے روکی نہیں جا سکتی ہے۔

چین اور امریکہ دوسری کلیدی ریاستوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے ہی چین فوجی کامیابیاں حاصل کرتا ہے جاپان نروس ہو کر اس کی حاشیہ برداری شروع کر دیتا ہے۔ جاپانی فوجیں جاپان میں موجود باقی ماندہ امریکی ٹھکانوں پر قبضہ کر لیتی ہیں اور امریکہ بہت جلدی میں اپنے فوجی دستے جاپان سے نکالتا ہے۔ امریکہ جاپان کے محاصرے کا اعلان کرتا ہے اور مغربی بحرالکاہل میں امریکی اور جاپانی بحری جہازوں میں ہولناک جنگ چھڑ جاتی ہے۔ جنگ کے آغاز ہی میں چین روس کے ساتھ ایک دوطرفہ سلامتی کا معاہدہ کر لیتا ہے۔ تاہم چین کی کامیابیوں سے جاپان کے برعکس روس پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ چین کی فتح اور مشرقی ایشیا پر اس کے غلبے کے امکانات ماسکو کو خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ جونہی روس ایک چین مخالف سمت میں حرکت کرتا ہے اور سائبیریا میں اپنے دستے

بھیجنا شروع کرتا ہے تو سائبیریا میں آباد چینی آبادکار اس نقل و حرکت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگتے ہیں تب چین اپنے ہم وطنوں کے تحفظ کیلئے فوجی مداخلت کرتا ہے اور ولاڈی واسٹک' دریائے ایمور کی وادی اور مشرقی سائبیریا کے دوسرے کلیدی مقامات پر قبضہ کر لیتا ہے۔ جونہی وسطی سائبیریا میں چینی اور روسی فوجی دستوں میں لڑائی پھیلتی ہے منگولیا میں تحریک ابھرتی ہے جو پہلے ہی چین کے زیر تحفظ ہے۔

تیل پر قبضہ اور رسائی سارے جنگ کرنے والوں کیلئے مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ جاپان نیوکلیائی توانائی میں وسیع سرمایہ کاری کے باوجود ابھی تک تیل کی درآمدات پر انحصار کرتا ہے اور اس وجہ سے اس کا چین کا ساتھ دینے کا رجحان مضبوط ہوا ہے۔ وہ خلیج فارس' انڈونیشیا اور جنوبی چینی سمندر سے تیل کے بہاؤ کو محفوظ اور یقینی بنانے کا خواہاں ہے۔ جنگ کے دوران میں جونہی عرب ملک اسلامی عسکریت پسندوں کے قبضے میں آجاتے ہیں تو مغرب کو خلیج فارس سے تیل کی رسد روک دی جاتی ہے اور نتیجتاً مغرب روسی' کا کیشائی اور وسطی ایشیائی ذرائع پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ اس طرح مغرب روس کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی سخت جدوجہد کرنے لگتا ہے اور روس کی اس کے جنوب میں موجود تیل سے مالا مال مسلم ملکوں پر قبضے کیلئے حمایت کرنے لگتا ہے۔

اس اثنا میں امریکہ اپنے یورپی اتحادیوں کی بھرپور مدد حاصل کرنے کی زبردست کوششیں کرتا ہے۔ وہ سفارتی اور معاشی امداد تو وسیع پیمانے پر کر رہے ہیں تاہم فوجی مدد فراہم کرنے سے گریزاں ہیں۔ تاہم چین اور ایران خوفزدہ ہوتے ہیں کہ آخرکار مغربی ملک امریکہ کی مدد کو آئیں گے جس طرح امریکہ دو عالمی جنگوں میں برطانیہ اور فرانس کی مدد کو آیا تھا۔ اس سے بچاؤ کیلئے وہ خفیہ طور پر بوسنیا اور الجیریا میں درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے نیوکلیائی استعداد کے حامل میزائلوں کو نصب کر دیتے ہیں اور یورپی طاقتوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ جنگ سے باہر ہی رہیں۔ جاپان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو خوفزدہ کرنے کی یہ چینی کوششیں ماضی کی طرح اس بار بھی الٹ نتائج پیدا کرتی ہیں۔ امریکی انٹیلی جنس میزائلوں کی تنصیب کا پتا چلا لیتی ہے اور ناٹو کونسل اعلان کرتی ہے کہ میزائلوں کو ضرور جلد از

جلد ہٹا دیا جانا چاہئے۔ تاہم اس سے پہلے کہ ناٹو کوئی اقدام کرے سربیا جو ترکوں کے خلاف عیسائیت کا دفاع کرنے والے ملک کا اپنا تاریخی کردار دوبارہ ادا کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے اور دونوں ملک بوسنیا پر قبضہ کر کے اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں' میزائلوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور نسلی صفائی کے اس عمل کو شروع کر دیتے ہیں جس سے انہیں 1990ء کی دہائی میں بزور روک دیا گیا تھا۔ البانیہ اور ترکی بوسنیائیوں کی مدد کرنے کی کوششیں کرتے ہیں تو یونان اور بلغاریہ یورپی ترکی پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور جونہی ترکی باسفورس کے پار فرار ہوتا ہے استنبول میں ابتری اور دہشت جنم لیتی ہے۔ اسی اثنا میں الجیریا سے چھوڑا گیا ایک نیوکلیائی وار ہیڈ سے لیس میزائل مارسیلز کے باہر پھٹتا ہے اور ناٹو شمال افریقی اہداف پر تباہ کن ہوائی حملے کر کے اس کا جواب دیتی ہے۔

امریکہ' یورپ' روس اور ہندوستان اب چین' جاپان اور بیشتر اسلام کے خلاف ایک حقیقی گلوبل کشمکش میں مصروف ہو چکے ہیں۔ ایسی کوئی جنگ کیونکر ختم ہو گی؟ دونوں فریقوں کے پاس نیوکلیائی استعداد ہے اور یہ واضح ہے کہ اگر انہیں قلیل تعداد میں ہی استعمال کر لیا گیا تو دونوں اطراف کے بڑے ملک بری طرح برباد ہو سکتے ہیں۔ اگر دوطرفہ امتناع (ڈیٹرنس) کارگر ثابت ہوتی ہے تو دوطرفہ کمزوری جنگ کے التوا یا صلح کیلئے مذاکرات کی طرف ضرور لے جائے گی تاہم اس سے مشرقی ایشیا میں چینی اجارہ داری کا بنیادی مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہو پائے گا۔ اس کے بدلے میں مغرب روایتی فوجی طاقت کے ذریعے چین کو شکست دینے کی کوشش کر سکتا ہے تاہم چین اور جاپان کا اتحاد چین کو بھرپور تحفظ دے گا اور امریکہ چینی آبادی کے مراکز اور ساحل کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی صنعتوں کے خلاف اپنی بحری طاقت استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس مشکل سے نبرد آزما ہونے کیلئے متبادل ہے مغرب' چین اور روس کی لڑائی ناٹو کو روس کو رکن کی حیثیت دینے کی طرف لے جائے گی اور سائبیریا پر چینی یورش کو روکنے میں روس کی مدد کرے گی نیز وسطی ایشیا کی تیل اور گیس کے مالک مسلم ملکوں پر کنٹرول برقرار رکھنے اور اویغوریوں' منگولیائیوں اور تبتیوں میں چینی حکمرانی کے خلاف بغاوت کو فروغ دینے میں تعاون کرے گی اور سائبیریا کے مشرق میں دیوار چین سے بیجنگ' منچوریا اور ہان

مرکزی علاقہ تک آخری حملے کیلئے مغربی اور روسی افواج کو اکٹھا کرے گی۔

اس گلوبل تہذیبی جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو نیوکلیائی بربادی' دوطرفہ تھکان اور کمزوری کے نتیجے میں ہونے والے مذاکرات کے بعد التوائے جنگ یا بالآخر تیان من چوک میں روسی اور مغربی فوجوں کا مارچ ...... تاہم جنگ کے سب بڑے شرکاء کا طویل مدتی' وسیع اور تقریباً ناگزیر معاشی' آبادیاتی اور فوجی ہولناک زوال و بربادی نتیجتاً ظہور پذیر ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ عالمی قوت جو صدیوں میں مشرق سے مغرب کو منتقل ہوئی تھی اور پھر مغرب سے مشرق کو منتقل ہونا شروع ہوئی تھی اب شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہونے لگے گی۔ تہذیبوں کی جنگ میں بڑے فائدہ اٹھانے والوں میں وہ تہذیبیں ہوں گی جو اس میں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ مغرب' روس' چین اور جاپان تو برباد ہو چکے ہوں گے لہٰذا راہ کشادہ ہوگی ہندوستان کیلئے اگر وہ جنگ میں شریک ہونے کے باوجود اس بربادی سے بچ گیا ہوا تو وہ دنیا کو ہندووانہ خطوط پر ازسرِنو تشکیل دینے کی کوشش کرے گا۔ امریکی عوام کے بڑے طبقے امریکہ کی کمزوری کے حوالے سے ڈبلیو اے ایس پی اشرافیہ کی تنگ مغرب اساسیت کو الزام دیں گے۔ ہسپانوی لیڈر وسیع مارشل پلان کی طرز کے منصوبوں کے سبز باغ دکھا کر حکومت سنبھال لیں گے جس کے تحت جنگ سے باہر رہنے والے ارتقا کی منزلیں تیزی سے طے کرتے ہوئے لاطینی امریکی ملکوں سے مدد آئے گی۔ دوسری طرف افریقہ یورپ کی تعمیر نو کیلئے بہت کم پیش کر پائے گا۔ ایشیا میں اگر چین' جاپان اور کوریا جنگ سے تباہ و برباد ہو گئے ہوئے تو قوت جنوب کی طرف منتقل ہو جائے گی یعنی انڈونیشیا کی طرف جو غیر جانبدار رہا تھا اور برتر ریاست کے طور پر سامنے آیا ہے اور اپنے آسٹریلوی مشیروں کے تحت مشرق میں نیوزی لینڈ سے مغرب میں میانمار اور سری لنکا اور شمال میں ویتنام تک واقعات کے تسلسل کو کنٹرول کرے گا۔ ان سب کا نتیجہ مستقبل میں ہندوستان کے ساتھ تصادم اور چین کے احیا کی صورت میں ظہور میں آئے گا۔ واقعہ کوئی بھی ہو دنیا کی سیاست کا مرکز جنوب کو منتقل ہو جائے گا۔

اگر قاری کو یہ منظر نامہ ایک ناقابل اعتبار فنتا سی دکھائی پڑتا ہے تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ہم کو امید کرنی چاہئے کہ عالمی تہذیبی جنگ کا کوئی دوسرا منظر نامہ معتبر ثابت نہ ہو۔ تاہم اس

منظرنامے کے حوالے سے جو کچھ سب سے زیادہ قابل اعتبار اور لہٰذا سب سے زیادہ پریشان کر دینے والی بات ہے وہ ہے جنگ کی وجہ یعنی ایک تہذیب کی مرکزی ریاست (امریکہ) کی دوسری تہذیب کی مرکزی ریاست (چین) کے اپنی ہی تہذیب کے رکن ملک (ویتنام) کے ساتھ جھگڑے میں مداخلت۔ امریکہ کیلئے ایسی مداخلت بین الاقوامی قانون کی بالادستی و برقراری' جارحیت کی بیخ کنی' سمندروں کی آزادی کے تحفظ' جنوبی چینی سمندر کے تیل تک اپنی رسائی کو برقرار رکھنے اور مشرقی ایشیا کو کسی ایک طاقت کے غلبے سے بچانے کیلئے ضروری تھی۔ چین کیلئے یہ مداخلت مکمل طور پر ناقابل برداشت تھی بلکہ ایک بڑی مغربی ریاست کی طرف سے چین کی تذلیل اور تحقیر کرنے کی غصہ دلانے والی کوشش تھی' چین کے جائز اثر ورسوخ کے حلقے میں اس کی مخالفت کو اکسانے اور دنیا کے معاملات میں چین کے مناسب کردار سے انکار کرنے کی کوشش تھی۔

مختصر یہ کہ آنے والے عہد میں تہذیبوں کے مابین جنگ سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ مرکزی ریاستیں دوسری تہذیبوں کے جھگڑوں میں مداخلت سے باز رہیں۔ یہ ایک ایسا سچ ہے جسے کچھ ریاستیں خصوصاً امریکہ تسلیم کرنا بلاشبہ دشوار پاتا ہے۔ یہ ''پرہیز کا قانون'' کہ مرکزی ریاستیں دوسری تہذیبوں کے جھگڑوں میں مداخلت سے باز رہیں ایک کثیر التہذیبی' کثیر القطبی (ملٹی پولر) دنیا میں امن کیلئے پہلی شرط ہے۔ دوسری شرط ہے ''مشترک ثالثی کا قانون'' یعنی مرکزی ریاستیں ایک دوسرے سے مذاکرات کر کے اپنی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں یا ریاستوں کے درمیان تقسیمی خط کی جنگیں چھڑنے سے روکیں یا محدود رکھیں۔

ان قوانین اور تہذیبوں کے درمیان برابری کو تسلیم کرنا نہ تو مغرب کیلئے آسان ہے اور نہ ان تہذیبوں کیلئے جو مغرب کو اس کے برتر کردار سے ہٹانا یا اضافہ کرنا چاہتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسی دنیا میں مرکزی ریاستیں نیوکلیائی ہتھیار رکھنا اپنا استحقاق کامل تصور کر سکتی ہیں اور اپنی تہذیب کی دوسری ریاستوں کے ایسے ہتھیار رکھنے کے استحقاق کو رد کر سکتی ہیں۔ پاکستان کیلئے ایک ''مکمل نیوکلیائی استعداد'' حاصل کرنے کی اس کی کوشش کو

دیکھئے جب ذوالفقار علی بھٹو نے ان کوششوں کا جواز یوں پیش کیا ''ہم جانتے ہیں کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ مکمل نیوکلیائی استعداد کے حامل ہیں۔ عیسائی' یہودی اور ہندو تہذیبیں یہ استعداد رکھتی ہیں۔ صرف اسلامی تہذیب اس کی حامل نہیں ہے تاہم یہ پوزیشن تبدیل ہونے کو ہے۔'' جن تہذیبوں میں مرکزی ریاستیں نہیں ہیں ان میں لیڈر شپ کیلئے مسابقت نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ کو تحریک دیتی ہے۔ اگرچہ ایران اور پاکستان کے تعلقات تعاون پر مبنی ہیں لیکن ایران واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ اسے پاکستان ہی کی طرح نیوکلیائی ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف اسرائیل اور ارجنٹائن نے اپنے اس سمت کو پروگرام ترک کر دیئے اور جنوبی افریقہ نے اپنے نیوکلیائی ہتھیار تباہ کر دیئے ہیں' اگرچہ وہ نائیجیریا کے اس استعداد کو حاصل کرنے کی صورت میں انہیں حاصل کرنے کی زوردار خواہش رکھتا ہے۔ جیسا کہ سکاٹ ساگان اور دوسرے نشاندہی کر چکے ہیں کہ نیوکلیائی ہتھیار سازی میں واضح طور پر بہت زیادہ خدشات مضمر ہیں' ایسی دنیا میں کہ جس میں ہر بڑی تہذیب کی ایک یا دو مرکزی ریاستیں نیوکلیائی استعداد رکھتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ہونے والے بہت سے بڑے بین الاقوامی ادارے مغربی مفادات' اقدار اور اعمال کے مطابق تشکیل دیئے گئے تھے۔ جیسے ہی مغربی طاقت میں زوال آتا ہے دوسری تہذیبیں ان اداروں کی اپنے مفادات کے مطابق تشکیل نو کیلئے دباؤ ڈالیں گی۔ سب سے زیادہ واضح' سب سے زیادہ اہم اور شاید سب سے زیادہ متنازعہ مسئلہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت ہوگا۔ یہ رکنیتیں دوسری جنگ عظیم کے فاتحین کو حاصل ہوئی تھیں۔ یا تو اس کی رکنیت میں تبدیلیاں لانا ہوں گی یا سلامتی کے معاملات سے نمٹنے کیلئے دوسرے کم رسمی اقدامات کرنا ہوں گے۔ جیسے کہ جی سیون جیسے اداروں کی میٹنگوں میں گلوبل معاشی مسائل پر بات ہوتی ہے۔ ایک کثیر التہذیبی دنیا میں نظریاتی طور پر ہر بڑی تہذیب کو سکیورٹی کونسل (سلامتی کونسل) میں ایک مستقل نشست ملنی چاہئے۔ امریکہ جاپانیوں اور جرمنوں کی رکنیت کی منظوری دے چکا ہے مگر یہ بات واضح ہے کہ ایسا صرف تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب دوسرے ملک بھی رکنیت حاصل کرلیں۔ برازیل نے پانچ

نئے مستقل ارکان کے نام تجویز کئے ہیں جنہیں ویٹو پاور حاصل نہیں ہوگی۔ وہ پانچ ملک ہیں جرمنی' جاپان' ہندوستان' نائیجیریا اور خود برازیل۔ تاہم اس طرح دنیا کے ایک ارب مسلمان نمائندگی سے رہ گئے ہیں سوائے نائیجیریا کے۔ تہذیبی نقطۂ نظر سے جاپان اور ہندوستان کو تو واضح طور پر مستقل رکن ہونا چاہئے نیز افریقہ' لاطینی امریکہ اور مسلم دنیا کو بھی نشستیں ملنی چاہئیں۔ اس کیلئے انتخاب اسلامی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی)' آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی اور آرگنائزیشن آف امریکن سٹیٹس (امریکہ اس میں شامل نہیں ہے) کریں۔ فرانس اور برطانیہ کی نشستوں کو یورپی یونین کی ایک نشست کی صورت میں بھی متعین کیا جا سکتا ہے جس کے رکن باری باری یونین منتخب کرتی رہے گی۔ لہٰذا سات تہذیبوں کی اپنی اپنی مستقل نشستیں ہوں گی اور مغرب کی دو نشستیں ہوں گی۔ یہ ایک ایسی ترتیب ہے جس سے دنیا میں لوگوں' دولت اور قوت کی تقسیم کی ترجمانی ہوتی ہے۔

تہذیب کی یکسانیتیں

کچھ امریکی داخلی طور پر ملٹی کلچرل ازم کو فروغ دیتے آئے ہیں۔ کچھ خارجی حوالے سے آفاقیت کو ترویج دیتے رہے ہیں اور کچھ دونوں کی ترویج میں محو رہے ہیں۔ داخلی طور پر ملٹی کلچرل ازم امریکہ اور مغرب کیلئے خطرہ ہے اور آفاقیت خارجی سطح پر مغرب اور دنیا کیلئے خطرہ ہے۔ عالمی سطح پر ایک ثقافت کو پسند کرنے والے دنیا کو امریکہ کی طرح بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ملٹی کلچرل امریکہ ناممکن ہے کیونکہ ایک غیر مغربی امریکہ تو امریکہ نہیں ہے۔ ایک ملٹی کلچرل دنیا ناگزیر ہے کیونکہ عالمی سلطنت تو ناممکن ہے۔ امریکہ اور مغرب کے تحفظ کیلئے مغربی تشخص کا احیا ضروری ہے۔ دنیا کی سلامتی عالمی کثیر الثقافتی کی قبولیت میں ہے۔

کیا مغربی آفاقیت کی بے مقصدیت اور عالمی ثقافت کے تنوع کی حقیقت ناگزیر طور پر اخلاقی اور ثقافتی اضافیت کی طرف نہیں لے جاتی ہے؟ اگر آفاقیت سامراجیت کو قانونی جواز فراہم کرتی ہے تو کیا اضافیت جبر کو جائز قرار دیتی ہے؟ ایک بار پھر ان سوالوں کا جواب ہاں بھی ہے نہیں بھی۔ ثقافتیں اضافی ہوتی ہیں اخلاقیات حتمی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ مائیکل

ویلزر کا کہنا ہے کہ ثقافتیں ''گھنی'' ہوتی ہیں۔ وہ انسانوں کو کسی خاص معاشرے کے اندر درست راستوں پر گامزن رہنے کیلئے ادارے اور رویوں کا تانا بانا تجویز کرتی ہیں۔ تاہم اس اعلیٰ' برتر اور حتمی اخلاقیات کے علاوہ بھی ایک تقلیلی اخلاقیات ہوتی ہے جو ''کسی مخصوص گھنی یا اعلیٰ اخلاقیات کی خصوصیات کو دہراتی ہے۔'' صداقت اور انصاف کے تقلیلی تصورات تمام گھنی اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں اور ان سے الگ نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ تقلیلی اخلاق میں کچھ منفی ممانعتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً ''قتل کے خلاف قوانین' دغا فریب' تشدد' جبر اور استبداد کے خلاف قوانین۔'' جو کچھ لوگوں میں مشترک ہے وہ ہے ''مشترک دشمن (یا شر) کے ادراک سے زیادہ مشترک ثقافت سے وابستگی۔'' انسانی معاشرہ' آفاقی ہے کیونکہ یہ انسانی ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ معاشرہ ہے۔'' جب ہم لوگوں کے ساتھ چل رہے ہوتے ہیں تو اکثر ہم تنہا ہوتے ہیں۔ تاہم ایک ''گھنی'' تقلیلی اخلاقیات مشترک انسانی صورتحال سے ضرور اخذ کی جا سکتی ہے اور ''آفاقی مزاج'' تمام ثقافتوں میں موجود ہوتے ہیں۔ کسی ایک تہذیب کی آفاقی خصوصیات کے مفروضے کو ترویج دینے کے بجائے ثقافتی بقائے باہمی کا تقاضا ہے کہ جو کچھ بھی زیادہ تر تہذیبوں میں مشترک ہے اس کی ترویج کی جائے۔ ایک کثیر التہذیبی دنیا میں تعمیری راستہ آفاقیت سے دست برداری ہے۔ ہاں تنوع کو قبول کرتے ہوئے یکسانیتوں کو تلاش کرنا چاہئے۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں ایسی ہی یکسانیتوں کا تعین کرنے کی برمحل کوشش ایک چھوٹے سے مقام پر کی گئی ہے اور وہ ہے سنگاپور۔ سنگاپور کے لوگ اندازے کے مطابق 76 فیصد چینی' 15 فیصد ملائی اور 6 فیصد ہندوستانی ہندو اور سکھ ہیں۔ ماضی میں حکومت نے ''کنفیوشسی اقدار'' کو فروغ دینے کی کوششیں کی تھیں تاہم اس نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ ہر شخص کو انگریزی میں تعلیم دی جائے اور وہ انگریزی روانی سے لکھ پڑھ اور بول سکیں۔ جنوری 1989ء میں صدر وی کم وی نے پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں 2.7 ملین سنگاپوریوں کیلئے مغرب کے بیرونی ثقافتی اثرات کی نشاندہی کی جو ''انہیں باہر سے آنے والے نئے تصورات اور ٹیکنالوجیوں سے قریب کر سکتے ہیں۔'' تاہم

''ان پر اجنبی طرز زندگی اور اقدار کو بھی منکشف کر سکتے ہیں۔''اس نے انتباہ کیا کہ اخلاقیات' فرض اور معاشرے کے روایتی ایشیائی تصورات جو ہم میں ماضی میں برقرار تھے وہ اب زندگی کے حوالے سے مغرب زدہ' انفرادیت پسندانہ اور خود مرکزی تصورات کو جگہ دے رہے ہیں۔'' اس نے کہا یہ ضروری ہے کہ سنگاپور کی مختلف نسلی اور مذہبی برادریوں میں پائی جانے والی مشترک مرکزی اقدار کو شناخت کریں جو کہ ایک سنگاپوری کا جوہر ہیں۔''

یہ کوشش نہ صرف تہذیبوں کے تصادم کو محدود کرنے میں کردار ادا کر سکتی ہے بلکہ واحد تہذیب کو بھی مضبوط کر سکتی ہے''واحد تہذیب'' نظریاتی طور پر اخلاقیات' مذہب' تعلیم' فنون' فلسفے' ٹیکنالوجی' مادی آسودگی اور شاید کچھ دوسری چیزوں کے اعلیٰ درجوں کے امتزاج سے وجود پذیر ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ معاصر عہد میں کیا ''تہذیب'' کے اعلیٰ درجے کیلئے جدت کے اعلیٰ درجے اہم ہیں؟ مسئلہ تاریخ کے سیدھے رخ ارتقا اور دائروی ارتقا کا بھی ہے۔ فرض کیا جاتا ہے کہ جدیدیت انسانی معاشرے کی عظیم تعلیم' شعور و ادراک اور تفہیم سے پیدا ہوئی ہے اور اس کا قدرتی ماحول تہذیب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج کے مستقل ارتقا کو جنم دیتا ہے۔ اس کے متبادل کے طور پر تہذیب کے درجے تہذیبوں کے ارتقا کے مرحلوں سے واضح ہو سکتے ہیں۔ جب پہلے پہل تہذیبیں ابھرتی ہیں تو ان کے لوگ عمومی طور پر طاقتور' متحرک' سفاک' بیدار اور توسیع پسند ہوتے ہیں۔ وہ نسبی طور پر غیر مہذب ہوتے ہیں جیسے ہی تہذیب ارتقا پاتی ہے تو مزید مستحکم ہو جاتی ہے اور ایسی تیکنیکیں اور ہنروں کو ترقی دیتی ہے جو اسے مزید مہذب بنا دیتے ہیں۔ جیسے ہی اس کے تشکیلی عناصر میں مسابقت ختم ہوتی ہے اور ایک آفاقی حالت نمودار ہوتی ہے' تہذیب ''تہذیب'' کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ جاتی ہے تو اپنے سنہری دور کو پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت اس میں اخلاقیات' فنون' ادب' فلسفے' ٹیکنالوجی اور مادی' معاشی اور سیاسی صلاحیتوں کے پھول بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔ تہذیب کے طور پر جونہی اسے زوال آتا ہے اس کا ''تہذیب'' کا درجہ بھی زوال پانے لگتا ہے اور پھر کوئی نئی مختلف تہذیب جو ابھی ''تہذیب'' کے نچلے درجے میں ہوتی ہے اس کو ختم کر دیتی ہے۔

جدیدیت نے دنیا بھر میں ''تہذیب'' کے مادی درجے کو عمومی طور پر بڑھایا ہے۔ لیکن کیا اس نے ''تہذیب'' کی اخلاقی اور ثقافتی جہتوں کو بھی فروغ دیا ہے؟ معاصر دنیا میں غلامی' تشدد' فرد کا گھناؤنا استحصال کم سے کم ہوا ہے۔ تاہم کیا یہ مغربی تہذیب کے دوسری ثقافتوں پر اثرات کا نتیجہ ہے اور لہٰذا کیا مغربی قوت کے زوال کے ساتھ ایک اخلاقی احیا واقع ہو گا؟ 1990ء کی دہائی کے دوران میں دنیا کے معاملات کی بنت میں ''بہت زیادہ انتشار'' واقع ہوا یعنی لا اینڈ آرڈر میں عالمی ٹوٹ پھوٹ' ناکام ریاستیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں انارکی' جرائم کی عالمی لہر' بین الاقوامی مافیا اور منشیات کے کارٹیل (بہت منظم اور بڑے گروہ)' بہت سے معاشروں میں منشیات کا روزافزوں استعمال' خاندان کی عام ہوتی ہوئی کمزوری' بہت سے ملکوں میں اعتماد اور سماجی ہم آہنگی کا زوال' نسلی' مذہبی اور تہذیبی تشدد اور بندوق کے ذریعے حکمرانی ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ شہر در شہر ماسکو' ریوڈی جنیرو' بنکاک' شنگھائی' لندن' روم' وارسا' ٹوکیو' جوہانسبرگ' دہلی' کراچی' قاہرہ' بوگوٹا' واشنگٹن جرائم عروج پر دکھائی دیتے ہیں اور زوال پاتی ہوئی ''تہذیب'' کے بنیادی عناصر دکھائی دے رہے ہیں۔ لوگ حکمرانی کے عالمی بحران کی باتیں کرتے ہیں۔ بین الاقوامی کارپوریشنیں جو اقتصادی اشیاء تیار کرتی ہیں تعداد میں زیادہ ہو رہی ہیں۔ انہی کے تناسب سے بین الاقوامی مجرم مافیا' منشیات کے کارٹیل اور دہشت پسند گینگ ''تہذیب'' پر متشددانہ حملے کر رہے ہیں۔ ''تہذیب'' کیلئے سب سے پہلی شرط لا اینڈ آرڈر ہوتا ہے اور دنیا کے اکثر حصوں ......افریقہ' لاطینی امریکہ' سابق سوویت یونین' جنوبی ایشیا' مشرق وسطیٰ ...... میں یہ بھاپ کی طرح اڑتا دکھائی دیتا ہے جبکہ چین' جاپان اور مغرب میں سخت حملے کا شکار ہے۔ عالمگیر سطح پر تہذیب بہت سے حوالوں سے بربریت کو پیدا کر رہی ہے۔ ایک بالکل نئے اور عجیب مظہر کے تصور کو پروان چڑھا رہی ہے۔ ایک عالمی (گلوبل) سیاہ دور' انسانیت کا ممکنہ زوال وجود پذیر ہو رہا ہے۔

1950ء کی دہائی میں لیسٹر پیئرسن نے انتباہ کیا تھا کہ انسان ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں ''جب مختلف تہذیبوں کو باہمی طور پر امن کے ساتھ ایک دوسرے سے سیکھتے

ہوئے' ایک دوسرے کی تاریخ اور تصورات اور فن اور ثقافت کا مطالعہ کرتے ہوئے رہنا ہو گا۔ ایک دوسرے کی زندگیوں کو ثروت مند بناتے ہوئے رہنا ہوگا۔ ایسا نہیں تو اس چھوٹی سے پرہجوم دنیا میں غلط فہمی' تناؤ' تصادم اور المیے رونما ہوں گے۔ امن اور ''تہذیب'' دونوں کے مستقبل کا انحصار دنیا کی بڑی تہذیبوں کے سیاسی' روحانی اور دانشور لیڈروں کے درمیان افہام و تفہیم اور تعاون پر ہے۔ تہذیبوں کے تصادم میں یورپ اور امریکہ یا اکٹھے یا الگ الگ پھانسی پر لٹکیں گے۔ زیادہ بڑے تصادم میں ''حقیقی عالمی (گلوبل) تصادم'' میں جو ''تہذیب'' اور بربریت کے درمیان ہو گا دنیا کی بڑی تہذیبیں مذہب' فن' ادب' فلسفے' سائنس' ٹیکنالوجی' اخلاقیات اور میں زبردست کامیابیوں اور کامرانیوں سمیت یا تو اکٹھے یا الگ الگ پھانسی پر چڑھیں گی۔ ظہور میں آتے ہوئے دور میں تہذیبوں کے تصادم دنیا کے امن کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور تہذیبوں کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی نظام (آرڈر) عالمی جنگ کے خلاف سب سے زیادہ یقینی حفاظتی اقدام ہے۔

............☆☆☆............

ڈاکٹر شبیر احمد (فلوریڈا)

ڈاکٹر شبیر احمد اپنی پر لطف اور شگفتہ تحریروں میں تاریخ اور سماجیات کے گہرے مطالعہ کو بہت خوبصورتی سے کام میں لاتے ہیں۔ شعر و ادب پر وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ محاورے اور ملفوظات ان کی دسترس میں رہتے ہیں۔ ان کے ہلکے پھلکے سلیس اور رواں اسلوب کو انتہائی دلچسپی سے بغیر رُکے پڑھنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ وہ اُردو ادب کے لاثانی تخلیق کار ہیں۔

(ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، ہلال امتیاز)

حالیہ برسوں میں ڈاکٹر شبیر احمد عالم اسلام کے روشن خیال سکالر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں بہت سے صاحبانِ نظر انہیں اردو زبان کا بہترین ادیب اور مصنف قرار دے رہے ہیں۔ میری رائے میں وہ عصر حاضر میں علامہ اقبالؒ کے بہترین ترجمان ہیں۔ آپ ڈاکٹر شبیر احمد کی کوئی اردو یا انگریزی کتاب پڑھنے کے بعد ان خیالات سے غالباً متفق ہوں گے۔

(ڈاکٹر جاوید اقبال)

20۔ حبیب بینک بلڈنگ، چوک اُردو بازار، لاہور

میں کرسچن کیوں نہیں ہوں؟

ڈاکٹر شبیر احمد (فلوریڈا)

- آپ کی کتاب اسلام اور ایمان کے لیے قوت اور تقویت کا باعث بن رہی ہے۔ اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے۔ (ڈاکٹر جاوید اقبال' فرزند اقبال' سینئر ریٹائرڈ جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان)
- آپ کی کاوش بلند ترین تعریف و تحسین کا استحقاق رکھتی ہے۔ تبلیغ کا عمدہ طریقہ! (پروفیسر غفور احمد)
- البانوی مسلمانوں کی امریکہ اور کینیڈا میں ایسوسی ایشن کے بانی صدر جناب امام مفتی وہبی اسماعیل' جو جامعہ الازہر قاہرہ کے شعبۂ علوم دینیات کے صدر رہے ہیں لکھتے ہیں:

"آپ نے اس کتاب سے ملت اسلامیہ کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ میں آپ کی اجازت سے اس کتاب کو البانوی زبان میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔"

- یہ مسلمانوں کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آپ جیسا صاحب ایمان اور اہل فکر و نظر شخص ہمارے درمیان موجود ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یہ کتاب انتہائی بروقت ہے۔ آج کے دور میں ہمیں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ہم اس کا فارسی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔ (مجتہد امام مہدی علی خراسانی الحسینی)
- میں نے آپ کی کتاب کو ہندی میں ترجمہ کر کے دو ہزار کاپیاں شائع کروائی ہیں۔ ایک ہفتے میں سب کاپیاں ختم ہو گئیں۔ آپ نے یہ کتاب بہترین وقت پر شائع کی ہے۔ دو صدیوں کے سنگم پر آپ کی یہ محنت لازوال منارۂ نور کے طور پر زندہ رہے گی۔ (شیخ الحدیث مفتی محمد ارشاد نظامی' آگرہ ہندوستان)
- اس کتاب نے میرے دل میں ایسا انقلاب برپا کیا کہ میں نے گلے سے صلیب کی علامت اتار کر محمد ﷺ کا اسم گرامی پہن لیا۔ (ایک گمنام سابق مسیحی)

مثال پبلشنگ

20- حبیب بینک بلڈنگ' چوک اُردو بازار' لاہور

دیگر مطبوعات

ڈسٹری بیوٹر

دوست ایسوسی ایٹس

ناشران وتاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

Phone : 7122981 Fax : 092-42-7122981

Email:shahid_adil@yahoo.com